# خطباتِ آزاد

# خطباتِ آزاد

از

ابو الکلام آزاد

مرتّبہ

مالک رام

ساہتیہ اکادیمی
نئی دہلی

# مقدّمہ

خطابت دنیا کا سب سے قدیم ذریعۂ ابلاغ ہے ظاہر ہے کہ لکھنے کا فن ابھی ایجاد ہی ہی نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا اگر کبھی قبیلوں کے درمیان لڑائی کی صورت پیدا ہوجاتی، تو لازماً ایک قبیلے کے سردار یا شیخ کو اپنے خاندان کے افراد یا اور لوگوں کو دوسرے قبیلے کے خلاف اُبھارنے اور جنگ پر آمادہ کرنے کے لیے، اُن سے خطاب کی ضرورت پیش آئی ہوگی۔ اسلامی عقیدہ ہے کہ دنیا میں ایک لاکھ پچیس ہزار نبی مبعوث ہوئے۔ تمام قوموں میں بزرگانِ دین کے نام بھی ملتے ہیں۔ ان قابلِ احترام ہستیوں کا مقصدِ حیات اس کے سوا کچھ اور نہیں تھا کہ وہ گُم کردہ راہ بنی نوعِ انسان کو صراطِ مستقیم کی طرف بلائیں۔ یقیناً انھوں نے بھی رُشد و ہدایت کی تلقین خطاب ہی کے ذریعے سے کی ہوگی۔ غرض قبیلے کا سردار رہا ہو یا کوئی رِشی مُنی اور نبی، اس کی کامیابی اسی پر منحصر تھی کہ وہ کس حد تک اپنے سامعین یا مخاطبوں کو اپنے نقطۂ نظر کے صحیح ہونے کا یقین دلا سکتا ہے، اور انھیں امن اور ہدایت کی راہ پر لگا سکتا ہے۔ اس طرف بہت کم لوگوں کا خیال گیا ہوگا کہ تمام مذاہب کی الہامی کتابیں خطبات سے بھری ہوئی ہیں۔ لیکن اس پر کسی کو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ ان کتابوں کے اوّلین مخاطبوں میں تعلیم یافتہ آدمی بہت کم تھے، صرف گنتی کے چند لوگ پڑھ لکھ سکتے تھے۔ لازماً نبی کو اپنا پیغام لوگوں

**Khutbaat-i-Azad** ( speeches of Azad ) : by Maulana Abul Kalam Azad. Edited with notes and introduction by Malik Ram. This is the fourth book of the series published by the Sahitya Akademi as part of a commemorative edition of Maulana Abul Kalam Azad's collected works in Urdu. (Sahitya Akademi, New Delhi (1974), Price Rs. 18.)

خطباتِ آزاد ۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریروں کا مجموعہ جو انھوں نے مختلف اوقات میں کی تھیں۔ یہ ان کی جملہ اردو تصانیف کا چوتھا حصہ ہے، جسے ساہتیہ اکادمی "بیادگارِ مولانا ابوالکلام آزاد" مرحوم شائع کر رہی ہے۔
(ساہتیہ اکادمی، نئی دلی ۱۹۷۴ء)


ساہتیہ اکادمی

پہلی بار، ۱۹۷۴ء

قیمت : اٹھارہ روپے

ساہتیہ اکادمی، رابندر بھون، نئی دلّی نے
جمال پریس دلّی میں طبع کروا کے شائع کیا

مولانا ابوالکلام آزاد کو قدرت کی طرف سے وہ تمام صفات اور صلاحیتیں وافر مقدار میں ملی تھیں، جو کامیاب خطیب بننے کے لیے درکار ہیں۔ عالی نسبی ایسی کہ صدیوں سے ان کا خاندان زہد و ورع اور رُشد و ہدایت کا مرکز رہا تھا؛ ان کے والد مولانا خیرالدین مشائخ کے حلقوں میں معروف اور ممتاز تھے؛ مولانا آزاد خود ذاتی وجاہت اور مردانہ حُسن کا نمونہ تھے؛ ان کے علم وفضل اور عربی و فارسی پر قدرت کے سب معترف ہیں؛ طلاقتِ زبان اور قوتِ بیان کے ساتھ انھیں بیمثال حافظے کی نعمت بھی حاصل تھی۔ اور یہی چیزیں کامیاب اور مؤثّر خطابت کے اجزاے ترکیبی ہیں۔

مولانا خیرالدین کے مریدوں کا حلقہ خاصا وسیع تھا، جن کی تعلیم و تربیت کے لیے انھیں اکثر ان سے خطاب کرنا پڑتا تھا؛ نیز وہ کلکتے کی جامع مسجد (مسجدِ ناخدا) میں بھی اکثر جمعے کی نماز سے پہلے حاضرین کے سامنے وعظ کہا کرتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے سامنے یہ مثالیں ان کی کمسنی کے زمانے سے آتی رہیں۔ ممکن نہیں تھا کہ ان پر اس صورتِ حال کا اثر نہ ہوتا، اور ان کی اخّاذ طبیعت اس کے تتبّع کی کوشش نہ کرتی۔ چنانچہ ہمارے پاس اس کی شہادت موجود ہے کہ وہ بچپن ہی سے تقریر کرنے اور مقرّر بننے کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ ان کی بڑی بہن فاطمہ بیگم فرماتی ہیں:

> بچپن میں بھائی کو ان کھیلوں کا شوق نہیں تھا جو اکثر بچّے کھیلا کرتے ہیں۔ ان کے کھیل سات آٹھ سال کی عمر میں عجیب انداز کے ہوا کرتے تھے مثلاً کبھی وہ گھر کے تمام صندوقوں اور بکسوں کو ایک لائن میں رکھ کر کہتے تھے کہ یہ ریل گاڑی ہے۔ پھر والد کی پگڑی سر پر باندھ کر بیٹھ جاتے تھے اور ہم بہنوں سے کہتے تھے کہ تم لوگ چلاّ چلاّ کر کہو: ہٹو، ہٹو، راستہ دو؛ دلّی کے مولانا آرہے ہیں۔ ہم لوگ اس پر کہتے تھے

تک زبانی گفتگو سے پہنچانا پڑا۔ جب افہام و تفہیم کا موضوع مشکل یا وضاحت طلب رہا ہوگا، یا اس سے متعلق ان کی قوم میں پہلے سے مخالفت اور مقابلے کا جذبہ موجود تھا، انھیں دلائل سے کام لینا پڑا اور مناظرانہ رویہ اختیار کرکے ان کے معتقدات کی تردید اور تغلیط کرنا پڑی یہی باعث ہے کہ ان بنیادی کتابوں میں خطبات کی بھرمار ہے۔ ان سے جہاں صاحب کتاب کی فصاحت و بلاغت کا ثبوت ملتا ہے، وہیں ہمیں اس زمانے کی خطابت کے نمونے بھی مہیّا ہو گئے ہیں۔

اس سے معلوم ہوگا کہ خطیب کا اولین مقصد یہ ہے کہ وہ سامعین کو اپنا ہم خیال بنائے، یا انھیں کسی رائے یا تجویز پر متفق کرے۔ یہ کام آسان نہیں ہے۔ اس میں کامیابی کے لیے کئی چیزوں کی ضرورت ہے۔ موضوع ایسا ہونا چاہیے کہ لوگ اس کی اہمیت کے قائل ہوں اور کسی نہ کسی درجے میں اسے اپنی زندگی یا مقاصد کے لیے ضروری خیال کریں۔ خطیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود موضوع کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو؛ اس کے موافق آرا پیش کر سکے، اور مخالف دلائل کو رد کر سکے۔ اس کے اپنے خیالات میں کسی قسم کی پراگندگی یا تذبذب نہیں ہونا چاہیے۔ بیشک، بعض اوقات طول کلامی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر وہ اس سے اجتناب کر سکے اور اپنے مافی الضمیر کو، جچے تلے الفاظ میں، لگی لپٹی رکھے بغیر، مدلّل طریقے پر، سامعین کے سامنے رکھ سکے، تو اس کا اثر کہیں زیادہ ہوگا، بہ نسبت اس کے کہ وہ غیر واضح طور پر اُکتا دینے کی حد تک بولتا چلا جائے۔ اگر اسے اپنے موضوع کی صداقت پر یقین ہے؛ اگر اسے اس کے لیے موزوں الفاظ کے انتخاب میں، اور برجستہ اور مؤثر طریقے سے پیش کرنے میں مہارت حاصل ہے؛ اگر وہ اپنی تقریر کو اس حد تک اصلیت کا رنگ دے سکتا ہے کہ سامع اسے سُن کر ایسا محسوس کرنے لگے کہ گویا وہ خود اس کے دل کی بات کہہ رہا ہے، تو اس کی تقریر کی کامیابی میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی۔

## مقدّمہ

مضامین کی سنجیدگی اور بلند پایگی کے پیشِ نظر بیشتر لوگوں نے خیال کیا کہ رسالے کا ایڈیٹر کوئی بزرگ اور معمّر عالم ہے۔ انجمن حمایت اسلام، لاہور اپنے سالانہ اجلاس میں ملک کے مختلف حصّوں سے اہلِ علم وفضل کو تقریر کرنے کی دعوت دیا کرتی تھی۔ "لسان الصدق" کی تحریروں کے بلند معیار اور خطیبانہ انداز کو دیکھ کر انجمن کے اصحابِ مجاز نے رسالے کے ایڈیٹر مولانا ابوالکلام آزاد کو اپنے اجلاس اپریل ۱۹۰۴ء کو خطاب کرنے کی دعوت دی۔ اس وقت ان کی عمر یہی ۱۵-۱۶ برس کی رہی ہوگی۔ ممکن ہے، داعی حضرات کو انھیں دیکھ کر ان کی کم عمری سے کچھ مایوسی ہوئی ہو، لیکن ان کی تقریر سے یقیناً وہ مایوس نہیں ہوئے کیونکہ اس سے اگلے دن ان سے پھر تقریر کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔

یہ وہ دَور ہے، جب ہندستان نے بعض مشہور خطیب و مقرّر پیدا کیے۔ ان میں سے بیشتر انگریزی میں بولنے والے تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد انگریزی سے نابلد تھے۔ بعد کے زمانے میں انھوں نے اس زبان سے کام کاج اور مطالعے کی حد تک کے لیے خاصی واقفیت پیدا کرلی تھی؛ لیکن انھیں اس میں بات چیت کرنے میں ہمیشہ تکلّف رہا کیونکہ وہ اپنے تلفّظ سے مطمئن نہیں تھے۔ بہرحال ان کا انگریزی میں تقریر نہ کرنا کسی طرح ان کے لیے نقصان کا باعث نہیں ہوا، نہ کسی کو اس سے انھیں کامیاب اور عظیم مقرّر تسلیم کرنے میں تامّل ہوا۔

ان کے خطبات کی اس پہلی جلد میں آپ کو ان کی بعض مشہور اور نمایندہ تقریریں ملینگی۔ ان سے جہاں ان کے مطالعے اور نظر کی وسعت، اپنے مفہوم کو موزوں ترین الفاظ میں بیان کرنے کی قدرت، مفکّرانہ طریقۂ استدلال، اور اپنے موقف کی صداقت اور صحت پر اعتمادِ کامل سطر سطر سے ظاہر ہے، وہیں آپ دیکھینگے کہ تکلّمُوا النّاسَ علیٰ قَدرِ عُقُولِھِم کے مصداق وہ اپنے سامعین کے مطابق زبان بھی بدل لیتے ہیں۔ مثلاً جمعیۃ العلماء ہند اور خلافت کانفرنس کے خطبات کے مقابلے میں آپ کانگریس کا خطبہ دیکھیے یا تعلیمی کانفرنس کا

کہ بھائی، یہاں تو کوئی آدمی نہیں ہے؛ ہم کس کو دھکّا دیں اور کہیں کہ راستہ دو۔ اس پر وہ کہتے تھے کہ یہ تو کھیل ہے، تم سمجھو کہ بہت لوگ مجھ کو لینے اسٹیشن پر آئے ہیں۔

پھر بھائی صندوقوں پر سے اترتے تھے اور بہت آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر چلتے تھے، جیسے کہ بڑی عمر کے لوگ چلتے ہیں۔ کبھی وہ گھر میں کسی اونچی چیز پر کھڑے ہو جاتے تھے اور سب بہنوں کو آس پاس کھڑا کر کے کہتے تھے کہ تم لوگ تالیاں بجاؤ اور سمجھو کہ ہزاروں آدمی میرے چاروں طرف کھڑے ہیں اور میں تقریر کر رہا ہوں اور لوگ میری تقریر سُن کر تالیاں بجا رہے ہیں۔ میں کہتی تھی کہ بھائی، سوائے ہم دو چار کے یہاں اور کوئی نہیں ہے؛ ہم کیسے سمجھیں کہ ہزاروں آدمی یہاں کھڑے ہیں۔ اس پر وہ کہتے تھے کہ یہ تو کھیل ہے؛ کھیل میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

(آجکل ستمبر ۱۹۵۹ء: ۱۴-۱۵)

پنجابی زبان کی مثل ہے: پوت، کپوت کے پالنے ہی سے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس کے بچپن ہی میں معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ آگے چل کر کیا بننے والا ہے۔ مولانا آزاد اپنے ماحول سے متاثر ہو کر کمسنی ہی سے تحریر و تقریر پر توجہ کرنے لگے تھے۔ وہ دس برس کی عمر سے نظم و نثر لکھنے لگے اور ان کی تحریریں کلکتے اور دوسری جگہوں کے رسائل و جرائد میں چھپنے لگی تھیں لیکن وہ اس سے مطمئن نہیں تھے، وہ اپنا ذاتی ذریعۂ اشاعت چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کی عمر بمشکل ۱۱-۱۲ برس کی ہو گی کہ ۱۸۹۹ء میں انھوں نے "نیرنگ عالم" کے نام سے ایک گلدستہ شائع کرنا شروع کیا۔ اس کے غالباً آٹھ شمارے نکلے۔ بہرحال سال کے اندر اندر یہ بند ہو گیا۔ اس کے چار پانچ برس بعد ۱۹۰۳ء میں انھوں نے مشہور ماہنامہ "لسان الصدق" جاری کیا۔ اس کی شہرت دور دور تک پہنچی اور اس کے

# فہرست

مقدّمہ

خطبہ ملاحظہ کیجیے۔ چونکہ پہلے دونوں خطبوں کے مخاطب اہلِ علم مسلمان حضرات تھے، اس لیے ان کی زبان اور مسائل کی تفہیم کے لیے دلائل بھی انھیں کے معیار اور مذاق کے مطابق ہیں؛ زبان بھی نسبتاً مشکل ہے۔ دوسرے خطبوں کے مخاطب، ظاہر ہے کہ مخلوط رہے ہونگے؛ یہاں زبان بہت آسان ہے، جس کے سمجھنے میں کسی کو مشکل پیش نہیں آ سکتی۔ لیکن ایک بات سب میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے: یہ ہے ان کا مصلحانہ اور مبشّرانہ اندازِ خطاب۔ ان کا مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ سامع ان کی بات سمجھ جائے، پوری پوری سمجھ جائے، اور اسے اس پر عمل کرنے میں کوئی تامّل یا جھجک محسوس نہ ہو۔ اسی لیے وہ ایک ہی بات کو مختلف طریقوں سے بار بار کہنے یا دہرانے سے دریغ نہیں کرتے۔

دیکھا گیا ہے کہ بعض حضرات کی وہ تقریریں جنھوں نے سامعین پر فوری اثر کیا تھا جب بعد کو کاغذ پر منتقل ہوئیں، اور لوگوں نے انھیں اپنے کانوں سنا نہیں، بلکہ آنکھوں سے پڑھا، تو ان پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ بعض وقتی مسائل کی تقریروں سے قطعِ نظر، مولانا آزاد کی بیشتر تقریروں کی یہ بھی نمایاں خصوصیت ہے کہ وہ اتنے لمبے عرصے کے بعد چھاپے میں بھی اتنی ہی مؤثّر اور کامیاب ہیں، جتنی وہ اُس وقت تھیں، جب وہ اپنے سامنے بیٹھے سامعین کو خطاب کر رہے تھے۔ یہ معمولی بات نہیں ہے۔

نئی دلّی

مالک رام

یکم فروری ۱۹۷۴ء

# ۱

# اتحادِ اسلامی

**کلکتہ ، ۲۷ر اکتوبر ۱۹۱۴ء**

اَللّٰھُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِیَدِکَ الْخَیْرُ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ[۱]

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ[۲] ۔ یٰاَیُّھَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ وَاللّٰہُ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ اِنْ یَّشَاْ یُذْھِبْکُمْ وَیَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ[۳]

تحقیقِ حالِ ما ز نگہ میتوان نمود
لختے بحالِ خویش بیا نوشتہ ایم[۴]

آپ میں سے اکثر حضرات کو معلوم ہے کہ بعض اسبابِ خاص سے اس عاجز نے عام مجالس کی شرکت قطعاً بند کر دی تھی اور گزشتہ (حضر پور) کی مجلس میں التجا کی تھی کہ آیندہ اس خدمت سے معاف رکھا جاؤں۔ ارکانِ انجمن نے اس کی نسبت ایک خط لکھا، تو پہلے تو جی میں آیا کہ معذرت کے ساتھ انکار کر دوں، لیکن اس کے بعد سوچا کہ

چوٹیوں پر نمودار ہوا جس کی کرنوں میں داہنی جانب شریعت الٰہی کا نور و کتابِ مبین تھی، مگر بائیں جانب قیامِ عدلِ میزان کی شمشیرِ آبدار چمک رہی تھی۔ جس کا طلوع کائنات میں ظلمت کی شکست اور روشنی کی دائمی فیروزمندی تھا کیونکہ آسمانِ ہدایت پر شریعتِ الٰہی کے گو سینکڑوں ستارے نمودار ہوئے تھے، لیکن تاریکی کی آخری شکست کے لیے دنیا کو آفتاب ہی کے طلوع کا انتظار ہوتا ہے:

وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّىٰ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ (۹۲ : ۱-۳) (رات کی قسم جب کہ اس کی تاریکی کائنات کی تمام اشیا کو چھپا دیتی ہے، اور روزِ روشن کی قسم جب کہ آفتاب کی تجلّی تمام کائنات کو روشن کر دیتی ہے، اور دراصل اس خالق کی قسم جس نے تخلیقِ عالم کے لیے نر اور مادہ کا وسیلہ پیدا کیا)

اُس آفتابِ توحید نے طلوع ہوتے ہی تفریق و انشقاق کی تمام تاریکیوں کو مٹا دیا! اس کی روشنی کی فیضان بخشی نے اسود و ابیض اور عرب و عجم کی کوئی تمیز نہ رکھی۔ خدا کی ربوبیّت کی طرح اس کی رحمت بھی عام تھی۔ وہ ربّ العالمین تھا، پس ضروری تھا کہ اس کی راہ کی طرف دعوت دینے والا بھی رحمۃٌ للعالمین ہو۔ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (۲۱:۱۰۷) (اے پیغمبر! ہم نے آپ کو نہیں بھیجا، مگر تمام عالموں کے لیے رحمت قرار دے کر)

انسان کی یہ سب سے بڑی ضلالت اور خدا فراموشی تھی کہ اس نے رشتۂ خلقت کی وحدت کو بھلا کر زمین کے ٹکڑوں اور خاندان کی تفریقوں پر رشتے قائم کر لیے تھے۔ خدا کی زمین کو جو محبّت اور باہمی اتحاد کے لیے تھی، قوموں کے باہمی اختلافات و نزاعات کا گھر بنا دیا تھا۔ لیکن اسلام دنیا میں پہلی آواز ہے جس نے انسان کی بنائی ہوئی تفریقات پر نہیں، بلکہ الٰہی تعبّد کی وحدت پر ایک عالمگیر اخوت و اتحاد کی دعوت دی اور کہا کہ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ

وقت تو وہ آگیا ہے، جب گونگے بولنے لگیں، اندھے دیکھنے لگیں، لنگڑے چلنے لگیں اور بہرے سننے لگیں[5]، کیونکہ اسلام اپنے ہر پیرو سے اس کے آخری فرض کا طالب اور اُس شے کا خواستگار ہے، جس کے بعد اس کے ذمّے اور کچھ باقی نہ رہیگا، اور وہ توحیدِ الٰہی کے حق سے سبکدوش ہوجائیگا۔ پس جو زبان نہیں بول سکتی، اس کو بھی بولنے کی سعی کرنی چاہیے؛ اور جو قدم نہیں اٹھ سکتا، اس کو بھی چلنے کے لیے اٹھنا چاہیے۔

## توحید: اخوتِ اسلامی و عمومِ رشتۂ دینی

قرآنِ حکیم نے توحیدِ الٰہی کے داعیِ کریم علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کو سراجِ منیر سے ملقّب کیا اور ان کے خصائصِ کریمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا (۳۳: ۴۶-۴۷) (اے پیغمبر! بیشک ہم نے تم کو شہادت دینے والا، بشارت پہنچانے والا، ضلالت و خبائث سے خوف دلانے والا راہِ الٰہی کی طرف داعی اور ایک نورانی مشعل بنا کر بھیجا)

لیکن ایک دوسرے موقع پر آفتاب کو بھی سراج کے لقب سے یاد کیا ہے: وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا[6] (اور آسمان میں خدا نے چاند کو بھی بنایا جو ایک نور ہے اور سورج کو بھی بنایا کہ وہ ایک روشن مشعل ہے) اس مماثلت اور اشتراکِ تشبیہ سے مقصود یہ تھا کہ اسلام کی دعوت بھی اس آفتابِ مادی کی طرح ایک آفتابِ روحانی ہے۔ جب آفتاب نکلتا ہے تو اس کی روشنی اور حرارت میں کوئی تمیز نزدیک و دور، اعلیٰ و ادنیٰ، سیاہ و سفید، باغ و دشت کی نہیں ہوتی۔ اس کی روشنی بلا تمیز مکان و مقام ہر شے پر چمکتی اور حرارت پذیر وجود کو گرم کرتی ہے۔ بعینہٖ یہی حال اس آفتابِ دعوتِ الٰہی اور نیّرِ درخشانِ سماے رسالت کی عمومِ فیضان بخشی کا تھا جو گو سعیر سے چلا، مگر فاران کی

سیکڑوں ہاتھ تھے جو خدائے واحد کے آگے سربسجود ہونے کے لیے وضو کر رہے تھے۔ یہ تمام دنیا کی مختلف قومیں زمین کے دور دراز گوشوں پر بسنے والی آبادیاں گویا ایک ہی گھر کے عزیز تھے، جن کو شیطانِ رجیم کی تفرقہ اندازیوں نے ایک دوسرے سے الگ کر دیا تھا؛ لیکن خدائے رحیم نے ان صدیوں کے بچھڑے ہوئے دلوں کو ایک دائمی صلح کے ذریعہ پھر ایک جگہ جمع کر دیا۔ اور ان کے رُوٹھے ہوئے دلوں کو اس طرح ایک دوسرے سے منا دیا کہ تمام پچھلے شکوے اور شکایتیں بھول کر ایک دوسرے کے بھائی اور شریک رنج و راحت ہو گئے۔ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا۔[12] (اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جو تم پر نازل کی گئی، جب کہ تم اسلام سے پہلے ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ مگر اسلام نے تمہارے دلوں میں محبّت و الفت پیدا کر دی اور تم دشمن کی جگہ ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہو گئے۔)

یہ برادری خدا کی قائم کی ہوئی برادری ہے۔ ہر انسان جس نے کلمہ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ کا اقرار کیا، بمجرد اقرار کے اس برادری میں شامل ہو گیا، خواہ مصری ہو خواہ نائیجیریہ کا وحشی ہو، خواہ قسطنطنیہ کا تعلیمیافتہ ترک۔ لیکن اگر وہ مسلم ہے تو اس ایک خاندانِ توحید کا عضو ہے، جس کا گھرانا کسی خاص وطن اور مقام سے تعلق نہیں رکھتا؛ بلکہ تمام دنیا اس کا وطن اور تمام قومیں اس کی عزیز ہیں۔

دنیا کے تمام رشتے ٹوٹ سکتے ہیں، مگر یہ رشتہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ ممکن ہے کہ ایک باپ اپنے لڑکے سے رُوٹھ جائے؛ بعید نہیں کہ ایک ماں اپنی گود سے بچے کو الگ کر دے؛ ہو سکتا ہے کہ ایک بھائی دوسرے بھائی کا دشمن ہو جائے؛ اور یہ بھی ممکن ہے کہ دنیا کے تمام عہدِ مودّت، خون اور نسل کے باندھے ہوئے پیمانِ وفا و محبّت ٹوٹ جائیں۔ مگر جو رشتہ ایک چین کے مسلمان کو افریقہ کے مسلمان سے، ایک عرب کے بدّو کو تاتار کے

لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (اے لوگو ہم نے دنیا میں تمہاری خلقت کا وسیلہ مرد اور عورت کا اتحاد رکھا اور نسلوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا۔ اس لیے کہ باہم پہچانے جاؤ، ورنہ دراصل یہ تفریق اور انشعاب کوئی ذریعۂ امتیاز نہیں اور امتیاز اور شرف اسی کے لیے ہے، جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ متقی ہے۔)

پس درحقیقت اسلام کے نزدیک وطن و مقام اور رنگ و زبان کی تفریق کوئی چیز نہیں۔ رنگ اور زبان کی تفریق کو وہ ایک الٰہی نشان ضرور تسلیم کرتا ہے:

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ وَاَلْوَانِکُمْ[9]

اس کو وہ کسی انسانی تفریق و تقسیم کی حد نہیں قرار دیتا اور انسان کے تمام دنیوی رشتے خود انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔ اصلی رشتہ صرف ایک ہے اور وہ وہی ہے جو انسان کو اس کے خالق اور پروردگار سے متّصل کرتا ہے وہ ایک ہے پس اس کے ماننے والوں کو بھی ایک ہی ہونا چاہیے۔ اگرچہ سمندروں کے طوفانوں، پہاڑوں کی مرتفع چوٹیوں، زمین کے دور دراز گوشوں اور جنس و نسل کی تفریقوں نے ان کو باہم ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہو۔ اِنَّ ھٰذِہٖ اُمَّتُکُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّاَنَا رَبُّکُمْ فَاتَّقُوْنِ[10] (۲۳-۵۲) (بیشک تمہاری جماعت ایک ہی امت ہے اور ہم ایک ہی تمہارے پروردگار ہیں)

اے برادرانِ ملّت! یہی اسلام کی وہ عالمگیر اخوت اور دعوتِ اسلام کی وحدت تھی، جس نے زمین کے دور دراز گوشوں کو ایک کر دیا تھا۔ اسلام نے ریگستانِ حجاز میں ظہور کیا مگر صحرائے افریقہ میں اس کی پکار بلند ہوئی۔ اس کی دعوت کی صدا جبلِ بوقبیس کی گھاٹیوں سے اٹھی مگر دیوارِ چین سے صدائے اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی بازگشت گونجی۔ تاریخ کی نظریں جس وقت دجلہ و فرات کے کنارے پیروانِ اسلام کے نقشِ قدم گن رہی تھیں، عین اسی وقت گنگا اور جمنا کے کنارے

محض اظہارِ مطلب کا زورِ بیان ہی نہیں ہے، بلکہ عین ترجمہ ہے اس حدیثِ مشہور کا جس کو امام احمد و مسلم نے نعمان بن بشیر سے روایت کیا ہے کہ جناب رسول کریم علیہ صلوۃ والتسلیم نے فرمایا ہے:[13] مَثَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ فِیْ تَوَادِّھِمْ وَتَرَاحُمِھِمْ وَتَعَاطُفِھِمْ مَثَلُ الْجَسَدِ اِذَا اشْتَکٰی عُضْوٌ تَدَاعٰی لَہٗ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّھَرِ وَالْحُمّٰی (مسلمانوں کی مثال باہمی مودّت و مرحمت اور محبت و ہمدردی میں ایسی ہے جیسے ایک جسمِ واحد کی، اگر اس کے ایک عضو میں کوئی شکایت پیدا ہوتی ہے تو سارا جسم اس تکلیف میں شریک ہو جاتا ہے) اور اسی کے ہم معنی صحیحین کی وہ حدیث ہے جس کو ابو موسیٰ اشعری نے روایت کیا ہے:[14] اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ کَالْبُنْیَانِ یَشُدُّ بَعْضُہٗ بَعْضًا (ایک مومن دوسرے مومن کے لیے ایسا ہے جیسے کسی دیوار کی ایک اینٹ دوسری اینٹ کو سہارا دیتی ہے) اور فی الحقیقت یہ خصائصِ مسلم میں سے ایک اوّلین اور اشرف ترین خصوصیت ہے جس کی طرف قرآن شریف نے اپنے جامع اور مانع الفاظ میں اشارہ کیا ہے: اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ[15] (کافروں کے لیے نہایت سخت۔ مگر آپس میں نہایت رحیم اور ہمدرد) اُن میں جس قدر سختی ہے باطل اور کفر کے لیے اور اُن کی جس قدر محبت و الفت ہے حق و صدق اور اسلام و توحید کے لیے:

فَاعْتَبِرُوْا یَا اَیُّھَا الْمُسْلِمُوْنَ وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَھُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ[16]

## جامعۂ اسلامیہ یا پان اسلام ازم

جب سے اسلام دنیا میں موجود ہے یہ اخوت و وحدت بھی موجود ہے۔ مگر یورپ کا جدید دسیسۂ شیطانی اس کو کسی مجہول الحال اور حدیث العہد اسلامی اتحادِ سیاسی سے تعبیر کرتا ہے اور اس اضغاثِ احلام کی تعبیر اس کو ایک خونفشاں ہلال کی صورت میں نظر آتی ہے۔ وہ کسی ایسے وقت کے تصوّر سے اپنے تئیں لرزاں و ترساں ظاہر کرتا ہے، جب تمام عالم میں چالیس کروڑ مسلمانوں کی تلواریں یکایک چمک اٹھیں گی۔ عیسائیوں سے

پر وا ہے سے اور ایک ہندوستان کے نومسلم کو مکّہ معظمہ کے صحیح النسب قریشی سے پیوستہ و یک جان کرتا ہے، دنیا میں کوئی طاقت نہیں ہے جو اسے توڑ سکے اور اس زنجیر کو کاٹ سکے، جس میں خدا کے ہاتھوں نے انسانوں کے دلوں کو ہمیشہ کے لیے جکڑ دیا ہے۔

پس اے عزیزانِ ملّت! اور اے بقیہ ماتم زدگانِ قافلۂ اسلام! اگر یہ سچ ہے کہ دنیا کے کسی گوشے میں پیروانِ اسلام کے سروں پر تلوار چمک رہی ہو، تو تعجب ہے، اگر اس کا زخم ہم اپنے دلوں میں نہ دیکھیں۔ اگر اس آسمان کے نیچے کہیں بھی ایک مسلم پیروِ توحید کی لاش تڑپ رہی ہے، تو لعنت ہے ان سات کروڑ زندگیوں پر جن کے دلوں میں اس کی تڑپ نہ ہو۔ اگر مراکش میں ایک حامیِ وطن کے حلقِ بریدہ سے ایک خون کا فوارہ چھوٹ رہا ہے، تو ہم کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے منہ سے دل و جگر کے ٹکڑے نہیں گرتے؟ ایران میں اگر وہ گردنیں پھانسی کی رسیوں میں لٹک رہی ہیں جن سے آخری ساعتِ نزع میں اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی آواز نکل رہی تھی، تو ہم پر اللہ اور اس کے ملائکہ کی پھٹکار ہو، اگر اپنی گردنوں پر اس کے نشان محسوس نہ کریں۔ اگر آج بلقان کے میدانوں میں حافظینِ کلمۂ توحید کے سر اور سینے صلیب پرستوں کی گولیوں سے چھد رہے ہیں، تو ہم اللہ اور اس کے ملائکہ اور اس کے رسولؐ کے آگے ملعون ہوں اگر اپنے پہلوؤں کے اندر ایک لمحہ کے لیے بھی راحت اور سکون محسوس کریں۔ میں کہہ رہا ہوں، حال آنکہ اسلام کی روح کا ایک ذرّہ بھی اس کے پیروؤں میں باقی ہے، تو مجھ کو کہنا چاہیے کہ اگر میدانِ جنگ میں کسی تُرک کے تلوے میں ایک کانٹا چبھ جائے، تو قسم ہے خدائے اسلام کی کہ کوئی ہندوستان کا مسلمان مسلمان نہیں ہو سکتا، جب تک وہ اس کی چبھن کو تلوے کی جگہ اپنے دل میں محسوس نہ کرے، کیونکہ ملّتِ اسلام ایک جسمِ واحد ہے اور مسلمان خواہ کہیں ہوں، اس کے اعضاء و جوارح ہیں۔ اگر ہاتھ کی انگلی میں کانٹا چبھے، تو جب تک باقی اعضاء کٹ کر الگ نہ ہو گئے ہوں، ممکن نہیں کہ اس صدمے سے بےخبر رہیں۔ اور یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں،

قوائے سیاسیہ کا بتدریج خاتمہ کر دیا جائے۔ اور بالفاظِ صاف تر یہ کہ دنیا کے جتنے حصّے اسلام کے زیرِ اثر باقی رہ گئے ہیں، ان کو بھی یورپ کی مسیحی حکومتیں کسی ایسی تقسیمِ مساوی کے ساتھ جو توازنِ دوَلی پر مؤثّر نہ ہو، آپس میں بانٹ لیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ اظہر من الشمس فی نصف النہار ہے اور جس شخص نے کم از کم گذشتہ دس برسوں کے اندر کے واقعات سے آنکھیں بند نہیں کر لی ہیں، وہ بغیر کسی بصیرتِ مزید کے اسے دیکھ سکتا ہے۔ پھر اگر یہ سچ ہے کہ ایک خنجر اسلام کے قلب میں پیوست کر دینے کے لیے تیز کیا جا رہا ہے، تو کیا مضایقہ اگر ہم کسی ڈھال کی تیاری میں مصروف ہوں! اگر خدا پرستی سے مسیح پرستی کی دشمنی قدیمی ہے اور یہ کوئی نئی مسیحی سازش نہیں، تو پیروانِ توحید کا حملہ مشرکین سے بچنے کے لیے اتحادِ اخوت بھی کوئی نیا حربہ نہیں ہے۔ یورپ جانتا ہے کہ مشرقی مسئلہ کی حکمتِ عملی کے لیے کوئی بچاؤ اگر اسلام کے پاس ہے تو صرف اس کا حقیقی اتحادِ اسلامی ہے، اور تمام دنیا کے مسلمانوں کا اس پر متفق ہو جانا ہے کہ اپنی قدیمی سیادت اور شرف کو محفوظ رکھیں۔ اسلامی زندگی کی آخری انسانی تلوار صرف ترکوں کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن ایک ترکی حکومت جس کے کئی قیمتی اجزا پر مسئلۂ مشرقی کی قینچی چل چکی ہے، مسیحی اتحاد کا کیا مقابلہ کر سکتی ہے؟ البتہ اگر چالیس کروڑ قلوب اسلامیہ ہلال کے نیچے جمع ہو جائیں، تو پھر وہ ایک ایسی قوت ہے جس کو سینکڑوں سکندر[19] اور ہنی بال[20] بھی ٹل کرنا نہیں کر سکتے۔ یورپ چونکہ یہ جانتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی جانتا ہے کہ غفلت اور اغراض پرستی نے مقامی و وطنی سرشاریوں میں مسلمانوں کو مبتلا کر دیا ہے اور ان کے باہمی بین الملّی اتحاد کے جسم میں مغربی الحاد کے جراثیم پیدا ہو چکے ہیں اس لیے گو فی الحقیقت کسی ایسے اسلامی اتحاد کا وجود نہیں ہے لیکن وہ وقت سے پہلے پیدا ہونے والی مقاومت کا استیصال کرنا چاہتا ہے؛ اور اس مشہور قاعدہ کی رو سے کہ اتقاء عن المرض خیر من معالجۃ بعد وقوعہ[21]، اسلام کی فضا

ان کے گزشتہ چار سو سال کی مسیحی خونریزی کا حساب لیا جائیگا۔ اور خُذُوْہُ فَغُلُّوْہُ ثُمَّ الْجَحِیْمَ صَلُّوْہُ کے نعروں کے ساتھ تمام دنیا کے درختوں پر صلیب پرستوں کی معلّق اور مصلوب لاشیں، ان کے خدائے مصلوب کی لاش کی طرح لٹکنے لگینگی۔ مگر یہ یورپ کے چہرۂ خونین کا عکس ہے جو اس کو عالمِ اسلامی کے آیینہ میں نظر آتا ہے۔

میں نے جب کبھی اس قسم کی تحریریں پڑھی ہیں، تو لکھنے والوں کے تعصب پر اس قدر متعجب نہیں ہوا ہوں جس قدر اس کے جواب دینے والے مسلمانوں کی جہالت، بلکہ اسلام فروشی پر۔ جب کبھی یورپ کے شیاطینِ سیاست نے "پان اسلام ازم" کی صدا بلند کی ہے، تو معًا مسلمانوں نے ڈر ڈر کر، اور کسی خونی مجرم کی طرح سہم سہم کر اپنی بریّت کے لیے بے اثر دلائل کی وظیفہ خوانی شروع کردی ہے۔ اور پھر اکثر اوقات غیروں کے خوش کرنے کے لیے اس میں اس درجہ غلو کیا ہے کہ خود اپنے تئیں بھول گئے ہیں۔



## مسئلہ مشرقی اور پان اسلام ازم

لیکن حضرات! یقین کیجیے کہ "پان اسلام ازم" کا فرضی خطرہ جس غرضِ مخفی سے دنیا کے سامنے لایا جاتا ہے، بہت کم مسلمان ہیں جن کی نظر اس کی حقیقی علت پر ہوگی۔ اس خطرہ کے اعلان پر برّیت اور احتیاط کی کوشش بالکل بے فائدہ ہے کیونکہ اس کی بنیاد جہل نہیں، بلکہ ایک نہایت سخت ابلیسانہ حکمتِ عملی ہے۔ قبل اس کے کہ مسلمان "پان اسلام ازم" کے جرم سے کانوں پر ہاتھ دھریں، ان کو خود یورپ سے پوچھنا چاہیے کہ "مسئلہ مشرقی" کی حقیقت کیا ہے؟ فَمَا کَانَ جَوَابُھُمْ فَھُوَ جَوَابُنَا![18]

کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ آج نصف صدی سے یورپ کی تمام مسیحی طاقتوں نے ایک خاص متفقہ حکمتِ عملی وضع کی ہے، اور اس کا نام "مشرقی مسئلہ" یا "مشرق کا فیصلۂ آخری" رکھا ہے۔ "مشرقی مسئلہ" کی حقیقی غایت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اسلام کے بقیہ

اور اس کا خلاصہ (لندن ٹائمز) نے چھاپا تھا۔ مجھ کو یاد ہے کہ اس کی آواز ان جملوں پر آکر رکی تھی:

اب اور کب تک اسلام کو آزاد چھوڑ دیا جائیگا۔ کہ وہ اپنی ہزار سالہ وحشت اور خونخواری کے واقعات بیسویں صدی میں دہراتا رہے! کب تک یورپ اپنی باہمی رقابت کے ہاتھوں عالمِ انسانیت کی مظلومی کا تماشا دیکھتا رہے گا! اسلام ایک خطرہ ہے اور اس کا بقا تمام تر خطرہ۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ یورپ اسلام سے جو زمین کا ٹکڑا لے لیتا ہے، وہ اس کا قدرتی حق ہے اور دولِ یورپ کے لیے مالِ غنیمت ہے، جس کی واپسی کا خیال بھی جنون ہے۔

یورپ اسلام کے نام لیوا چالیس کروڑ نفوسِ انسانی کو تہذیب اور تمدّن کے نام سے فنا کر دینا بیسویں صدی کی سب سے بڑی تمدّنی خدمت سمجھتا ہے۔ روس میں آج کئی ملین عیسائی موجود ہیں، جو عثمانیوں سے ہزار درجہ یورپین تمدّن سے اَبعد ہیں۔ سب سے پہلے اس خنجرِ تہذیب کی دھار کی مستحق ان کی گردنیں کیوں نہیں سمجھی جاتیں؟ اور جس تہذیب کے نام پر یہ صلیبی جنگ جاری کی گئی ہے، اگر یہ وہی تہذیب ہے جس کی ٹریجڈی ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو اٹالین تمثالِ تمدّن نے طرابلس میں دکھائی تھی، تو ہزار سلامتی ہو تجھ پر، اے وحشت و خونخواری، اور ہزار ہزار برکت و رحمت نازل ہو تجھ پر، اے افریقہ اور نائجیریا کی بربری و درماندگی! اور کبھی تیرے سایۂ برکت سے ہمارے سر جدا نہ ہوں۔

ع، وجودک ذنب لایقاس بہ ذنب[۲۳]

حضرات! یورپ کے نزدیک "مسئلہ مشرق" کا حل بالکل ایک قدرتی انصاف و عدل ہے۔ چالیس کروڑ نفوسِ اسلام کو مٹا دینے کا عملی تہیّہ کوئی تشویش انگیز بات نہیں۔ یہ اس پرانی مسیحی وصیّت کی تبلیغ و تکمیل ہے، جس کو سینٹ لوقا نے شہزادۂ امن (مسیح)

کرنے سے پہلے اس کے بچاؤ کی ڈھال کو فنا کر دینے کی تدبیروں میں مصروف ہے۔

پھر کیا ہو گیا ہے ان ملاحدہ مسلمین اور متفرنجین مارفین کو جو "پان اسلام ازم" کا نام سنتے ہی صبانا! صبانا! کا نعرہ لگانا شروع کر دیتے ہیں۔ اور قسمیں کھا کھا کر کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں کہ ہماری یورپ پرستی اور اسلام دشمنی کی پُرامن وفاداری میں کوئی اسلامی اتحاد خلل انداز نہیں ہو سکتا! کیا وہ اس انکار و تبرّی سے ٹھیک ٹھیک اس غرض و غایت کو پورا نہیں کرتے جو اس عملِ شیطانی کے تعلّق سے خود یورپ کے پیشِ نظر ہے۔

پروفیسر ویمبری[۲۲] جس نے اٹھارہ برس کی عمر سے تیس برس تک ترکوں کا نمک کھایا اور اس کے بعد ہمیشہ بحیثیت ایک اسلام پرست اور عثمانی بہی خواہ دوست کے سرائے یلدیز کی شاہانہ مہمان نوازیوں سے متمتع ہوتا رہا ہے۔ کل کی بات ہے کہ بوڈاپیسٹ ہیرلڈ میں اس تمہید کے اعادہ کے بعد کہ وہ مسلمانوں کا دوست ہے لکھ رہا تھا:

> اسلام کی حمایت سے اب کوئی فائدہ نہیں۔ وہ عنقریب فنا ہو جائے گا اور اس کو فنا ہی ہو جانا چاہیے۔ مسلمان ایک ایسی وحشی قوم ہے جس میں نہ تو طبیعت کا وجود ہے اور نہ طبیعت کو وہ محسوس کر سکتے ہیں۔ ان کو صرف خدا کی عبادت گزاری آتی ہے، مگر دنیا میں کام کرنا نہیں آتا۔ تمام انسانی حِسّ و شعور ان سے سلب ہو گئے ہیں؛ صرف ایک دینی جذبہ ان میں باقی ہے۔ نہ ان کا کوئی مسلک، اور نہ کائنات میں مقصد۔ پس اب یورپ کے لیے یہی باقی رہ گیا ہے کہ وہ اسلامی حکومتوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے آپس میں بانٹ لے۔

یہ مسلمانوں کے سب سے بڑے دوست کی آواز ہے۔ لیکن اب دشمنوں کو کہاں ڈھونڈیں۔ پروفیسر میکسین ہارڈن جو آسٹریا کے سب سے بڑے اخبار (نزنگفنت) کا مالک اور چیف ایڈیٹر ہے، چند سال ہوئے ہیں کہ اس نے "مسئلہ مشرقی" پر لکچر دیا تھا:

ہوئی ہیں۔
یہ تمھارے تمام خبائثِ شیطانی دنیا کے لیے تہذیب وتمدّن کی رحمت اور امن وصلح کی برکت ہیں ؛ لیکن اس کے مقابلے میں آٹھ سو اٹالین قیدی (عزیزیہ) اور (طبروق) کے صحرائی قبائل کی قید میں دن میں پانچ مرتبہ اس غذا سے بہتر غذا کھاتے ہیں، جو فوجِ طرابلس کے افسرِ عام کو نصیب ہوتی ہے۔ اور عین اس وقت جب کہ نخلستانِ طرابلس میں مسلمانوں کے شیر خوار بچوں اور خانہ نشین عورتوں کا قتلِ عام کیا جاتا ہے، ڈیڑھ سو سے زیادہ اٹالین قیدیوں کو — نشاط بے — خاص اپنا خیمہ دیتا ہے کیونکہ وہ ریگستان کی گرد اور تپش کے عادی نہ ہونے کی شکایت کرتے ہیں۔ لیکن پھر بھی اسلام اور اسلام کے محافظ ترک وحشت وبربریّت کا پیکر ہیں؛ اور لہذٰہ تہذیب و شائستگی کی تکمیل کے لیے ان کو مٹا دینا چاہیے!

پس اے برادرانِ ملّت! جس پان اسلام ازم کو یورپ پیش کر رہا ہے، اگرچہ اس کے وسائس آفرین دماغ سے باہر اس کا کوئی وجود نہیں، مگر اس سے برأت کی بے فائدہ کوشش نہ کیجیے۔ جس چیز کو آپ اپنی برارت میں پیش کرینگے، اس سے وہ بیخبر نہیں ہے۔ آپ اپنی بریّت کے اظہار میں آج کل کے ملاحدۂ مسلمین کی طرح خواہ اپنی جنسِ اسلامی کو جنسِ مغربی سے کیوں نہ بدل لیں، لیکن وہ کبھی پین اسلام ازم سے اپنے تئیں بیخطر نہ دکھلائینگے کیونکہ وہ دانستہ آپ کی ایک اصلی مدافعانہ قوت اتحادی کو اس طرح فنا کر دینا چاہتا ہے۔ آپ انکار کریں خواہ اقرار، دونوں حالتوں میں اس کا سلوک یکساں ہوگا۔

مَثَلُہٗ کَمَثَلِ الْکَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَیْہِ یَلْھَثْ اَوْ تَتْرُکْہُ یَلْھَثْ[26] (اس کی مثال کتے کی سی ہے۔ اگر اس کو دھتکار دو جب بھی زبان باہر لٹکائے رہیگا: اگر اس کو چھوڑ دو جب بھی زبان ہلاتا رہیگا۔)

کی زبانی دنیا کو سنایا تھا کہ وہ دشمن جو نہیں چاہتے کہ میں ان پر حکمرانی کروں، ان کو یہاں لاؤ، اور میرے قدموں کے آگے ذبح کر دو۔[24]

پس اس میں کوئی انسانی ظلم نہیں۔ قوموں کے قدرتی قوانین کا احترام اس بارے میں بالکل بے معنی ہے۔ اگر کوئی شئے قابلِ توجہ ہے تو صرف یہ ہے کہ یورپ کی رقیب حکومتیں ایک دوسرے پر بازی نہ لے جائیں۔ جسمِ اسلام کی اس طرح بوٹیاں نوچی جائیں کہ ہر بھیڑیے کے منہ میں مساوی تقسیم کے ساتھ ایک ایک لقمہ آجائے۔ لیکن جامعۂ اسلامیہ اسلام کی قدرتی اخوت، اس کا روزِ اوّل سے قائم کردہ رشتۂ اتحاد ـــــ تو یہ ایک سخت سے سخت معصیت اور جرم ہے، جس کا کوئی ذی روح مخلوق مجرم ہو سکتا ہے۔ یہ ایک کھلا عُدوان اور فساد ہے۔ یہ وحشیانہ تعصّب اور بربرانہ خونخواری کی سازش ہے۔ یہ ایک ایسا گناہ ہے جس کے لیے نفرین اور عذاب کے سوا اور کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ایک ایسی تاریک زندگی ہے جو صرف اس لیے ہے کہ اسے مٹا دیا جائے۔ ذَالِکَ قَوۡلُهُمۡ بِاَفۡوَاهِهِمۡ یُضَاهِئُوۡنَ قَوۡلَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ قَبۡلُ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰی یُؤۡفَکُوۡنَ۔[25]

لیکن اے اقوامِ یورپ! اے دزدانِ قافلۂ انسانیت! اے مثالِ درندگی و سبعیّت! اے مجمعِ وحوش و کلاب! ظلم و عدوان تابکے؟ اور خون و خونریزی تا چند؟ کب تک خدا کی سرزمین کو اپنے حیوانی غرور سے ناپاک رکھو گے؟ کب تک انصاف ظلم سے اور روشنی تاریکی سے مغلوب رہیگی؟ تبریز میں تمہارے ہاتھوں انسانوں کی گردنیں سولی پر لٹک رہی ہیں۔ طرابلس کی ریت پر اب تک اس جمے ہوئے خون کے ٹکڑے باقی ہیں، جو تمہاری آنکھوں کے سامنے تمہارے ایک پینیرو نے بہایا۔ مراکش میں ان لاشوں کا شمار کوئی انسان نہیں کر سکتا جن میں سے سینکڑوں کو مٹی کے بوجھ کی جگہ تمہارے گھوڑوں کے سموں کی پامالیاں اور تمہارے جنگی بوٹوں کی ٹھوکریں نصیب

اور بیداری سے بھی باز رکھے اور رہی سہی قوت کا بھی نشو و نما سے پہلے خاتمہ کردے۔

## مسئلہ مسلم یونیورسٹی اور مسئلہ بقائے اسلام

اے حضرات! یاد رکھیے، آج اسلام کے لیے مسلمانوں کے لیے، کوئی وطنی اور مقامی تحریک سود مند نہیں ہو سکتی اور اس کشتی کے تیرنے کے لیے اصلی نہ کہ یورپ کے اختراعی پان اسلام ازم کے سوا اور کوئی بادبان نہیں ہے۔ ایک قوم جو ریگستانِ عرب سے دیوارِ چین تک آباد ہے، اس کو زمین کے کسی خاص ٹکڑے کا تغیر کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے!

جس قدر مقامی کوششیں آج عمل میں آرہی ہیں، خواہ وہ مصر میں ہوں یا ترکی میں، الجزائر میں ہوں یا اس تیرہ زارِ ہند میں، میرے عقیدہ میں یہ سب کچھ کاہنِ شیطان کا ایک عمل السحر ہے، جو اس لیے سُلاتا ہے کہ سونے والوں کا اٹھنا اسے پسند نہیں ہیں نے کہا کہ ہم میں سچا پان اسلام ازم یا بالفاظِ اصلی رشتۂ اخوتِ دینی باقی نہیں رہا۔ اور کیونکر باقی رہے جب کہ ہندوستان میں ایسے عظیم الشّان اشغال ہمارے لیے موجود ہیں جو نفسِ اسلام کے بقا سے بھی زیادہ اہم ہیں۔ ان کو چھوڑ کر ہم غریب ترکوں یا ایرانیوں کی کیونکر خبر لیں! سب سے مقدّم امر یہ ہے کہ ہمیں علی گڈھ میں ایک یونیورسٹی بنانی ہے؛ اس کے لیے تیس لاکھ روپیہ جمع کرنا ہے۔ یہ مانا کہ دنیا کی کوئی سرزمین ہے جہاں خود اسلام کے بقا و فنا کا سوال در پیش ہے۔ مگر اس کو کیا کیجیے کہ "مسلم یونیورسٹی" ہمارے قومی مقاصد کا اصلی نصب العین کعبۂ علی گڈھ کے شب زندہ دارانِ عبادت کی چہل سالہ تہجد گزاری کی مراد، آرزو، اور ہمارے رہنمائے اوّل کی دی ہوئی شریعتِ تعلیم کا یومِ تکمیل ہے۔ جس دن یونیورسٹی بن جائیگی اس دن اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا[29] کی وحی اسٹریچی ہال کی چھت پر نازل ہوگی۔ ترکوں کی ہمدردی اور ایرانیوں کی مصیبت پر ادائے فریضۂ تشکّر کے بعد ایک

# کاش مسلمانوں میں پان اسلام ازم ہوتا

مسلمان "پان اسلام ازم" کے نام پر استغفار پڑھ رہے ہیں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اے کاش، آج مسلمانوں میں پان اسلام ازم کا وجود ہوتا۔ وہ پان اسلام ازم جس کو ترکی یا انگلستان کے مسلمانوں کی کسی خفیہ کمیٹی کے پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ روزِ اول سے ہم کو جس کی دعوت دی گئی ہے۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا[27] (ایک دین الٰہی کی رسی سب مل کر پکڑ لو اور آپس میں متفرق نہ ہو۔)

اگر پان اسلام ازم کا اصلی وجود ہوتا تو کیا ممکن تھا کہ ہمارے سامنے ایران پر قیامت گذر جاتی، مراکش کا خاتمہ ہو جاتا، طرابلس میں مسلمانوں کی لاشیں تڑپتیں اور ہمارے قلوب میں کوئی حقیقی حرکت پیدا نہ ہوتی۔ روضۂ مبارک حضرت امام رضا علیہ السلام کی دیواریں ملاعنۂ روسیہ کی گولہ باری سے گر گئیں، برقہ کی مسجدوں کے میناروں پر اٹلی کے مشرکین و مریم پرست چڑھ گئے، تاکہ عین اس مقام پر جہاں سے خدائے واحد کی تقدیس و تسبیح کی صدائیں بلند کی جاتی ہیں، رومن کیتھولک بُت پرستی کا عَلَم نصب کریں۔ لیکن مجھ کو بتلاؤ کہ کتنے ہندوستان میں مسلمان ہیں جن کے دلوں میں زخم آئے، اور کتنے ہیں جن کے جگر میں ٹیس اٹھی؟

لمثل ھذا یذوب القلب من کمد
ان کان فی قلب الاسلام و ایمان[28]

سچ یہ ہے کہ ہم اپنے اصلی پان اسلام ازم کو کھو چکے ہیں۔ اور یہی علت اسلام کے اصلی ضعف اور انحطاط ہے، مگر چونکہ اس کا بیج اب بھی ہم میں موجود ہے گو برگ و بار نہیں، اس لیے یورپ چاہتا ہے کہ اس طرح کے انتشارات سے سہما اور ڈرا کر ہم کو آئندہ کی ہوشیاری

کے مظاہر کہاں تلاش کیے جائیں، تو اس کا جواب علم و فن کی بڑی بڑی درسگاہوں اور علوم الاولین والآخرین کے کتب خانوں سے نہیں ملیگا۔ بلکہ ان آہن پوش جہازوں کے مہیب طول و عرض سے جن کی قطاریں ساحل کے طول میں پھیلی ہوئی ہیں اور جن کے روزنوں سے آہن پوش توپوں کے دہانے نکلے ہوئے ہیں۔

پس حضرات! وہ ہاتھ نہایت مقدس ہے جس میں صلح کا سفید جھنڈا لہرا رہا ہو۔ مگر زندہ وہی ہاتھ رہ سکتا ہے جس میں خونچکاں تلوار کا قبضہ ہو۔ یہی اقوام کی زندگی کا منبع، قیامِ عدل و میزان کا وسیلہ، انسانی سبعیت و درندگی کا بچاؤ اور مظلوم کے ہاتھ میں اس کی حفاظت کی ایک ہی ڈھال ہے۔ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَاَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡمِيۡزَانَ لِيَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ وَاَنۡزَلۡنَا الۡحَدِيۡدَ فِيۡهِ بَاۡسٌ شَدِيۡدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ [۳۲] (ہم نے اپنے رسولوں کو کھلی کھلی نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان کو کتاب اور میزان دی تاکہ لوگ عدل اور انصاف پر قائم ہوں۔ اور نیز لوہا پیدا کیا جو ہتھیاروں کی صورت میں سخت خطرناک بھی ہے اور نفع رساں بھی۔)

## اسلام کی پولیٹکل طاقت کا مرکزِ وحید

مسلمان یاد رکھیں کہ آج صرف ایک ہی تلوار ہے جو دینِ الٰہی کی حمایت میں بلند ہو سکتی ہے اور وہ آلِ عثمان کی مقدس شمشیرِ خلافت ہے۔ یہ اسلام کے گزشتہ قافلہ جہانبانی کا آخری نقشِ قدم اور ہمارے آفتابِ اقبال کی آخری شعاعِ امید ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہمارا ترکوں سے رشتہ محض دینی اخوت ہی کا نہیں ہے، بلکہ اس سے بھی مقدم تر رشتہ خلافتِ اسلامیہ کے دینی احترام کا ہے، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ کوئی قوم بغیر کسی سیاسی مرکز کے زندہ نہیں رہ سکتی اور اسلام کا کوئی مرکز سیاسی اگر ہے تو صرف خلافتِ آلِ عثمان ہے۔ ہر مسلمان خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں ہو، اگر اس کا فرض دینی کہ اسلام کی

ریزولیوشن پاس کر دیا جائیگا، مگر اس افسوس پر ملامت نہ کیجیے کہ کمبخت طرابلس کے جھگڑے سے یونیورسٹی کے چندے میں فرق آگیا! اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اشۡتَرَوُا الضَّلٰلَۃَ بِالۡہُدٰی فَمَا رَبِحَتۡ تِّجَارَتُہُمۡ وَمَا کَانُوۡا مُہۡتَدِیۡنَ[30]

اے عزیزانِ ملت! قوموں اور ملکوں کی زندگی کا نہیں، بلکہ اسلام کی زندگی کا سوال ہے۔ فرض کیجیے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی ترقی کے تمام منصوبے پورے کر لیے اور ان کا ہر فرد تعلیم اور دولت کا ایک مرتّب طلائی بت بن گیا؛ لیکن اگر سرے سے خود اسلام کی سیاسی طاقت پر چھری چل گئی تو پھر علی گڈھ میں یونیورسٹی ہی نہیں، بلکہ چاندی اور سونے کی بہشتِ شداد بھی بن جائے، مگر اس کے حور و غلمان کس کا ترانہ گائینگے؟

السیف اصدق انباء من الکتب[31]

اے اخوانِ عزیز! یاد رکھیے کہ دنیا میں امن، صلح اور ترکِ قتل و غارت کا تصوّر کتنا ہی خوشنما ہو، مگر دنیا کی بدقسمتی سے اب تک اصلی قوت تلوار کی قوت اور زندگی کا سرچشمۂ آبِ حیات خون کی ندیوں اور فواروں ہی میں ہے۔ دنیا پر اب تک کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا ہے کہ تلواروں کی صداقت ضعیف ہوئی ہو؛ اور امید نہیں کہ آیندہ بھی ایسا زمانہ نصیب ہو۔ غریب اخلاق نے ہمیشہ اپنے تنگنائے بیکسی میں چھپ کر کسی ایسی دنیا کی منّتیں مانی ہیں، جب کہ تمام کائنات انسانوں کی ملائکۂ معصومین کی بہشت زار بن جائیگی اور قتل و خونریزی کو لوگ اسی طرح بھول جائینگے جس طرح موجودہ عالم نے امن اور صلح کو فراموش کر دیا ہے۔ اس آرزو کے حسن و جمال پر کون دل ہے جو فریفتہ نہیں ہوگا۔ لیکن کیا کیجیے کہ دنیا امید اور آرزو ہی نہیں بلکہ حقائق و نتائج کی جگہ ہے اور انسان جب تک فرشتہ نہیں بلکہ انسان ہے، اس وقت تک ایسی امیدوں کا اخلاق کے صفحوں سے باہر پتہ لگنا ممکن نہیں۔ آج اگر پوچھا جائے کہ قوموں کی زندگی اور زندگی

وَمَا كَانَ قَيْسٌ هُلْكُهُ هُلْكَ وَاحِدٍ
وَلٰكِنَّهُ بُنْيَانُ قَوْمٍ تَهَدَّمَا[٣٣]

حضرات! وہ قوم جس کا ظہور تیرہ سو برس ہوئے کہ مکہ کی ایک جزیرہ نما سے ہوا تھا اور جو مسلم کے لقب سے پکاری جاتی ہے، اس کا عقیدہ تو وہی ہے جس کو میں نے بیان کیا لیکن بدقسمتی سے ایک دوسری قوم بھی ہم میں موجود ہے جو اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتی۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی دنیوی عزت و شوکت کا جُوا کھیلا ہے اور اس کے لیے ملتِ مظلومہ کو ایک بازیچہ بنا لیا ہے۔ ہوائے نفس جن کا الٰہ ہے، حکام و امراء جن کے معبود ہیں، درہم و دینار جن کا قبلہ ہے، قانون و تعزیرات جن کی شریعت ہے، جو قریشِ مکہ کے صامت و ساکن بتوں کی جگہ سمندر پار سے آئے ہوئے متحرک بتوں کو پوجتے ہیں۔ جو وحیِ الٰہی کی جگہ سمائے شملہ سے اترے ہوئے احکام و فرامین کو اپنی کتاب و سنت یقین کرتے ہیں اور جن کے قلوب اصابع الرحمٰن کی جگہ اصابع الشیاطین میں ہیں یُقَلِّبُهَا كَيْفَ يَشَاءُ[٣٤] غرضکہ اَلَّذِينَ يَسْتَحِبُّونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا أُولٰئِكَ فِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ[٣٥]۔

تو اے حضرات! اس قوم کے عقیدہ میں 'پان اسلام ازم' یا اسلام کا بین الملی اتحاد ایک کفرِ صریح ہے۔ خلافتِ اسلامی کوئی شے نہیں۔ مسلمانانِ ہند کو ترکوں سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کو اپنی خلافتِ راشدہ کے سوا اور کسی طرف گوشۂ چشم سے بھی نہیں دیکھنا چاہیے۔ اگر ایسا کریں تو فرضِ اطاعت اولی الامر کی خلاف ورزی کے مجرم! ترکی فتح پر تبریک و تہنیت کا تار دینا داخلِ خفیف الحرکتی، اور بغیر ان کے معبودانِ کونسل کی اجازت قطعاً حرام و معصیت! یہ لوگ یورپ کے ان شیاطینِ سیاست کے ہاتھ میں جو خلافتِ اسلامیہ کے بین المللی اثر کے مٹانے کے لیے تیس برس سے اپنا مشن

اسلام کی بقا کا خواستگار ہو، تو یہ بھی فرضِ دینی ہے کہ خلافتِ آلِ عثمان کے تعلق کو ایک خالص دینی رشتہ کی طرح اپنے دل میں محفوظ رکھے اور دنیا کی جو حکومت اس کی دشمن ہو اس کو اسلام کا دشمن اور جو اس کی دوست ہو، اس کو اسلام کا دوست یقین کرے، کیونکہ مسلمانوں کی دوستی اور دشمنی انسانی اغراض کے لیے نہیں، بلکہ صرف دینِ الٰہی کے لیے ہے۔

مسلمانانِ ہند کی نسبت بار بار سیاسی حلقوں میں یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ وہ دنیا کے کسی اسلامی حصّے کے واقعات سے اس درجہ متاثر نہیں ہوتے جس قدر ٹرکی کے حوادث و حالات سے۔ اگر محض رشتۂ اخوت و اشتراکِ مذہب ہی اس اثر پذیری کی علّت ہے، تو اس میں ترکوں کی خصوصیت کیا ہے؟ بہت سے لوگ ہیں جو اس واقعی ضروری سوال کے جواب میں یا تو نفاق سے کام لینا چاہتے ہیں یا کفر سے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کے لیے بہتر راہ اسلام کی ہے مسلمانوں کو بغیر ادنیٰ تامّل کے صاف صاف اس سچے سوال کا جواب دینا چاہیے۔

تمام دنیا کے مسلمانوں سے ہمارا صرف ایک ہی رشتہ ہے: دینی اخوت اور پان اسلام ازم کا مگر ترکوں سے ہمارے دو رشتے ہیں: پہلا اخوتِ دینی کا کہ وہ بھی مسلمان ہیں، اس لیے خدا نے ہم کو ہمیشہ کے لیے ان کے رنج و راحت کا شریک بنا دیا ہے؛ دوسرا اس سے بھی قوی تر رشتہ خلافتِ دینی اور اسلام کے آخری سیاسی مرکز ہونے کا کہ آج کلمۂ اسلام کی حفاظت کی آخری تلوار صرف اُن کے ہاتھ میں ہے۔ اگر کسی اور خطّہ سے اسلام کی حکومت مٹتی ہے تو ہم سوچتے ہیں کہ ہمارا ایک عضو کٹ گیا۔ لیکن ترکوں پر جب کوئی آفت لائی جاتی ہے تو تڑپ جاتے ہیں کہ ہمارا دل دو نیم ہو گیا۔ جب ترکوں کے لیے مضطرب ہوتے ہیں، تو ہمارا اضطراب مسلمانوں کے لیے نہیں ہوتا، بلکہ اسلام کے لیے ہوتا ہے۔

علّت کیا ہے۔ اور ان کے ظاہر و باطن میں باہم کیا ربط ہے وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ۔[۳۷]
(یہ منافق جب مسلمانوں سے ملتے ہیں، تو کہتے ہیں ہم مسلمان ہیں لیکن اپنے شیطانوں کے پاس تنہائی میں جاتے ہیں، تو کہتے ہیں، دل سے تو ہم تمہارے ہی ساتھ ہیں؛ ظاہری کارروائیاں جس قدر ہماری ہیں وہ ایک تمسخر و دل لگی سے زیادہ نہیں) اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ[۳۸]

اے اخوانِ ملت! آج وہ وقت آگیا ہے کہ دلوں پر سے پردے اٹھ جائیں اور کفر و ایمان میں تمیز ہو جائے۔ یقین کیجیے کہ یہ ایک سب سے بڑی اور شاید آخری ابتلائے عظیم ہے جو صرف اس لیے ہے کہ اللہ مدعیانِ ایمان کو آزمانا چاہتا ہے وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتَّىٰ نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِينَ مِنكُمْ وَالصَّابِرِينَ[۳۹] (اور اللہ تم کو آزمائے گا یہاں تک کہ سچے مجاہد اور صابر جھوٹوں سے الگ ہو جائیں)

آج وہ دن آگیا ہے جب مسلمانوں کے دل پہلوؤں کی جگہ ان کے چہروں پر آجائیں گے جب کہ یا تو دلوں کی سیاہی سے ان کی پیشانیاں بھی تاریک ہو جائیں یا دل کے ایمان کی روشنی ان کی پیشانی پر چمکنے لگے گی۔ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ[۴۰] (وہ دن جب کہ یا تو چہرے چمک اٹھیں گے یا سیاہ پڑ جائیں گے وہ وہ لوگ ہوں گے جنھوں نے ایمان لانے کے بعد انکار کیا اور ان کے لیے وہی عذاب ہوگا، جس سے وہ انکار کیا کرتے تھے، اور جن لوگوں کے چہرے چمکنے لگیں گے، ان کے لیے اللہ کی رحمت کا آشیانہ ہوگا جس میں ہمیشہ کے لیے ان کو جگہ مل جائے گی۔)

یاد رکھیے کہ خدا تعالیٰ اپنے کلمۂ توحید کی حفاظت کے لیے ہم مسلمانوں کی اعانت کا

پھیلا رہے ہیں، ایک آلۂ عمل رہے ہیں اور ہمیشہ دنیا کو اس کا یقین دلایا ہے کہ مسلمانانِ ہند کو خلافتِ اسلامی اور ترکوں کے بقا و فنا سے کوئی تعلق نہیں۔ حال آنکہ جس وقت اپنے معبودانِ باطل کے آگے اِن لوگوں کی زبان اور قلم سے یہ جملے نکل رہے تھے، یقین کیجیے کہ اس وقت اللہ اور ملائکہ کی لعنت اور پھٹکار ان پر نازل ہو رہی تھی کیونکہ اس طرح بے تعلقی ظاہر کرکے یہ اُس رشتے کو کاٹ رہے تھے، جس کو خدائے ابراہیم و محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تمام دنیا کے مسلمانوں میں قائم کر دیا ہے؛ اور گویا اس پر اپنی رضا و مسرت ظاہر کرتے تھے کہ وہ لاکھوں مسلمان جو اس آخری وقت میں کلمۂ توحید کی حفاظت کر رہے ہیں، صلیب پرستوں کی تلواروں سے فنا کر دیے جائیں۔ یہ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت دیتے تھے، کیونکہ مسلمانوں کی اذیت پر خوش تھے؛ اور مسلمانوں کی اذیت پر خوش ہونا یہی اللہ اور اس کے رسول کی اذیت پر خوش ہونا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ لَعَنَہُمُ اللّٰہُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ وَاَعَدَّ لَہُمْ عَذَابًا مُّہِیْنًا۔ (جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت دیتے ہیں، دنیا اور آخرت میں اللہ نے ان پر لعنت کی اور ان کے لیے ایک ذلت بخش عذاب تیار کیا گیا ہے۔)

اب زمانے نے پلٹا کھایا ہے، زمین اور آسمان دونوں طرف سے تازیانہ ہائے عذاب ان پر پڑ رہے ہیں۔ اس لیے گو دل نہ ہلے ہوں، مگر زبانیں کچھ کچھ ہلنے لگی ہیں۔ اب ترکوں سے اس قدر بیمہری ظاہر نہیں کی جاتی۔ خلافتِ اسلامیہ کا نام آتے ہی اس سے انکار و تبرّی کے تار یا نیر میں نہیں بھیجے جاتے۔ مدت سے کوئی پمفلٹ بھی مسئلۂ خلافت پر شائع نہیں کیا گیا ہے؛ ریزولیشن کے پاس کرنے سے بھی چنداں انکار نہیں ہے بعض اصحاب کی تو بظاہر اس درجہ قلبِ ماہیت ہو گئی ہے کہ علانیہ ترک مجروحین کے لیے چندے میں بھی شرکت کر رہے ہیں۔ تاہم ہم کو معلوم ہے کہ اس انقلاب کی اصلی

اُس کی کتاب پر ایمان رکھتا ہے، فرض ہے کہ آج جہاد فی سبیل اللہ کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔ سب سے پہلا جہاد اس کے لیے جہادِ مال ہے؛ اور اس کے بعد اگر ضرورت ہو تو جہادِ نفس و جان۔ مال و متاع کو بھیج دو اور اپنی جانوں کو ہتھیلیوں پر تیار رکھو۔ آج اگر ضرورت پیش نہ آئی تو کیا مضائقہ ہے کل کوئی نہ کوئی صورت نکل آئیگی۔ یہ متاع ایسی نہیں، جس کی قربانی بیکار جائے۔

بطاعت کوش، گر عشقِ بلا انگیز میخواہی
متاعے جمع کن، شاید کہ غارتگر شود پیدا

مسلمانو! یاد رکھو کہ اوروں کی جانیں ان کے قبضوں میں ہونگی، مگر ہم مسلمانوں کی جانیں ہمارے اختیار میں نہیں ہیں۔ اسلام ایک خرید و فروخت ہے، جو ناقص کو لیتا ہے اور کامل کو دیتا ہے، فنا کو خریدتا ہے اور بقا اس کی قیمت میں دیتا ہے۔ ہم نے جس وقت اقرار کیا کہ ہم مسلم ہیں، اُسی دن اِس کا بھی اقرار کر لیا کہ ہماری جانیں اسلام کے ہاتھ بک گئیں۔ اسلام کے معنی ہی یہ ہیں کہ خدائے واحد کے آگے اپنی گردن کو جھکا دینا۔ پھر خواہ وہ اسے دوستوں کی گود میں ڈال دے، یا دشمنوں کی تیغ کے سپرد کرے۔ کیا نہیں دیکھتے کہ جب حضرت ابراہیم نے حکمِ الٰہی کے آگے سر جھکا دیا اور حضرت اسماعیل کی گردن قربان ہونے کے لیے مستعد ہو گئی، تو اس وقت فرمایا:

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ وَ نَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ۔[۴۳]

(پس جب وہ دونوں مسلم ہوئے اور ابراہیم نے اسماعیل کو پیشانی کے بل زمین پر گرا دیا (تاکہ ذبح کرے) تو ہم نے

محتاج نہیں ہے، بلکہ ہم اس کے فضل کے محتاج ہیں۔ اس تیرہ سو برس کے اندر اسلام میں کتنی قومیں آئیں اور اپنی اپنی باری سے اسلام کی حفاظت کا فرض ادا کرگئیں اگر اس آخری آزمایش میں بھی ہم پورے نہ اُترے تو کیا عجب ہے کہ قدرتِ الٰہی اپنے دینِ مبین کی حفاظت کے لیے دوسروں کو چن لے اور ہم کو اسی طرح اپنے دروازے سے مطرود و مردود کردے، جس طرح ہم سے پہلے بہت سی قومیں ہوچکی ہیں۔ یٰاَیُّھَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ، وَاللّٰہُ ھُوَالْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ اِنْ یَّشَآءْ یُذْھِبْکُمْ وَیَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ[41] (اے لوگو! تم اللہ کے دروازہ کے فقیر و سائل ہو۔ اللہ تو تمہاری مدد سے بے نیاز ہے اگر وہ چاہے تو تم سے اپنا رشتہ کاٹ لے اور ایک دوسری مخلوق کو پیدا کردے اور اس کے لیے یہ کچھ مشکل نہیں ہے۔) اللہ کے عجائب کاروبارِ قدرت کے یہ تماشے پہلے ہی دن سے ہیں۔ کیا نہیں دیکھتے کہ اُس نے مکّہ کی سرزمین کو محبوب ہونے کا شرف عطا فرمایا اور قریشِ مکّہ کو اپنے نورِ رسالت کا حامل بنایا! لیکن جب انھوں نے اس احسانِ الٰہی کی قدر نہ کی، تو غیرتِ الٰہی نے کہا کہ وہ اپنے کاموں کی تکمیل کے لیے کچھ سرزمینِ مکّہ ہی کا محتاج نہیں ہے، دینِ حق کی اعانت کے لیے مدینہ والوں کو بھیج دیا یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ۔[42] (اے مسلمانو! اگر تم میں سے کوئی دینِ الٰہی سے منہ موڑیگا، تو اللہ کو اس کی کچھ پروا نہیں، وہ ایسے لوگوں کو موجود کردیگا، جن کو وہ دوست رکھیگا، اور وہ اس کو دوست رکھینگے۔)

## الی الجہاد فی سبیل اللہ

اے اخوانِ عزیز! میں جس چیز کے اعلان سے نہیں ڈرتا، تعجب ہے اگر آپ اس کی سماعت سے خوفزدہ ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ ہر اُس مومن پر جو اللہ اور اس کے رسول اور

## ۲

# افتتاح مدرسۂ اسلامیہ

**کلکتہ، ۱۳ دسمبر ۱۹۲۰ء**

مہاتما جی!

آپ نے ہندستان کے مختلف مقامات میں ترکِ موالات کا جوش دیکھا ہے۔ بہت سے کالجوں اور اسکولوں سے طلبہ کا مقاطعہ ملاحظہ کیا ہے، اور پھر بہت سی افسوسناک عہد شکنیاں بھی دیکھی ہیں۔ میں اُن رنجدہ واقعات کا ذکر نہ کرونگا، جو جھانسی اور علی گڈھ میں ہو چکے ہیں، تاہم اتنا ضرور کہونگا کہ اِس وقت طلبہ کی جو جماعت آپ کے سامنے ہے، اور جس کی آنکھیں آپ کے چہرے پر گڑی ہوئی ہیں، یہ وہ جماعت ہے جس نے جو عہد اوّل دن کیا تھا، اب تک اس پر پوری طرح قائم ہے۔ یہ وہ جماعت ہے، جس نے دین کو دنیا پر ترجیح دی ہے۔ یہ وہ جماعت ہے جس نے مدرسۂ عالیہ کلکتہ کی شاندار عمارت اور اس کے عالیشان ہوسٹل کو، جس میں بہترین سامان آرائش و آسایش مہیا تھا محض احکام الٰہی کی پابندی اور سچے ہندستانی کی حیثیت سے چھوڑ دیا ہے؛ اور اس طرح وہاں سے نکلی ہے کہ اسے یہ بھی خبر نہ تھی کہ کہاں جارہی ہے اور کہاں رہیگی! یہ وہ جماعت ہے جس نے ترکِ موالات کی راہ میں ہر طرح کی تکالیف برداشت کی ہیں۔ بھوک پیاس کی سختی جھیلی ہے اور جاڑے کی

پکارا کہ اے ابراہیم! (بس کرو) تم نے اپنا خواب پورا کر دکھایا۔)

یں سچی علم پرستی کی ایک روشنی برابر چمکتی رہی ہے۔ یہ ہندستان کے طالبینِ علم کی وہ جماعتیں ہیں، جو اسلام کے قدیم مذہبی علوم اور مذہبی زبان کے فنون، مختلف عربی مدرسوں یں حاصل کر رہی ہیں۔ آپ یقین کیجیے کہ بجا طور پر آج صرف یہی ایک جماعت علم کی سچی پرستار کہی جا سکتی ہے۔ ان لوگوں کو معلوم ہے کہ انگریزی تعلیم وسیلۂ رزق ہے۔ یہ جانتے ہیں کہ انگریزی تعلیم کی ڈگریاں لے کر بڑے بڑے عہدوں اور نوکریوں کے دروازوں یں قدم رکھ سکتے ہیں، اور ایک کلرک سے لے کر لارڈ سنہا کی نوکری تک صرف انگریزی تعلیم ہی سے مل سکتی ہے۔ ان کو پوری طرح یقین ہے کہ عربی تعلیم کو آج کوئی نہیں پوچھتا، یہی کہ روٹی بھی اس کے ذریعہ نہیں مل سکتی۔ پھر بھی ان کے دلوں میں ایک مخفی مگر طاقتور جذبہ موجود ہے، جو انگریزی تعلیم کی طرف جانے نہیں دیتا، اور اس کس مپرسی میں بھی عربی تعلیم ہی کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دیتے ہیں۔

یہ جذبہ بجز علم پرستی اور رضائے الٰہی کے اور کوئی دنیوی غرض نہیں رکھتا، اور اس لیے ہندستان بھر میں علم کو علم کے لیے اگر کوئی پڑھنے والی جماعت ہے، تو وہ عربی مدارس ہی کی جماعت ہو سکتی ہے۔ علی گڈھ کے کسی طالب علم نے کالج نہیں چھوڑا۔ جب تک دو دو گھنٹے تک مجھ سے ردّ و کد کر کے اطمینان نہیں کرالیا کہ سرکاری تعلیم چھوڑنے کے بعد بھی وہ زندہ رہ سکیں گے، حتیٰ کہ بعضوں نے مجھ سے اس کی ذمہ داری بھی طلب کی۔ لیکن میں آپ کو بتلاتا ہوں کہ ان طلبہ میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے یہ سوال کیا ہو، بلکہ جس وقت ان کو احکامِ شرع بتلا دیے گئے، فوراً اطاعت کا سر جھکا دیا اور سب کچھ چھوڑ دینے کے لیے تیار ہو گئے۔

میں نے اس چیز کی طرف آپ کو اس لیے توجہ دلائی ہے کہ جوہر شناس، صرف جوہری ہی ہو سکتا ہے؛ اور میں جانتا ہوں کہ آپ اخلاص اور ایثار کے جوہر شناس ہیں۔

طویل راتیں ٹھنڈی زمین پر گزاری ہیں، اور اب تک گزار رہی ہے کیونکہ سونے کے لیے اب تک اس کے پاس چارپائیاں نہیں ہیں۔

اس سلسلے میں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ جس مدرسے میں آپ اس وقت موجود ہیں، اس کی تاسیس بالفعل ترکِ موالات کے سلسلے میں ہوئی ہے، مگر اس کا خیال عرصے سے میرے ذہن میں تھا اور میں مدت سے خیال کر رہا تھا کہ عربی تعلیم کو جو صرف صوبۂ بنگال ہی میں سرکاری غلامی میں ہے، آزاد کراؤں۔ چنانچہ اس کے متعلق اس کے متولیوں سے بارہا گفتگو ہوئی، یہاں تک کہ بالآخر یکم ربیع الاول کو اس کی تجدید ہو گئی۔ میں نے تجدید کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ یہ مدرسہ اُس وقت سے قائم ہے، جب سے جامع مسجد بنی ہے۔ البتہ اپنی اس نئی زندگی میں اُسے مکتب کے درجے سے ہٹا کر اعلیٰ تعلیم گاہ کی حیثیت میں کر دیا گیا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ اس موقع پر آپ کو اِس جماعت کی ایک ممتاز خصوصیت کی طرف توجہ دلاؤں۔ ہندستان میں سرکاری تعلیم نے جو نقصانات ہمارے قومی خصائل و اعمال کو پہنچائے ہیں، ان میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ تحصیلِ علم کا مقصدِ اعلیٰ ہماری نظروں سے محجوب ہو گیا ہے۔ علم خدا کی ایک پاک امانت ہے اور اس کو صرف اس لیے ڈھونڈھنا چاہیے کہ وہ علم ہے؛ لیکن سرکاری یونیورسٹیوں نے ہم کو ایک دوسری راہ بتلائی ہے۔ وہ علم کا اس لیے شوق دلاتی ہے کہ بلا اس کے سرکاری نوکری نہیں مل سکتی۔ پس اب ہندستان میں علم کو، علم کے لیے نہیں؛ بلکہ معیشت کے لیے حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ بڑی بڑی تعلیمی عمارتیں، جو انگریزی تعلیم کی نو آبادیاں ہیں، کس مخلوق سے بھری ہوئی ہیں؟ مشتاقانِ علم اور شیفتگانِ حقیقت سے؟ نہیں، ایک مٹھی گیہوں اور ایک پیالا چاولوں کے پرستاروں سے، جن کو یقین دلایا گیا ہے کہ بلا حصولِ تعلیم کے وہ اپنی غذا حاصل نہیں کر سکتے۔

لیکن میں آپ کے علم میں یہ حقیقت لانی چاہتا ہوں کہ علم کی اِس عام توہین و تذلیل کی تاریکی

ی ہیں ایک ایسے شہر میں جیسا کہ یہ شہر ہے اور جیسی کہ اس شہر کی تاریخ ہے، میں سمجھتا
ں کہ ان تمام بیانات کی جو انسان کی گویائی کر سکتی ہے، کچھ ضرورت نہ تھی، آپ
جھتے ہیں کہ اس دنیا میں جس طرح خدا کی سچائی کے مختلف بھیس ہیں، خدا کی سچائی کے لیے
ختلف نقاب ہیں۔ اگرچہ بھیس مختلف ہوتے ہیں، لیکن صورت مختلف نہیں ہوتی۔ اسی طرح
یائی کی بھی مختلف زبانیں ہیں اور سچائی ہمیشہ ان مختلف زبانوں سے اپنی فصاحت و بلاغت
پ کے کانوں تک پہنچاتی ہے۔

ں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ سچائی کی زبان ایک تو وہ ہے، جس کا تعلق ہماری، آپ کی
کی دی ہوئی، گویائی سے ہے، جو زبان سے تعلق رکھتی ہے، وہ آواز جو حلق سے نکلتی ہے
یک گویائی تو وہ ہے جو زبان سے تعلق رکھتی ہے، جس کے لیے زبان کو گویائی اور تکلم کی
ضرورت ہے۔ لیکن اس دنیا میں ایک دوسری خاموش بلاغت اور گویائی بھی ہے، وہ گویائی
جس کے لیے کانوں کی ضرورت نہیں ہے کہ کان سنیں؛ بلکہ اس گویائی کو آنکھوں کی ضرورت ہے،
کہ دو آنکھیں اس کا مطالعہ کریں۔

یں آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ حقیقتاً یہ اس اٹھارہ مہینے کے گزرنے کے بعد، جو آپ کی اس تحریک
ے بعد گزر چکے ہیں یعنی تحریکِ خلافت اور آزادیِ ہند کی تحریک پر گزر چکے ہیں، اگر ایک ایسی مجلس
ں جو میرے چاروں طرف فراہم ہے، اس امر کی ضرورت ہے کہ اس کے آگے ماتم اور فریاد کی
ئے، التجاؤں کا ہاتھ پھیلایا جائے، تمام حقائق و معارف کا دفتر کھولا جائے، تو میرے
زیزو! خاص کر وہ جو شہر آگرہ کے باشندے ہیں۔ بلکہ جو ہندستان کی گزشتہ تاریخ کے
رفن کے باشندے ہیں، اگر اب بھی ان کو ضرورت ہے خطبوں کی، تقریروں کی، تو وہ
ان تقریروں کے لیے میری گویائی کا انتظار نہ کریں۔

آیئے، ہم اور آپ چشمِ تصور سے کام لیں؛ اور چند منٹوں کے لیے اُس جمنا کے کنارے پہنچیں،
جس کو آج ہی میں نے علی گڈھ سے آتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے اُس جمنا میں اتنا پانی بھی نہ پایا۔

# ۳

# خطبۂ صدارت

## مجلسِ خلافت

آگرہ، ۲۵ اگست ۱۹۲۱ء

حضرات!

آپ کے صوبہ کی غالباً یہ تیسری مجلس خلافت ہے، جس کی صدارت کی خدمت کے لیے آپ نے ازراہِ لطف و نوازش مجھ کو منتخب فرمایا ہے۔ میں اس لطف و عنایت کے لیے آپ تمام بزرگوں اور عزیزوں کا تہِ دل سے شکرگذار ہوں۔ اور امید کرتا ہوں کہ اس خدمت کے انجام دینے میں آپ تمام عزیزوں کی مساعدت میری مدد کریگی اور اللہ تعالیٰ توفیق دیگا کہ اس کو بہتر امیدوں کے ساتھ ختم کروں۔

اس مجلس کا افتتاح کرتے ہوئے جن بیانات کی ضرورت تھی میں سمجھتا ہوں کہ وہ کئی مرتبہ بیان میں آچکے ہیں۔ بار بار ان کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ بار بار مجلسوں میں وہ پیش ہو چکے ہیں زبانوں پر بھی بار بار ان کا اعادہ ہو چکا ہے۔ قلم نے بھی بار بار ان کی تکرار کی ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ان مسائل کی نسبت اس وقت اور زیادہ تفصیل سے کام لینا بالکل غیر ضروری ہے۔ لیکن اگر اس امر کی ضرورت ہوتی کہ میں وقت کے مسئلوں کی نسبت، تحریکِ خلافت کی نسبت، آزادیٔ ہند کی نسبت آپ کی خدمت میں گزارشات کرنا ضروری محسوس کرتا، جب

تھا، اس میں ہم نے کونسی منزلیں طے کیں اور آگے کونسی منزلیں باقی ہیں!

اس بارے میں آپ کے صوبے کو علاوہ تاریخی خصوصیّت کے ایک اور خصوصیّت بھی حاصل ہے وہ یہ ہے کہ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا، تو آپ ہی کا یہ صوبہ ہے جس کی کانفرنس میں سب سے پہلے اس عملِ عظیم کا اعلان کیا گیا ہے جس کو آپ "نان کوآپریشن" کے نام سے سن چکے ہیں۔ میرٹھ میں جو خلافت کا جلسہ ہوا، اس میں مہاتما گاندھی جی بھی شریک تھے۔ اس میرٹھ کے جلسہ میں سب سے پہلے ترکِ موالات کا خلافت کمیٹی کی جانب سے بطور ایک عملِ دفاع کے، بطور ایک عمل احتجاج کے اعلان کیا گیا۔ آپ ہی کا صوبہ ہے جس میں سب سے پہلے ہم نے اس سفر کے کوچ کا اعلان کیا۔ اٹھارہ مہینے گزر چکے، اٹھارہ مہینے کی مایوسیاں، کامیابیاں یہ سب گذر چکیں۔ اب ہمارا اولین فرض یہ ہے کہ ہم اپنے سفر کو آگے بڑھاتے ہوئے ایک نظر ڈالیں کہ ہم نے اب تک کتنا سفر طے کیا ہے! عجب نہیں کہ ہمارے سفر کے متعلق بہت سی کمزوریاں، شکوک و شبہات جو ہم میں سے بعض کے دلوں کے لیے موجبِ خلش ہوا کرتے ہیں، دور ہو جائیں۔ عجب نہیں کہ نظر ڈالنے کے بعد خود بخود ان کا ازالہ ہو جائے۔

اس پر نظر ڈالتے ہوئے سب سے پہلے آپ کو یہ حقیقت اپنے سامنے لانی چاہیے کہ اس سفر سے آپ کا مقصد کیا تھا، اور سعی و قربانی کا جو میدان آپ کے سامنے پیش آیا تھا، کیا تھا! اس میں ایک بڑی عالمگیر غلطی ہے۔ یہ میں نے اس لیے کہا ہے کہ وہ محض چند قوموں سے تعلق نہیں رکھتی، بلکہ نوعِ انسان کی غلطی ہے۔ انسان جب کسی کام کے لیے قدم اٹھاتا ہے، تو وہ اُس میدان کو ڈھونڈتا ہے، جو اس کے وجود سے باہر ہو، اور جو سب سے پہلا میدان اس کے سامنے ہے، اس کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس لیے ہم کو چاہیے کہ ہم متعین کریں کہ مقصدِ خلافت کے لیے مدافعت کا جو میدان تھا، وہ کون سا تھا! کیا وہ میدان وہ تھا، جو ہندستان کے رقبے سے باہر ہے، یا اس کے علاوہ دوسرا میدان بھی تھا۔

اس بارے میں فی الحقیقت دو میدان تھے، جو آپ کو پیش آئے تھے۔ پہلا میدان، جو آپ کی

جتنا خون ان پانچ سالوں میں مسلمانوں کا بہہ چکا ہے۔ اگر آپ وہاں میری ہمراہی کرینگے، تو میں آپ کے لیے ایک بہترین آواز کی زبان کو، ایک بہترین دفترِ عبرت کو وہاں مہیا پاتا ہوں۔ وہاں زبان نہیں ہے، وہاں ایک مجسّم فصاحت موجود ہے، وہاں ایک مجسّم خطبہ موجود ہے۔ وہ جملہ عمارت موجود ہے جو ہندستان کی گزشتہ عظمت پر ماتم کر رہی ہے۔ وہاں شاہجہان کا مدفن اور آرامگاہ موجود ہے۔ اس سے بڑھ کر بھی کوئی زبان ہو سکتی ہے جو تمھارے کانوں کو مخاطب کر سکتی ہے؟ میں نہیں سمجھتا کہ اس آبادی میں، اس تہذیب کے مدفن میں، اس عالم کی قربانگاہ میں، میں کونسی چیز پیش کروں؟ اس زمین کے ایک ایک چپّے کی خاموشی میں آواز موجود ہے۔ اس کے ایک ایک ٹوٹے ہوئے کھنڈر میں، ان ٹوٹی ہوئی اینٹوں میں، جن کا غبار ہوا میں اڑ رہا ہے، نصیحت موجود ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اس موقع پر میرا فرض ایک خطیب کا فرض نہیں ہے، ایک مقرّر کا فرض نہیں ہے؛ البتہ میرا فرض ایک فریادی اور ماتمی کا فرض ہے، جو آپ کے آگے اس لیے نہیں آیا ہے کہ آپ کو کچھ سنائے بلکہ ماتم کرے، اور آپ سے امید کرے کہ اگر آپ کی زندگی کے چند لمحے، آپ کے معاملاتِ دنیا اجازت دیں، تو آپ بھی اس کے ماتم میں شریک ہوں۔

اٹھارہ مہینے کا زمانہ گزر چکا ہے کہ ہم نے اس سفر کا اعلان کیا تھا۔ اس اٹھارہ مہینے کے اندر تحریکِ خلافت کی کتنی منزلیں ہیں، جو ہمارے سامنے آئیں اور ہم طے کر چکے ہیں۔ میں اس وقت مسئلہ خلافت پر، مقاماتِ مقدسہ پر، ہندستان کی آزادی پر، جو مسلمانوں کے لیے ویسا ہی فرضِ شرعی ہے جیسے تحفّظ و دفاعِ خلافت، میں مناسب نہیں سمجھتا کہ ان مسائل پر کچھ عرض کروں۔ اس کے لیے آپ کے پاس خاموش گویائی موجود ہے، جو آپ کے دلوں کو متنبہ کر سکتی ہے۔

اس وقت اس جلسے کا افتتاح کرتے ہوئے سب سے پہلے جو چیز ہمارے سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ آپ احتساب کی نظر ڈالیں اور اندازہ کریں کہ اس اٹھارہ مہینے کے اندر جو سفر پیش آیا

اس کے بعد دوسری منزل ہے جو اس تحریک کو پیش آئی۔ اس تحریک کی فتحمندی کے لیے اس امر کی ضرورت تھی کہ یہ تحریک کسی خاص جماعت کی تحریک نہ ہو، بلکہ یہ اس ملک کے لیے ملکی تحریک بن جائے۔ یہ دوسری منزل تھی، جو تحریکِ خلافت کو پیش آئی۔ ضرورت تھی کہ یہ سات کروڑ دلوں کو گھر نہ بنائے، بلکہ بتیس کروڑ کے دلوں میں اپنا گھر بناتی۔ یہ ہندو بھائی ہمارے کندھے سے کندھا جوڑ کر کھڑے ہو جاتے اور ان کی ہمدردی بھی اس تحریک میں شامل ہو جاتی۔ اس لیے نہیں کہ فی الحقیقت مسلمانوں کے مطالبات کی کامیابی اس چیز پر موقوف تھی کہ ہم اپنے بھائیوں کو اس مدد کی زحمت دیتے۔ ہم میں سے ہر شخص جس کے دل میں ایمان موجود ہے، اس کو یقین ہونا چاہیے کہ اس دنیا میں کسی مقصد کی کامیابی محض انسانوں کی تعداد پر موقوف نہیں ہے، بلکہ ہر تحریک کی کامیابی، ایمان اور عمل کی طاقت پر موقوف ہے۔

اس سے پہلے بار بار میں اعلان کر چکا ہوں اور آج بھی اعلان کرتا ہوں کہ درحقیقت اس مقصد کی کامیابی کے لیے ہندستان کے کسی رقبے میں سے، کسی ایک بھائی کو بھی، اس امر کی زحمت دینے کے لیے ہم مجبور نہ تھے کہ وہ ہم کو مدد دیتا۔ اگر مسلمان کامیابی حاصل کر سکتے تھے تو اللہ پر اعتماد کر کے، اللہ کی نصرت پر، اپنے ایمان پر اعتماد کر کے لیکن بلاشبہ جب کہ مسئلے کی صورت کا یہ حال تھا تو اس کے ساتھ ہی اس امر کی ضرورت تھی کہ تحریکِ خلافت کے ضمن میں خود ہندستان کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا تھا جس وقت تک ملک میں کوئی عام تحریک پیدا نہ ہوتی؛ اور فی الحقیقت تحریکِ خلافت کی کامیابی میں ایک خوبی یہ ہے کہ اس نے ایسے طاقتور ہنگامے کے ساتھ کل ہندستان کے مسئلے کو زندہ کر دیا، جو چالیس سال کی کوشش سے ہندستان کو نہ ملا تھا۔

اس کامیابی کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ہندستان میں صرف تحریکِ خلافت ہی موجود نہیں ہے، بلکہ ہندستان کا مسئلہ بھی پوری طاقت کے ساتھ زندہ ہو گیا ہے۔ اس مسئلے کی کامیابی

کامیابی کے لیے اوّلین قیامگاہ تھا، وہ میدان ہندستان سے باہر کا میدان نہ تھا۔ وہ عراق و شام کا، ایشیاے کوچک اور سمرنا کا میدان نہ تھا، جہاں مسلمانوں کا خون بہہ چکا تھا۔ وہ میدان آپ کے ایمان کا، عزم کا، عمل کا میدان تھا۔ اور ان تمام لفظوں کی جگہ ایک لفظ بول دوں: وہ میدان آپ کے ملک کا تھا اور آپ کے ملک کی فتح و شکست کا تھا۔ جب تک آپ اسے فتح نہ کرتے، دنیا کی کامیابی آپ کا استقبال نہ کرسکتی۔ آپ کی کامیابی اس پر موقوف تھی کہ سب سے پہلے آپ اپنے پہلے میدان کو استوار کرتے۔ اپنے پہلے میدان کا ہتھیار اور ساز و سامان سنوارا ہوتا۔ جب تک اسے فتح نہ کرتے، دوسرے میدان میں قدم نہ رکھ سکتے۔

تحریکِ خلافت کے لیے سب سے پہلے خود ہندستان کا میدان تھا، خود مسلمانوں کا میدان تھا، ہندستان میں بسنے والی قوموں کا میدان تھا۔ سب سے پہلی منزل جو آپ کو پیش آئی، وہ تھی جس میں آپ کی تحریک محض اپنی زندگی کی ابتدائی گھڑیاں کاٹ رہی تھی جس وقت بیچارگی کا یہ حال تھا کہ ہزاروں زبانیں موجود تھیں، جن پر خلافت کا نعرہ تھا، لیکن کوئی متفقہ میدانِ عمل آپ کے سامنے نہ تھا۔ مجالس کے مقصد سے یہ معاملہ آگے نہیں گزرا تھا۔ وہ ابتدائی گھڑیاں آج تحریکِ خلافت پر گزر چکی ہیں، جب یہ معاملہ محض دلوں میں تھا۔ اس سے زیادہ اور کوئی قوت اس کو حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ ہم کو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم و توفیق فرمائی کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ باوجود ہماری درماندگی کے، ہمارے ترکِ عمل کے، عدمِ استحقاق کے، اللہ کے فضل و رحمت نے اپنا دروازہ کھول دیا اور ہم کو کامیابی عطا کی۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ چند مہینوں کے اندر ہم نے یہ پہلا میدان فتح کرلیا۔ جب دنیا کی آنکھ کھلی، تو اس نے محسوس کیا کہ یہ کسی محدود جماعت کی تحریک نہیں ہے، بلکہ ہندستان کا متفقہ مسئلہ ہے۔ یہ پہلا میدان تھا، جو تحریک کو پیش آیا اور اس کو کامیابی کے ساتھ اس تحریک نے فتح کرلیا۔

نجات کے لیے ایک ضروری مسئلہ رہا ہے، لیکن یہ مسئلہ آج تحریکِ خلافت کی بدولت ہی ہمارے سامنے نہیں آیا ہے۔ ہندستان میں ایسے لوگ موجود تھے جنھوں نے تحریکِ خلافت کی بنا پر نہیں، بلکہ چونکہ انھوں نے اپنی ہدایت کے لیے، اپنی ہر فکر اور ہر کام کے لیے صرف ایک ہی راستہ ہدایت کا اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا، اس لیے کہ اسلام کے اصولوں نے اسلام کی تعلیم نے ان کو مجبور کیا تھا کہ اس کا ہندستان میں اعلان کریں۔

تحریکِ خلافت سے تقریباً دس سال پہلے میں نے اس حقیقت کو محسوس کیا کہ اگر ہندستان کے مسلمان اپنے بہترین شرعی اور اسلامی فرائض انجام دینا چاہتے ہیں، تو بحیثیت ہندستانی ہونے کے انھیں انجام دینا چاہیے۔ یہ بھی ایک سچی حیثیت ہے، مگر سب سے پہلی حیثیت یہ ہے کہ بحیثیت مسلمان ہونے کے مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ ہو جائیں میں اپنے سینے میں وہ دل رکھتا ہوں جس کے لیے ہدایت کی کوئی شعاعیں نہیں ہو سکتیں جو فاطر السمٰوات نے نہ بھیجی ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہندستان میں ہندستان کے مسلمان اپنے بہترین فرائض انجام نہیں دے سکتے، جب تک وہ احکامِ اسلامیہ کے ماتحت ہندستان کے ہندوؤں سے پوری سچائی کے ساتھ اتحاد و اتفاق نہ کرلیں۔ یہ اعتقاد قرآن مجید کی نصِ قطعی پر مبنی تھا۔ فی الحقیقت یہ وہ چیز ہے، جو اگر ایک طرف ترکِ موالات کے اصول کو ہمارے سامنے نمایاں کرتی ہے، تو دوسری طرف ہندو مسلمانوں کے مسئلہ کو واضح کرتی ہے۔

ترکِ موالات کے ضمن میں قرآن مجید کے احکام کیا ہیں؟ موالات، ولایت سے ہے۔ ولایت کے معنی ہیں محبت اور اعانت اور نصرت کے۔ تو ترکِ موالات کے معنی ہوئے مددگاری کے ہر طرح کے تعلقات کو منقطع کر لینا، جب تک وہ جماعت اپنے ظلم سے باز نہ آئے۔ قرآن مجید نے دنیا کی تمام غیر مسلم قوموں کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔ یہ تقسیم سورۂ ممتحنہ میں موجود ہے۔ قرآن مجید نے بتایا ہے کہ دو قسم کی قومیں دنیا میں پیش ہو سکتی ہیں: ایک تو وہ غیر مسلمان قومیں جو مسلمانوں پر حملہ نہیں کرتیں، مسلمانوں کی حکومت اور خلافت پر حملہ نہیں

کے لیے اس امر کی ضرورت تھی کہ یہ تحریک صرف سات کروڑ کی تحریک نہ ہوتی بلکہ اس کے ضمن میں عام ہندستان کی سوئی ہوئی قسمت جاگ اٹھتی اور عام مسئلہ پیدا ہو جاتا۔ اگر آپ کے دل مایوسی میں ڈوبے ہوئے ہیں تو میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ امید دلاؤں کہ یہ مسئلہ خلافت کی دوسری منزل ہے، جس میں آپ نے کامیابی حاصل کی ہے۔

میں اس منظر رفاقت کو ایک منٹ کے لیے فراموش نہیں کر سکتا کہ جوں ہی مسئلہ خلافت ہندستان میں چھیڑا گیا، ہندستان کے تمام گوشوں سے ہمارے ہندو بھائیوں نے کامل صداقت کے ساتھ تحریکِ خلافت کا استقبال کیا اور اپنی تمام تر ہمدردیاں اس کے لیے وقف کر دیں۔

لیکن جہاں تک اس کا تعلق ایک ملکی مسئلے سے ہے، وہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ اس مسئلہ کے محرک چند رفقا تھے۔ میں نام لونگا مہاتما گاندھی جی کا کہ وہ اس تحریک کے اولین اور سب سے بڑے قابلِ عزت رفیق تھے کہ جنھوں نے اس تحریک کا ساتھ دیا۔ اس وقت تک اس مسئلے نے تمام ہندستان کے قومی مسئلے کی صورت اختیار نہیں کی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ سامان کر دیا کہ تحریکِ خلافت کی روشنی نے ہندستان کے چراغ کو روشن کر دیا۔ یہ مسئلہ خلافت کی تیسری فتحمندی تھی۔ جو اس کو ہندستان کے میدان میں حاصل ہوئی۔

ہندستان کے لیئے ہندستان کی آزادی کے لیئے صداقت وحق پرستی کے بہترین اور اعلیٰ فرض ادا کرنے کے لیئے ہندستان کے ہندو مسلمانوں کا اتفاق اور ان کی یکجہتی ضروری ہے میرا قصد نہ تھا کہ مستقل طور پر اس مسئلے کے متعلق کچھ کہوں، کیونکہ الحمدللہ یہ مسئلہ عمل تک پہنچ چکا ہے۔ اب اس امر کی ضرورت نہیں ہے کہ اس پر بحث کی جائے۔ لیکن چونکہ تحریک خلافت کی تیسری منزل کے ضمن میں یہ مسئلہ چھڑ گیا ہے، لہذا آپ اجازت دینگے کہ میں کچھ اس کے متعلق کہہ دوں۔

ہندو مسلمانوں کے اتحاد کا مسئلہ اگرچہ اپنے سیاسی مسئلہ ہونے کے لحاظ سے ہندستان کی

دیتے؛ میں نے غیر محارب اور محارب پر زور دیا ہے۔ برٹش گورنمنٹ، اسلام اور مسلمانوں کے مقابلے میں از روے شریعت فریقِ محارب ہو گئی ہے۔ اس لیے بموجب اسی نصِ قطعی اور بموجب گیارہ سے زیادہ آیتوں اور اسلام کے قانون کے مسلمانوں کے لیے حرام اور ناجائز ہو گیا، فسق ہو گیا اور نفاق ہو گیا؛ مسلمانوں کے لیے یہ قریب قریب کفر ہو گیا کہ وہ برٹش گورنمنٹ سے اپنی استطاعت کے اندر محبت و اعانت، وفاداری اور اطاعت کا کوئی تعلق رکھیں؛ اگر وہ کوئی تعلق اس طرح کا رکھینگے، تو ایک منٹ کے لیے ان کو یہ حق نہ ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کی صف میں جگہ دیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ جو مسلمان ایسے وقتوں میں، ایسی حالتوں میں اس محارب قوم کے ساتھ اور اس کے شرکار کے ساتھ رشتۂ موالات رکھتا ہے اگرچہ وہ زمین میں اپنے آپ کو مسلمان کہے، لیکن اللہ کے نزدیک اس کا شمار مومنوں میں نہ ہوگا، کفّار میں ہوگا۔

آج بھی میں یہی اعلان کرتا ہوں، اس لیے کہ صلح کی خبریں اڑ رہی ہیں۔ ہر مسلمان کے قلب پر یہ حقیقت نقش ہے اور ہونا چاہیے کہ جب تک انگریزی حکومت اپنے اس ابلیسانہ گھمنڈ سے باز نہ آجائے، مسلمانوں کے مطالباتِ شرعی کو پورا نہ کردے، عراق کی سرزمین اس کی مداخلت سے پاک نہ ہو جائے، ایشیائے کوچک میں اس کی کوئی طاقت مخالفت نہ کرے، قسطنطنیہ سے تمام شرائط اور پابندیاں اٹھالی نہ جائیں، ہندستان کو آزادی نہ دی جائے، اس وقت تک انگریزی گورنمنٹ مسلمانوں کے مقابلے میں فریقِ محارب ہے۔ اگر مسلمانوں کے دل میں ایک آخری چنگاری بھی ایمان کی باقی ہے، تو کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ صلح یا صفائی کا ہاتھ انگریزوں کی طرف بڑھا سکے۔ وہ مسلمان اپنے ان آباد شہروں کو چھوڑ دے، جنگلوں میں چلا جائے؛ وہاں سانپ اور بچھوؤں کے ساتھ صلح کرے مگر انگریزی گورنمنٹ کے ساتھ صلح نہیں کر سکتا۔

لیکن ہاں، جس آن اور جس لمحہ حالات میں تبدیلی ہو جائے، حالات پلٹ جائیں، جو فریق محارب ہے، وہ فریقِ محارب نہ رہے، بلکہ اس حکم میں آجائے جس کو تم سن چکے ہو یعنی جن

کرتیں۔ ایسی غیر مسلم قومیں جنھوں نے نہ تو حملہ کیا ہے اور نہ مسلمانوں کی آبادیوں اور بستیوں پر حملہ کرنا چاہتی ہیں، ایسی قوموں کے لیے قرآن ایک لمحہ کے لیے بھی مسلمانوں کو نہیں روکتا کہ ان کے ساتھ مصالحت کریں اور بہتر سے بہتر اور اچھے سے اچھا سلوک کریں۔ لیکن جن غیر مسلمان قوموں کا یہ حال ہے کہ وہ مسلمان قوموں کے ساتھ قتال کریں، مسلمانوں کو ان کی بستیوں سے نکالیں، ایسی غیر مسلمان قوموں کی نسبت بلا شبہہ قرآن مجید کی تعلیم یہ ہے کہ ان کے ساتھ تعلقات منقطع کر لیے جائیں۔ اور قرآن مجید کا یہ قانون کامل انصاف اور عدالت پر مبنی ہے، جس کو خود خدا کی فطرت نے قائم کیا ہے۔ اس عالمگیر اور ہمہ گیر عدالت کی بنا پر قرآن مجید کا یہ اعلان ہے کہ ایسی غیر مسلمان قوموں کے ساتھ مسلمان کوئی ایسا تعلق نہ رکھیں، جو محبّت، دوستی، صلح و وفاداری اور کسی طرح کی اعانت و نصرت کا ہو۔ یہ حکم قطعی متعدد آیاتِ قرآنی میں موجود ہے۔ سورۂ ممتحنہ میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، اس کا ترجمہ یہ ہے کہ "اللہ تعالیٰ اس بات سے نہیں روکتا کہ جن نامسلمانوں نے تم سے نہ لڑائی لڑی ہے، نہ قتال کیا ہے، نہ مسلمانوں کو ان کی آبادیوں سے نکالا ہے، اگر مسلمان ایسے نامسلمانوں کے ساتھ اتحاد کریں۔ ہر طرح کی نیکی کا بہتر سے بہتر سلوک جو وہ کر سکتے ہیں کریں"۔ ایک منٹ کے لیے قرآن انھیں اس سے نہیں روکتا۔

قرآن دنیا میں دشمنی کا پیام نہیں لایا ہے؛ وہ تو محبّت کا پیام لایا ہے۔ اس لیے محبّت کے قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ٹھیک اسی قانون کے مطابق جس کی رُو سے عدالت مجرم کو پھانسی کے تختہ پر کھڑا کرتی ہے، مسلمان بھی ایسی غیر مسلمان قوموں کے ساتھ کوئی تعلق محبّت، اعانت اور نصرت کا نہیں رکھ سکتا، جو ان کی دشمن ہوں ـــــ اس تقسیم کی رُو سے جہاں آپ کے سامنے ترکِ موالات کا مسئلہ واضح طور پر آ گیا۔

گزشتہ پانچ سال کے اندر دنیا میں وہ واقعات ظہور پذیر ہوئے ہیں، جن کے بعد برٹش گورنمنٹ مسلمانوں کے مقابلہ میں "فریقِ محارب" ہو گئی ہے، یعنی لڑنے والی فریق ہے۔ میں نے "فریقِ محارب" پر زور دیا ہے۔ بہت سے لوگ یہاں محارب اور غیر محارب پر زور نہیں

غرور سے اللہ کی عالمگیر صداقت کو سب سے بڑا خطرہ ہے، وہ برٹش گورنمنٹ کے سوا کوئی دوسری طاقت نہیں ہے۔ اس لیے ہندستان کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ احکامِ شرع کو سامنے رکھ کر، حضور پیغمبرِ اسلام صلّی اللہ علیہ وسلم کے اُس اسوۂ حسنہ کو پیشِ نظر رکھ کر، جو انھوں نے اہلِ مدینہ اور بت پرست لوگوں سے مصالحت کرتے ہوئے دکھایا، وہ نمونہ جو خود جناب سرورِ کائنات نے عملاً پیش کیا ہے اور عملاً وحکماً جو تعلیم قرآن نے دی ہے، ہندستان کے مسلمانوں کا یہ فرضِ شرعی ہے کہ وہ ہندستان کے ہندوؤں سے کامل سچائی کے ساتھ عہد و محبت کا پیمان باندھ لیں اور ان کے ساتھ مل کر ایک نیشن ہو جائیں۔ میرے الفاظ یہ تھے کہ ہندستان کے سات کروڑ مسلمان، ہندستان کے بائیس کروڑ ہندو بھائیوں کے ساتھ مل کر ایسے ہو جائیں کہ دونوں مل کر ہندستان کی ایک قوم اور نیشن بن جائیں۔ اب میں مسلمان بھائیوں کو سنانا چاہتا ہوں کہ خدا کی آواز کے بعد سب سے بڑی آواز جو ہو سکتی ہے، وہ محمد (صلّی اللہ علیہ وسلم) کی آواز تھی، اس وجودِ مقدس نے عہد نامہ لکھا بجنسہٖ یہ اس کے الفاظ ہیں اِنّہٗ اُمّۃٌ واحدۃٌ[۳]۔ ہم ان تمام قبیلوں سے جو مدینہ کے اطراف میں بستے ہیں، صلح کرتے ہیں، اتفاق کرتے ہیں اور ہم سب مل کر ایک اُمّۃٌ واحدۃٌ بننا چاہتے ہیں۔ اُمّۃ کے معنی ہیں قوم اور نیشن، اور واحدہ کے معنی ہیں ایک۔

اگر میں نے اپنی اپیل میں کہہ دیا کہ ہندستان کے مسلمان اپنا بہترین فرض اسی وقت انجام دینگے جب وہ ہندوؤں کے ساتھ ایک ہو جائینگے۔ تو یہی وہ لفظ ہے، جو اللہ کے رسول نے بھی اس وقت لکھوایا تھا کہ ہم سب مل کر قریش کے مقابلے میں ایک نیشن ہو جائینگے۔ جن مقاصد کی بنا پر جناب سرورِ کائنات نے یہ عہد کیا تھا، اس سے زیادہ وجوہ آج آپ کے لیے موجود ہیں۔ اگر اس وقت صرف قریشِ مکہ کی ایک جماعت تھی، جو اسلام کو عرب میں دھمکی دے رہی تھی، تو آج اس عربِ ثانیہ میں صرف مٹھی بھر قریش نہیں، بلکہ کرۂ ارضی کی دو تہائی بسنے والی قومیں اسلام کو مٹانا چاہتی ہیں۔ اگر رسولِ خدا مٹھی بھر قریشِ مکہ کے مقابلے میں ابوسفیان کے

لوگوں نے مسلمانوں سے قتال نہیں کیا ہے، ان کی آبادیوں پر قبضہ نہیں کیا ہے، ان کو دیس نکالا نہیں دیا ہے، اور یہی نہیں کہ خود ظلم نہ کیا ہو، بلکہ دوسروں کو بھی ظلم پر نہ اُبھارا ہو۔ جس آن برٹش گورنمنٹ میں یہ حقیقی تبدیلی ہو جائیگی، حقیقی تبدیلی دھوکے کی نہیں، جس میں چالیس سال سے ہندستان الجھا ہوا ہے، بمجرد حالات کی تبدیلی کے حکم بدل جائیگا۔ اور مسلمانوں میں سے ہر فرد تیار ہوگا کہ صلح و اتفاق کا ہاتھ بڑھائے۔ لیکن جب تک برٹش گورنمنٹ فریق محارب ہے، وہ خلافت کے مطالبات پورے نہیں کرتی، جب تک ہندستان کو سچے اور حقیقی معنوں میں سوراج نہیں دیتی، یعنی کوئی نئی اور کسی قدر ترقی یافتہ ریفارم کی اسکیم نہیں بلکہ سوراج جس وقت تک انگریزی گورنمنٹ ان تمام امور کو پورا نہیں کرتی، اس وقت تک مسلمانوں کے لیے اس کا وجود، اس کے گورنروں کا وجود، اس کی عدالتوں کا وجود، ظلم و ستم کی کارروائیاں ہیں۔ ان کا وجود لڑنے والوں کا وجود ہے۔ مسلمان کے لیے ممکن ہے کہ بچھوؤں کو ہتیلی پر لے کر دودھ پلائے، مگر یہ ممکن نہیں ہے کہ انگریزوں کے ساتھ صلح کرلے۔

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، یہ ایک ضمنی حقیقت تھی۔ اصل مسئلہ جس پر میں گام فرسائی کر رہا تھا، یہ تھا کہ ہندستان کی نجات کے لیے، ہندستان میں مسلمانوں کے بہترین فرائض کے انجام دینے کے لئے ہندو مسلم اتحاد ضروری ہے۔ یہ میرا عقیدہ ہے جس کا اعلان میں ۱۹۱۲ء میں الہلال کے پہلے ہی نمبر میں کر چکا ہوں۔ میں امید کرتا ہوں کہ ایسے لوگ موجود ہونگے، جنھوں نے الہلال کو فراموش نہ کیا ہوگا۔

الہلال کے پہلے نمبر میں جس بڑے نمایاں مقصد کا اعلان کیا گیا تھا، کیا تھا؟ میں فخر کے ساتھ اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ہندو مسلمانوں کا اتفاق تھا۔ میں نے مسلمانوں کو دعوت دی تھی کہ احکام شرع کی رُو سے مسلمانوں کے لیے اگر کوئی فریق ہو سکتا ہے جو نہ صرف ایشیا کو مشرق کو، بلکہ اس تمام کرۂ ارضی کی سچائی کو آج چیلنج دے رہا ہے، اس کو مٹا رہا ہے، جس کے

تمام دنیا میں جتنی قومیں موجود ہیں، ان سے جزیہ نہیں لیا جاسکتا۔ مگر جمہور اس طرف گئے ہیں کہ یہ حکم صرف جزیرۃ العرب کے لیے ہے اور دنیا کی اور تمام قوموں کے ساتھ مسلمان صلح کرسکتے ہیں، اگر وہ اس کے مستحق ہیں۔ جن مفسّرین نے محض لفظِ نسخ دیکھ کر اس کو منسوخات میں شمار کیا ہے۔ اگر اس کے وہ معنی پیش کرلیے جائینگے، تو نتیجہ یہ نکلیگا کہ پانچسو سے زیادہ آیات ہیں، جو آیۂ منسوخہ سے منسوخ کی گئیں۔ مقصد یہ تھا کہ ایک لمحہ کے لیے یہ سمجھنا کہ یہ حکم آیندہ کے لیے منسوخ ہوچکا ہے، یہ ایسا کلمہ ہے کہ اس سے بڑھ کر احکامِ شرع کے جہل کا اور کوئی کلمہ نہیں ہوسکتا۔ یہ وہ حقیقتِ شرعی ہے، جس نے یہ حقیقت ہمارے آگے بے نقاب کی تھی۔ اگر اس میں ایک طرف اسلام کے فریقِ محارب کے مقابلے میں ترکِ موالات بتایا گیا، تو دوسری طرف یہ حقیقت کھول دی کہ جن قوموں نے مسلمانوں پر حملہ نہیں کیا ہے، پیکار نہیں کیا ہے، ان کی آبادیوں پر قبضہ نہیں کیا ہے، ان کے لیے اللہ کی وہ شریعت جو دنیا میں ایک عالمگیر برادری کا اور محبت کا سبق دے اور اس تمام کرۂ ارضی کو خدا کی محبّت کا ایک گھرانہ بنانے کے لیے آئی ہے، محالِ قطعی ہے کہ وہ ایک منٹ کے لیے حکم دے کہ مسلمان دنیا کی کسی قوم کے ساتھ محبّت اور عہدِ اتفاق نہ کریں۔

یہ جزیرۃ العرب کے لیے تھا۔ وہاں کے متعلق خدا کی مصلحتیں تھیں کہ اس ٹکڑے کو مسلمانوں کا مرکز بنانے کے لیے خاص کردیا جائے۔ اور وہ مسلمانوں کے لیے ایسا گھر ہو کہ اگر دنیا کے تمام حصوں میں ان کی جڑ ٹوٹ جائے تو یہ جڑ باقی رہے کہ ہمیشہ ابھر سکے۔ اس لیے ضرورت تھی کہ جزیرۃ العرب کو مسلمانوں کے لیے خاص کردیا جاتا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ آیت تمام دنیا کے لیے اور دنیا کی تمام قوموں کے لیے منسوخ ہوچکی ہے۔

بہرحال ہندو مسلمانوں کے اتفاق کے سلسلے میں آپ کے سامنے میں یہ حقیقت لانا چاہتا تھا کہ اگر مسلمانوں نے محبّت کا ہاتھ، یکجہتی کا ہاتھ، رفاقت کا ہاتھ، اپنے ہمسایوں کی طرف بڑھایا ہے، تو ان کا یہ عمل محض کوئی وقتی اور دفاعی نہیں ہے، پولٹیکل چال نہیں ہے، بلکہ ان کو یقین کرنا چاہیے

مقابلے میں، اطرافِ مدینہ کے تمام قبائل سے اتفاق کر سکتے تھے، تو آج اس عظیم الشّان قوت کے غرور، گھمنڈ، خونخواری کے مقابلے میں جو تمام مشرق کی آزادی کو پامال کرنا چاہتی ہے، کیا ہندستان کے مسلمانوں کا یہ فرض نہیں ہے کہ اپنے بائیس کروڑ ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایک ہو جائیں۔

میں یہ سب کچھ کہنے پر مجبور ہوں، کیونکہ یہ ایک نہایت ضروری پہلو ہے اور میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں، اگر ایک دو منٹ ان بحثوں کے الجھاؤ میں صرف ہو جائیں۔ میں اس موقع پر اس جلسہ میں، جس میں خوش قسمتی سے صاحبِ علم بھی تشریف فرما ہیں اور جن کی موجودگی میرے لیے موجبِ تقویت ہے، میں ان اہلِ علم کو توجہ دلاؤنگا کہ اگر کسی بزرگ کے دل میں یہ خدشہ پیدا ہو جائے کہ سورۂ ممتحنہ کی تقسیم منسوخ ہے، ان کے دل میں یہ شبہہ پیدا ہو جائے کہ یہ آیت منجملہ اُن آیات کے شمار کی جاتی ہے، جن کو آیتِ سیف نے منسوخ کر دیا؛ ممکن ہے، اُن کے دل میں یہ خلش پیدا ہو کہ یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے، تو پھر اس سے استدلال کیونکر درست ہو سکتا ہے۔ میں بلا اس طرف اشارہ کیے ہوئے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ معاملہ نازک ہے؛ ضرورت ہے چشمِ بصیرت کی، محض اوراق گردانی کافی نہ ہوگی۔ میں سب سے پہلے ان کو یاد دلاؤنگا کہ ایک نسخ اصولیوں کا ہے اور ایک نسخ قدما کا ہے۔ اصولیوں نے جو محدود تعریف کر دی ہے نسخ کی، وہ نسخ کے اسلاف ان صورتوں میں نہیں کرتے۔ ہر وہ حکم جس کا صرفِ تعلق اور عموم پر کوئی اثر پڑے، قدما اور مختلف صدرِ اوّل کی اصطلاح میں استدلال نسخ کہا جاتا تھا۔

بلاشبہہ اس آیت کا حکم منسوخ ہوا، مگر کن معنوں میں ہوا؟ یہ حکم منسوخ ہو گیا، صرف جزیرۃ العرب کے لیے، مشرکینِ عرب کے لیے یہ ان احکام کے لیے نہیں جو تمام دنیا کی مشرک اقوام کے لیے ہیں۔ بلکہ یہ ان مخصوص احکام میں سے ہے جو مخصوص ہو گیا ہے عرب کے لیے۔ امام شافعی اس طرف گئے کہ جزیرۃ العرب کے علاوہ اور

فروری ۱۹۲۰ء میں ہوا تھا، اور میں ہی اس کا صدر تھا۔ سب سے پہلے اس کی تحریک وہاں کے خطبۂ صدارت میں کی گئی تھی۔ اس کے بعد دہلی میں دوسری مرتبہ سربرآوردہ ہندو مسلمانوں کا اجتماع ہوا کہ کیا اس مسئلے کو بحیثیت قوم کے ہم اختیار کر سکتے ہیں! اس سب کمیٹی میں بھی جس میں مہاتما گاندھی، حکیم اجمل خان اور میں تھا، یہ طے پایا تھا کمیٹی سے میں نے کہا کہ بحث کی ضرورت ہے، نہ کچھ اور۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ یہ چیز جو ہمارے سامنے آرہی ہے، تیرہ سو سال سے موجود ہے۔ میں نے کہا کہ آپ اپنی رپورٹ تیار کیجیے۔ اس کے بعد میرٹھ میں اس صوبہ کا پہلا جلسہ ہوا، اور اس میں مہاتما گاندھی نے اس تحریک کے مختلف اجزا کو پیش کیا۔ اور جو لوگ وہاں موجود تھے، وہ تصدیق کرینگے کہ وہاں بھی میں نے اعلان کیا تھا کہ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ یہ پہلی اپیل ہے، بلکہ فی الحقیقت یہ تیرہ سو برس سے مسلمانوں کے یہاں موجود ہے، اور بحیثیت مسلمان ہونے کے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس پر عمل پیرا ہوں۔ اس وقت اس مسئلے کے عمل میں اگرچہ خلافت کمیٹی کے تمام ارکین شریک تھے، مسلمانوں کے علمار کی جماعت شریک تھی۔ لیکن یہ واقعہ آپ کو یاد ہوگا کہ یہ مسئلہ چونکہ نہایت پیچیدہ شکل میں ملک کے سامنے آیا تھا، اس لیے ہندستان کی سب سے بڑی جماعت یعنی انڈین نیشنل کانگریس نے اس میں شرکت نہیں کی تھی۔ یہ آخری میدان تھا، جس میں ہمیں فتح حاصل کرنا تھی۔ میں آپ کو یاد دلاؤنگا، اللہ تعالیٰ کے اس کرم کو کہ یہ تیسری منزل بھی سامنے آئی اور تحریکِ خلافت نے نہایت کامیابی سے اسے فتح کیا۔ ایک معرکہ وہ تھا، جو کلکتہ میں گرم ہوا، دوسرا وہ تھا، جو ناگپور میں گرم ہوا۔ اس دوسرے معرکے میں بیس بیس ہزار ہندستان کے ہندو مسلمانوں نے متفقہ آواز میں، جس میں ایک آواز بھی خلاف نہ تھی، ترکِ موالات کے ساتھ اتفاق کیا۔ اور یہ تیسری فتمندی مسئلہ خلافت کو ہندستان کے میدان میں حاصل ہوئی۔

اب یہ تیسرا میدان جسے آپ ڈھونڈھ رہے تھے، وہ بھی اسی ہندستان کے اندر موجود تھا۔ جب تک آپکے اندر خود آپ کی قومی قوت واپس نہ آجاتی، جب تک آپ خود اپنے

کہ مسلمانوں نے محبت کا آغوش خود نہیں کھولا ہے، بلکہ ان کے خدا نے، ان کے قوانینِ شریعت نے کھلوایا ہے، چونکہ اس کی بنیاد شریعت پر ہے۔ اس لیے عزیزانِ من، یہ سب کچھ آج ترکِ موالات کے سلسلے میں نہیں، بلکہ بیس سال پیشتر بھی میرا یہی اعتقاد تھا۔

دوستو! میں اپنی زندگی کا اگر کوئی کام سمجھتا ہوں، تو وہ یہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں ہندستان کے ان انسانوں میں ہوں، جن کو خدا نے کتاب اللہ کی طرف بلایا ہے۔ میں اپنے لیے کوئی خدمت سمجھتا ہوں، تو وہ صرف یہی ہے کہ کتاب اللہ کی طرف لوگوں کو بلاؤں۔ مسلمان اپنے ہندو بھائیوں سے تمام کاموں میں الگ تھلگ تھے۔ علی گڑھ کی پالیسی، مسلّمہ قومی پالیسی سمجھی جاتی تھی کہ وہ ہندوؤں سے علیحدہ رہیں۔ میں نے دعوت دی کہ اگر مسلمان ہندستان کی زندگی میں بحیثیت مسلمان ہونے کے اپنے عظیم الشان فرائض انجام دینا چاہتے ہیں، تو ان کا فرض ہونا چاہیے کہ اتفاق کا قدم بڑھائیں، اور بائیس کروڑ ہندوؤں کے ساتھ ایک ہو جائیں۔ مسلمانوں کے لیے ایسا کرنا ان کے مذہبی عمل میں سے تھا۔

بہرحال موضوعِ بحث یہ تھا کہ تحریکِ خلافت نے اندرونی میدان میں دوسری صورت سے جو فتحیابی حاصل کی ہے، وہ یہ ہے کہ تحریکِ خلافت کی بدولت ہندستان کی آزادی کا سویا ہوا مسئلہ اس قوت سے جاگ اٹھا کہ آج اس کا غلغلہ دنیا میں بلند ہے۔

اب تیسری منزل کونسی ہے اس میدان کی؟ وہ تیسری منزل فی الحقیقت نہایت فیصلہ کن منزل ہے۔ تحریکِ خلافت نے ہندستان کی آزادی کے مسئلے کو، پنجاب کے مسئلے کو جس طرح زندہ کر دیا تھا، ضروری تھا کہ اس کے لیے کوئی مذہبی شاہراہِ عمل ہوتی اور آپ کے سامنے کھولی جاتی۔ خلافت کمیٹی نے احکامِ شرع کے ماتحت فیصلہ کیا کہ ترکِ موالات مسلمانوں کے فرائض میں سے ہے۔ بدبختی سے جہاں مسلمانوں نے اپنے تمام مسائل کو ترک کر دیا ہے، یہ مسئلہ بھی فراموش کر دیا تھا۔ اس لیے ضرورت تھی کہ اس مسئلے کو زندہ کیا جائے۔ خلافت کمیٹی نے یہی کیا۔ سب سے پہلے ترکِ موالات کا اعلان کلکتہ کے اس جلسۂ خلافت میں ہوا، جو ۲۸، ۲۹

کامیابی آپ کے لیے سود مند نہیں ہو سکتی۔ ایک موجب امید کا ہے۔ اس کی روشنی میں آپ نے گزشتہ حالات پر نظر ڈالی۔ تم نے دیکھا کہ بلا شبہہ تحریکِ خلافت کی کامیابی کی بیل منڈھے چڑھی۔ ایک دوسرا موجب بھی ہے: وہ ناامیدی اور خوف کا ہے۔ ایمان دو پروں سے اڑتا ہے؛ ایک امید کا، دوسرا خوف کا۔ یہ ہماری بڑی ناکامی ہوگی کہ گزشتہ کامیابیوں کا تصوّر کرتے ہوئے آنے والی کامیابیوں کو بھول جائیں۔ بیشک تحریکِ خلافت نے یہ کامیابی حاصل کی، لیکن ان تمام کامیابیوں کے لیے فیصلہ کن منزل وہ ہے، جو تمھارے غفلت سے بھرے ہوئے سروں سے گزر رہی ہے۔ ان گھڑیوں کے اندر ہندستان کا ہر باشندہ، ہر مسلمان، ہندو، پارسی اور عیسائی، غرض کہ ہندستان کا ہر بسنے والا، جس نے گنگا، جمنا کی صاف لہریں دیکھی ہے اور ہندستان کے اس تاروں بھرے آسمان کو سر پر اٹھائے ہے، ہر ایک کا فرض ہے کہ آنے والی کامیابی کو حاصل کرے۔ اگر اب بھی تمہارے ایمان کے شعلے نہ بھڑکے، تو ان گزشتہ کامیابیوں کا افسانہ ایک منٹ کے لیے منزلِ مقصود تک تم کو نہ پہنچا سکیگا۔

اب آخری منزل آگئی۔ آج یا تو ہمیشہ کے لیے امید کا فیصلہ کر دوگے، یا ہمیشہ کے لیے ناامیدی کے مدفن میں اس تحریک کو دفن کر دوگے۔ وہ آخری فیصلہ کن گھڑی آپ کے سامنے آگئی۔ وہ کونسی ہے؟ افسوس کہ وقت کوتاہی کر رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے مسلمان بھائیوں کے سامنے یہ آجائے کہ کونسی منزل ان کا انتظار کر رہی ہے! جب تک وہ پوری صداقت کے ساتھ اس کا دھیان اپنے سامنے نہ لائینگے، گزشتہ کامیابیاں سود مند نہیں ہو سکتیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس منزل کا نقشہ کن لفظوں میں آپ کی آنکھوں کے آگے سنوار دوں۔

میں دنیا کی تمام قوموں سے قطع نظر کر لیتا ہوں اور مسلمانوں کو دکھانا چاہتا ہوں، کہ وہ دنیا کے طرح طرح کے علانات کی پرستش کر رہے ہیں۔ مگر انھیں یاد کرنا چاہیے کہ ان کے پاس ایک الہامی اعلان بھی ہے۔ جب تک وہ اس تعلیم کو اپنے سامنے نہ لائینگے، ان کی کامیابیاں

دلوں کے معاملات صاف نہ کر لیتے، جب تک آپ کے دلوں میں عمل کی سچی روح پیدا نہ ہو جاتی، اس وقت تک آپ دشمنوں کے مقابلے میں کیا کامیابی حاصل کر سکتے تھے؟

اصلی میدان ہندستان کا میدان تھا، اندرونی میدان تھا۔ اصل فتح و شکست کا فیصلہ ہندستان کے اندر ہونے والا تھا۔ اگر آپ اپنے ملک کے اتفاق کے میدان میں، ترکِ موالات کے میدان میں، قربانی و ولولہ کے میدان میں، مختصر یہ کہ ایمان کے میدان میں کامیابی حاصل کر لیتے تو دنیا کی کونسی قوت ہے، جو آپ کو شکست دے سکتی تھی؛ اگر آسمان کی تمام بجلیاں اتر آئیں، ہمالہ کی چٹانیں اپنی صفیں کھڑی کر لیں، تو بھی ایمان کو ایک منٹ کے لیے شکست نہیں دے سکتیں۔ سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ سب سے پہلے اپنے دلوں کے میدان کو فتح کریں۔ ایمان کے میدان کو، استقامت کے میدان کو، قربانیوں کے میدان کو، ملک کے اتفاق کے میدان کو سر کر لیں۔ جب تک ہم ان میدانوں کو فتح نہ کر لیتے، دشمنوں کے مقابلے میں کیسے بازی جیت سکتے تھے!

دنیا میں ہر فکر اور ہر عمل کے لیے دو ہی موجب ہیں: ایک موجب امید کا اور ایک یاس اور ناامیدی کا۔ اگر امید کی روشنی کو سامنے لائیں، تو اس میں شبہہ نہیں ہے کہ تحریکِ خلافت نے تمام درماندگیوں کو دیکھتے ہوئے اندرونی میدان کی ان تین منزلوں کو اللہ کے فضل سے کامیابی کے ساتھ طے کیا۔ اس کے بعد اس نے ایک ایسی جماعت میں، جس سے بڑھ کر ہندستان کے لیے کوئی ملکی جماعت نہیں ہو سکتی یعنی انڈین نیشنل کانگریس، اس کے اندر بھی اس نے کامیابی حاصل کی۔ یہ اٹھارہ مہینے جو گذر چکے ہیں، تحریکِ خلافت کی کامیابیوں کا زمانہ ہے۔ یہ شکست کا نہیں، یقیناً کامیابی کا زمانہ تھا۔ لیکن اگر اس کامیابی کا نتیجہ یہ ہو کہ آپ کے اندر گھمنڈ پیدا ہو جائے، اور آیندہ عمل کی قوت جاتی رہے، تو پھر یہ کامیابی آپ کے لیے فتحمندی نہیں ہے، ایک کھیل ہے، جسے ہوا کا ایک طمانچہ اڑا لے جائیگا۔

اس کامیابی کا دارومدار آخری منزل پر موقوف ہے۔ جب تک آپ اسے طے نہ کرینگے، پہلی

یہ شرطیں پیدا نہ ہونگی، اس وقت تک دنیا میں نہ کوئی قوم کامیاب ہو سکتی ہے، نہ ملک حتیٰ کہ ہوا میں اڑنے والا پرندہ بھی دنیا میں کامیابی نہیں پا سکتا۔

ان چار شرطوں کے نام سے گھبرا نہ جانا! اگر ایک چیز عربی بھیس میں آجائے، تو کیا تم انکار کر دوگے، چاہے وہ پہچانی ہوئی ہو؟

پہلی شرط وہ ہے جس کا نام قرآن مجید کی بولی میں ایمان ہے اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ تم جبھی کامیابی پا سکتے ہو جب تمہارے دلوں کے اندر، روح کے اندر، وہ چیز پیدا ہو جائے جس کا نام قرآن مجید کی زبان میں ایمان ہے۔ ایمان کے معنی ہیں عربی میں زوالِ شک کے یعنی کامل درجے کا بھروسہ اور علم؛ کامل درجے کا اقرار تمہارے دل میں پیدا ہو جائے۔ جب تک کامل درجے کا یقین تمہارے دلوں کے اندر نہ پیدا ہو، اللہ کی صداقت پر، اللہ کی سچائی پر، اللہ کے اصولوں پر، جس وقت تک کامل درجے کا یقین تمہارے قلب کے اندر پیدا نہ ہوگا، کامیابی کا کوئی دروازہ تمہارے لیے نہیں کھل سکتا۔ شک کا اگر ایک کانٹا بھی تمہارے دل میں چبھ رہا ہے، تو تمھیں اپنے اوپر موت کا فیصلہ صادر کرنا چاہیے۔ تم کو کامیابی نہیں ہو سکتی۔ سب سے پہلی شرط یہی ہے کہ تمہارے اندر ایمان، اطمینان، یقین، جماؤ اور تمکن اور اقرار پیدا ہو لیکن کیا محض دل کا یہ کام، دماغ کا یہ فعل، تصوّر کا یہ نقشہ، کامیابی کو پورا کر دیگا؟ نہیں۔

فرمایا: ایک دوسری منزل بھی اس کے بعد آتی ہے۔ جب تک وہ دوسری منزل بھی کامیابی کے ساتھ طے نہ کر لوگے، اس ایک منزل کو طے کر کے کامیابی نہیں پا سکتے۔ اس دوسری منزل یا شرط کا نام قرآن کی بولی میں عملِ صالح ہے (وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ) یعنی وہ کام جو اچھا ہے اسے اچھائی کے ساتھ کیا جائے۔ جس کام کو جس صحت اور جس طریقے کے ساتھ کرنا چاہیے جو طریقہ اس کے لیے سچا طریقہ ہو سکتا ہے اس کام کو اس کے ساتھ انجام دینا۔

قرآن کا یہ اصول تو عام ہے۔ ایمان کے معنی ہیں، وہ یقین، وہ کامل اطمینان، وہ کامل اقرار،

سود مند نہیں ہو سکتیں۔ وہ اعلان قرآن مجید میں جا بجا دہرایا گیا ہے۔ وہ ایک مختصر سبق ہے، جسے دہراتے ہوئے میں خاص طور سے خطاب کرونگا اپنے مسلمان بھائیوں سے، اور التجا کرونگا اپنے ہندو بھائیوں سے کہ وہ خاص اصطلاح سُن کر کبیدہ خاطر نہ ہوں، بلکہ اس حقیقت کو ڈھونڈھیں کہ جس طرح بہت سے کنول ہیں، مگر روشنی ایک ہے۔ سرخ رنگ کے کنول سے روشنی سرخ نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح خدا کی سچائی ایک ہے، اگرچہ طرح طرح کے ناموں میں پیش کی جائے۔ میں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ دنیا میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی کامیابی بھی دنیا کا کوئی وجود، کوئی روح، کوئی آتما، بلکہ کوئی ذرّہ اس آسمان کے نیچے نہیں پا سکتا جب تک وہ اس پروگرام پر عمل نہ کرے، جو قرآن نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اگرچہ قرآن نے اس بارے میں نہایت تفصیلی بیانات دیے ہیں، لیکن ایک بہت ہی چھوٹا سا بیان بھی ہے، جس کی نسبت تاریخِ اسلام کے ایک بہت بڑے امام نے جن کا نام امام شافعی ہے، یہ کہا تھا کہ اگر قرآن کے صرف یہی چند جملے نازل ہو جاتے، تو تمام کرۂ ارضی کی ہدایت کے لیے کافی تھے:

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔[۴]

آپ کی تحریکِ خلافت ہندستان کی آزادی کی تحریک ہے! یہ ایک مقصد ہے، جو فتح چاہتا ہے۔ عمل چاہتا ہے۔ جو لوگ مقصد اور عمل کے ڈھونڈھنے والے ہیں، جو مقصد کے عشق میں آنسو بہانے والے ہیں، تو میں کہنا چاہتا ہوں کہ قرآن کا ہر اچھے مقصد کے لیے یہ اعلان ہے کہ اس آسمان کے نیچے، نوعِ انسان کے لیے، انسانوں کی تلاشوں کے لیے، جستجوؤں کے لیے، امیدوں کے لیے بڑی بڑی ناکامیاں ہیں، بڑے بڑے گھاٹے ٹوٹے ہیں لیکن دنیا کی اس عام نامرادی سے کون انسان ہے، کون جماعت ہے جو بچ سکتی ہے، اور ناکامی کی جگہ کامیابی پا سکتی ہے۔ ناامیدی کی جگہ امید اس کے دل میں اپنا آشیانہ بنا سکتی ہے، وہ کون انسان ہے؟ وہ انسان ہے جو دنیا میں ان چار شرطوں کو قولاً اور عملاً اپنے اندر پیدا کر لے۔ جب تک

زنجیر مضبوط نہیں ہو سکتی۔ اس لیے فرمایا کہ کامیابی کا سفر کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک تیسری منزل تمہارے سامنے نہ آئے۔ وہ تیسری منزل فصیح و بلیغ لفظوں میں وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ہے۔ یعنی تم جو ایک کڑی تھے، تم نے اسے ایمان کی مضبوطی سے استوار کیا۔ لیکن تمھارا کام ختم نہیں ہوا۔ تمھارا فرض ہے کہ دوسری کڑیوں کو بھی درست کرو، اور انھیں اس طرح درست کر سکتے ہو کہ جس سچائی کو تم نے اپنایا ہے، اسے دوسروں میں بھی پھیلاؤ۔ جب تک تم میں یہ بات نہ ہوگی کہ تمھارا دل سچائی کے اعلان کے لیے تڑپنے لگے۔ جب تک تم تواصیِ حق نہ کرو گے، کامیابی تم کو نہیں مل سکتی۔

لیکن اگر اس تیسری منزل کے لیے تم تیار ہو گئے، اگر توفیقِ الٰہی نے تمہاری دستگیری کی، تو پھر آخری منزل کون ہے؟ وہ ہے جو صبر کی منزل کے لیے لازم و ملزوم ہے۔ اُس کے ساتھ اِس کی گردن اس طرح جوڑی ہوئی ہے کہ جدا نہیں کی جا سکتی۔ فرمایا کہ حق کی وہ وصیت کرینگے، حق کا وہ پیغام سنائینگے، حق کی دعوت پہنچائینگے، مگر حق کا یہ حال ہے کہ اس کی راہ میں کوئی قدم نہیں اٹھ سکتا، جب تک وہ قربانیوں کے لیے بھی نہ اُٹھے۔ فرمایا کہ مومن صرف حق ہی کا پیام نہ پہنچائے، بلکہ صبر کا بھی پہنچائے۔

تم نے اپنی بدبختی سے نہ صرف شریعت کے حکم کو بدلا ہے، بلکہ اپنے طریقِ عمل سے شریعت کے لفظوں کو، بولیوں کو بھی بدل ڈالا ہے۔ صبر کے معنی کیا ہیں؟ تم سمجھتے ہو کہ صبر کے معنی ہیں بے غیرتی اور باطل کی پرستش اور پوجا۔ تم صبر کے معنی یہ سمجھتے ہو۔ لیکن جو شخص صبر کے یہ معنی سمجھتا ہے، اس سے بڑھ کر قرآن مجید کی تحریفِ لفظی کرنے والا کوئی نہیں۔ تحریفِ معنوی تو بہت سے علماء کر رہے ہیں۔ لیکن تحریفِ لفظی یہ ہے کہ اگر صبر کے معنی یہ ہیں کہ تمھارے حق کے مقابلے میں مصیبت آجائے، تو تم کو چاہیے کہ صبر کے گوشہ میں پناہ لو

جو عمل سے پہلے پیدا ہوتا ہے۔ جس وقت یہاں اس کانفرنس کی جگہ، ایک چٹیل میدان تھا، کوئی وجود اس شامیانے کا نہ تھا۔ تمہاری خلافت کمیٹی کے ارکان نے اس وقت یہ شامیانہ نصب نہیں کیا تھا، لیکن اس وقت بھی یہ شامیانہ مع ان چمکتی ہوئی لالٹینوں کے موجود تھا۔ کہاں؟ ان کے دماغ میں۔ وہ چیز جو ان کے دماغ میں موجود تھی؛ وہ ارادہ جو ان کے ذہن میں پیدا ہوا تھا، وہ پہلی منزل ہوئی، جو مذہب میں آکر ایمان کا نام اختیار کر لیتی ہے۔ پہلی چیز عملِ دماغ ہے، عملِ تصور و یقین ہے۔ اسی بنا پر سب سے پہلی منزل ایمان کی ہے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ تمہارے دل کے اندر سچّا ارادہ پیدا ہو، سچّا عزم پیدا ہو۔ دوسری منزل عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کی ہے۔ صرف دماغ کی منزل طے کر کے قدم نہ رک جائیں، بلکہ عمل بھی کر دو۔ وہ عمل جو صالح ہو۔ جو صحیح طریقہ ہے اس کام کے انجام دینے کا۔ جب اس کو پورا کر لیا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ فتحمندی اور کامیابی کی دو منزلیں تم نے طے کر لیں۔

مگر کیا تمہارا کام ختم ہو گیا؟ اس کے بعد کیا تم منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤ گے؟ قرآن کی عالمگیر صداقت بتاتی ہے کہ نہیں۔ بلکہ ان دو منزلوں کے بعد دو منزلیں اور بھی باقی ہیں۔ اپنی ہمّت کو آزماؤ کہ ان کے لیے تمہارے تلوے تیار ہیں یا نہیں! تمہاری کمرِ ہمّت مضبوط ہے یا نہیں! اگر نہیں ہے، تو ممکن ہے کہ یہ دو منزلیں تمہارے لیے سود مند نہ ہوں۔ وہ دو منزلیں یہ ہیں:

قرآن مجید نے فرمایا کہ ایمان اور عملِ صالح آدمی کے اندر پیدا ہوا۔ یعنی یہ ہوا کہ انسانیت کی جو ایک زنجیر ہے، اس کی ایک کڑی نے اپنے آپ کو درست کر لیا۔ لیکن کیا ایک کڑی کے درست کر لینے کے بعد زنجیر کا پورا کام ہو گیا۔ ایک منٹ کے لیے بھی نہیں۔ تم کیا ہو؟ افراد کا مجموعہ، بکھری ہوئی کڑیوں کا ڈھیر۔ اس بکھری ہوئی شکل میں بیکار ہو، اس میں تمہارا کوئی وجود نہیں۔ قرآن وجود مانتا ہے اجتماع کا، قوم کا۔ اس کے نزدیک وجود کڑیوں کا نہیں، بلکہ زنجیر کا ہے۔ تم میں سے ہر وجود ایک کڑی ہے۔ اُس کا کام پورا نہیں ہوتا تھا، جب تک وہ باقی کڑیوں کی خبر نہ لے۔ جب تک باقی کڑیاں مضبوط نہ ہونگی،

چہرہ نہیں دیکھ سکتا، جب تک وہ ایمان، حق اور صبر کی منزلوں سے نہ گزرے۔ اللہ کا ہر قانون، ہر اڑنے والے پرندے کے لیے بھی ہے۔ کیا خدا اپنا قانون تمھارے لیے بدل دیگا؟ کیا خدا تمھاری غفلتوں کا ساتھ دیگا؟ اگر تم اپنی غفلت کی وجہ سے اس دھوکے میں پڑے ہو، تو تم سے بڑھ کر اپنی موت کی طرف جانے والا کوئی نہیں ہے۔

میرے دوستو!

آج ہمارا پہلا فرض یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنی گزشتہ کامیابیوں کے افسانے نہ دہرائیں، بلکہ ہر شخص اپنے عمل کا احتساب کرے اور اپنے دل سے پوچھے کہ کیا واقعی اس کے دل کے اندر ایمان کا بجھا ہوا چراغ روشن ہوگیا ہے! کیا واقعی اس کے اندر عملِ صالح پیدا ہوگیا! کیا واقعی اس کے اندر حق پیدا ہوگیا ہے!

اب اس پروگرام میں آخری منزل قربانی کی ہے۔ اسی منزل کے چند ہفتوں، بلکہ اس کے چند دنوں کے اندر، تمھارے ہندستان کی آزادی اور مسئلۂ خلافت کی پوری قسمت پوشیدہ ہے۔ اگر اس منزل کے لیے تیار ہو، تو اللہ کی کامیابی بھی تمھارے استقبال کے لیے تیار ہے۔ اگر ایمان ہمارے اندر پیدا نہیں ہوا ہے، اگر اب تک ہمارا دل شک سے خالی نہیں ہے، اگر ہمارے دل کے اندر حق کا یہ پہلا احساس بھی نہیں پیدا ہوا ہے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں، اگر یہ سچ ہے، تو ضرور ہے کہ کامیابی ہو، اور دنیا کی ساری طاقتوں کے مقابلے میں ہم فتحمند رہینگے۔ اگر اللہ کی چوکھٹ سے بھاگے ہوئے سر اس کے آگے پھر نہ جھکے ہوں، تو پھر کونسی شے ہے جو تمھاری چوکھٹ پر آئیگی۔ اور تمھاری کنڈی کھٹکھٹائیگی! اگر اب بھی تم ایمان، تواصی بالحق، عملِ صالح اور قربانی کے لیے تیار نہیں ہو، تو تم کو حق نہیں ہے کہ تم خدا کی زمین میں کامیابی کو ڈھونڈو۔

حضرات!

میں یہ بتلا دینا چاہتا ہوں کہ اس وقت جو کچھ میں نے کہا، یہ وہ شرائط ہیں جن

یعنی ہر طرح کی بے غیرتی کو، بیچارگی کو، باطل پرستی کو قبول کرلو۔ تو میرے بھائیو! تم سے بڑھ کر قرآن کی تعلیم کو بدلنے والا کوئی نہیں۔

صبر کے معنی اس سے بالکل مختلف ہیں۔ صبر کے معنی ہیں برداشت کے، صبر کے معنی ہیں جھیلنے کے، صبر کے معنی ہیں تحمل کے، جو قدم تم مقصد کی راہ میں اپنے محبوب اور پیارے مقصد کے لیے اٹھاؤ اور اس میں طرح طرح کی مصیبتیں آئیں، طرح طرح کی ڈراؤنی صورتیں آئیں، زنجیریں اور ہتھکڑیاں آئیں، بلکہ ممکن ہے کہ تمھارے سامنے تختہ آوے اور اس پر ایک پھندا جھول رہا ہو۔ یہ سب تمھارے سامنے آسکتا ہے۔ لیکن اگر تم حق کے پرستار ہو، تو تمھارا فرض ہونا چاہیے کہ تمھارے اندر صبر ہو، تمھارے اندر برداشت کی وہ اٹل طاقت، برداشت کا، وہ پہاڑ موجود ہو، جس پر دنیا کی کوئی شوکت، کوئی تاج و تخت فتحیاب نہ ہوسکے۔ یہ معنی صبر کے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید کے مواقعِ استعمال پر اگر غور کیا جائے، تو معلوم ہوجائیگا کہ ہر جگہ صبر کے یہی معنی ہیں۔

مقصد یہ تھا کہ قرآن مجید نے جو صداقت نوعِ انسان کے آگے کامیابی کے لیے پیش کی ہے، اور اب سے تیرہ سو برس پیشتر جو ایک اٹل اور لازوال پروگرام بنادیا ہے، یہ اس کی چار دفعات ہیں۔ اگر وہ کوئی سفر ہے تو یہ اس کی چار منزلیں ہیں۔ ہم کو ایک منٹ کے لیے غور کرنا چاہیے کہ کیا دنیا میں کوئی کامیابی بلا ایمان مل سکتی ہے؟ کیا تم شک کا روگ اپنے پہلو میں لے کر دنیا کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی کامیابی پاسکتے ہو؟ کیا تم دنیا میں ایک مٹھی بھر جَو اور چاول بھی پاسکتے ہو، جب تک تمھارے اندر طلب کے لیے سچا جذبہ نہ ہو؟ کیا ایک لمحے کے لیے دنیا کی کوئی کامیابی اپنا چہرہ تمھیں دکھا سکتی ہے، جب تک تم حق کی راہ میں قربانی چڑھانے کو تیار نہ ہو؟ خدا کی اس کائنات میں ایک ایک ذرّے کے اندر اس حقیقت کی عالمگیر تصدیق موجود ہے کہ اس دنیا میں کامیابی کا کوئی

کہ تم ان کاموں کو اختیار کرو جو تحریک خلافت کے لیے مفید ہیں! بلکہ تمھیں چاہیے کہ تم وہ کام کرو جو تمھارا فرض ہیں۔

قربانی کی جو پہلی منزل تھی جب تک قدم اس منزل سے آگے نہ بڑھ جائے، دعویٰ قربانی نہیں مانا جاسکتا۔ میں کہتا ہوں کہ میری طرف نہ دیکھو، اپنے گریبان کی طرف دیکھو۔ وہ کپڑا جو تمھارے جسم پر ہے، وہ باریک ململیں جو تم نے اپنے جسموں پر لپیٹی ہیں، ان سے تم کتنی بڑی خدمت اپنے دشمنوں کی انجام دے رہے۔ تمھارے ملک سے نوّے کروڑ روپیہ ہر سال اِن کپڑوں کے ذریعہ اُن خزانوں میں جاتا ہے، جو پانچ سال سے اسلام کے مٹانے میں صرف کیا جارہا ہے۔ ترکِ موالات میں اس سے بڑھ کر اور کون مسئلہ ہوسکتا تھا؟ تمھارے عمل کے لیے یہ علّت نہیں ہوسکتی کہ تم دوسروں کو کتنا نقصان پہنچا سکتے ہو۔ تمھارے لیے سچا اصول یہ ہے کہ تم اپنے دل کو کتنا فائدہ پہنچا سکتے ہو۔ تمھاری کامیابی کے لیے، خلافت کے لیے، سوراج کے لیے، پہلی چیز یہ تھی کہ ملک کے اندر قربانی کا ولولہ پیدا ہو۔ مقصد کے لیے، ملک کے لیے، حق کے لیے، تکلیف اٹھانے کا ایک ولولہ پیدا ہو۔ اِس وقت ضرورت تھی کہ قربانی کا سبق آئے؛ جو سبق تمھارے سامنے آیا وہ جان، گردن اور رگوں کا نہ تھا، محض ان کپڑوں کا تھا۔ اگر اسے تم کامیابی کے ساتھ طے نہیں کرسکتے، اگر تمھارے دل میں اتنا عشق نہیں ہے کہ تم ان باریک کپڑوں کو چھوڑ کر موٹے کپڑے پہن سکو، تو کیا تمھارے دل میں یہ حوصلہ آسکتا ہے کہ تم خدا کی زمین میں بسنے کی ہمت کرو؟ جب تک غیر ملکی کپڑے کے بائیکاٹ کی منزل کو طے نہ کروگے، قربانی کی کوئی منزل تمھارے سامنے نہیں آسکتی۔

۳۰ ستمبر کا زمانہ خلافت کمیٹی نے اس کے لیے قرار دیا تھا، مگر ہماری کامیابیوں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی درد انگیز داغ نہیں ہوسکتا کہ ۳۰ ستمبر کی صبح آئی اور ہماری غفلت پر رو کر چلی گئی۔ اب تک وہ لباس موجود ہے، جس کی وجہ سے

کو نہ اول کہا جا سکتا ہے نہ آخر۔ جب تک یہ چار چیزیں ہمارے اندر پیدا نہ ہونگی، کامیابی ممکن نہیں۔ یہی چار چیزیں تھیں جو ہماری تمام کامیابیوں کے لیے علت تھیں، جن کو تمام کرۂ ارضی میں دشمن پامال کرتے کرتے نہ کر سکے۔ جس طرح یہ شرائطِ اسلامی آپ کے لیے ضروری ہیں، اسی طرح آپ کو خبردار ہونا چاہیے کہ آپ نے جو عمل ترکِ موالات کا شروع کیا تھا، اس کے متعلق جو منزلیں سامنے آئی تھیں، جب تک ان منزلوں کو آپ کامل ایمان، عملِ صالح، کامل قربانی کے ساتھ انجام نہ دینگے، باقی منزلیں آپ کے سامنے نہیں آسکتیں۔ جب کوئی مقصد کسی کے سامنے رکھا جاتا ہے، تو وہ پوچھتا ہے کہ اس کا انجام کیا ملیگا؟ وہ ادائے فرض کے معاملے کو دکانداری بناتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے: نتیجہ کیا نکلیگا؟ لیکن فرض اس امر کا محتاج نہیں ہے کہ نتیجہ کیا اور کیا پیدا ہوگا۔ اگر فرض، فرض ہے تو ہمیں چاہیے کہ ہم اسے پورا کریں۔ نتیجے پر غور کرنا ہمارا کام نہیں ہے۔ دنیا میں بیج ہے، زمین ہے، انسان ہے اور اس دنیا پر خدا بھی ہے۔ کیا تم خدا کا کام، خدا کی زمین پر کر سکتے ہو؟ تم تو یہ کر سکتے ہو کہ تمھاری جھولی میں جو دانہ ہے، زمین کے سپرد کر دو۔ پھر وہ خدا ہے جو اپنی رحمت کو بھیجتا ہے، اور اپنے بادل کو برساتا ہے، اور جو بیج تم نے زمین کے سپرد کر دیا تھا، اس کو بارآور کرتا ہے۔ تمھارا فرض ہے کہ دیکھو، زمین صالح ہے، دانہ سچا ہے۔ اگر تمھارے ایمان کا دانہ سچا ہے اور اسے اپنے دل کی جس سرزمین میں ڈالا ہے، وہ سرزمین شور نہیں ہے، تو ضرور ہے کہ وہ دانہ زمین کے پردے کو چاک کریگا اور اپنی کامیابی کا سر نکالیگا۔

اگر اس وقت میں آپ کے سامنے یہ لاؤں کہ ایمان کے علاوہ عملِ صالح کے عام اور عالمگیر اصول کے علاوہ، ترکِ موالات اور تحریکِ خلافت کے سلسلے میں جو کام در پیش ہیں، وہ کونسے ہیں؟ تو میرے دوستو! جلد بازی سے کام نہ لینا۔ یہ نہ دیکھو کہ وہ کام آج تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات کے لیے کہاں تک مفید ہیں! تمھارا فرض یہ نہیں ہے

کی تکمیل کے لیے کوشش کرتی، لیکن طرح طرح کی مشکلات حائل تھیں۔ ضرورت تھی کہ جتنا روپیہ ہندستان میں فراہم ہو، اس کو براہِ راست غازی مصطفیٰ کمال پاشا تک پہنچانے کا مرکزی خلافت کمیٹی کوئی انتظام کرتی اور ملک کو دعوت دیتی۔ الحمدللہ، مرکزی خلافت کمیٹی کے اس کا انتظام کرلیا کہ ہر اُس پیسہ کو جو ہندُستان میں غازی مصطفیٰ کمال پاشا کے لیے دیا جائے، وہ براہِ راست غازی مصطفیٰ کمال پاشا کے نام بھیجے۔ اور براہِ راست ایک رسیدان کے ہاتھ کی حاصل کرلے! چنانچہ دس ہزار کی ایک قسط حال میں بھیجی گئی۔

مرکزی خلافت کمیٹی نے آج مسلمانوں کو دعوت دی ہے کہ ان کا فرض ہے کہ وہ انگورہ کے لیے اپنے مال کو قربان کریں اور انگورہ و خلافت کے لیے اپنے جسم کو تھوڑا سا نقصان پہنچائیں، بدیسی کپڑے کو ترک کردیں اور اپنے گھر کے صندوقوں کو صرف دیسی کپڑے سے بھریں۔

برادرانِ عزیز!

یہ چند منتشر کلمات تھے، جن سے میں اس موقع پر اس مجلس میں آپ حضرات کی تواضع کرسکا۔ افسوس ہے کہ با وجود اختصار کے اپنے خیالات کی رو میں بہتا چلا گیا اور محسوس نہ کیا کہ رات کا بہت حصہ گزر چکا ہے۔ اس حالت میں بہتر نہیں ہے کہ آج کے جلسہ کی کارروائی کو زیادہ طول دیا جائے۔ آج کے جلسہ میں سب سے پہلے دو نہایت اہم تجویزیں تھیں۔ جن کو افتتاحی تقریر کے ضمن میں عرض کرنا تھا، لیکن افسوس ہے کہ وقت زیادہ ہوگیا ہے اور اب موزوں نہیں کہ جلسہ کی کارروائی کو زیادہ طول دیا جائے۔ اس لیے آج کا جلسہ ختم کیا جاتا ہے اور کل کا اعلان ہے کہ صبح آٹھ بجے جلسہ کی دوسری نشست ہوگی۔ امید ہے، آپ

ہندستان غلام بنایا گیا جس کے ذریعہ ہندستان کے بہترین مقاصد پامال کیے گئے۔ کیا ہم کو حق پہنچتا ہے کہ ہم یہ کہیں کہ ہم اپنی جانوں کو قربان کرنے کے لیے تیار ہیں؟ اگر تم اپنی جانیں قربان کرسکتے ہو، تو تم کو کیا ہوگیا ہے کہ تم اپنے لباس کو قربان نہیں کرسکتے۔ ہم میں سے ہر ایک مسلمان اور ہندو کا سب سے بڑا پاک اور اشرف فرض ہے کہ جہاں تک جلد ممکن ہو، اس معاملے کو کامیابی تک پہنچائے۔ جب تک یہ منزل طے نہ ہوگی، اور کوئی منزل ہمارے سامنے نہیں آسکتی۔ خصوصًا مسلمانوں کے لیے ایک بڑا کام، جو ان کے جسم کی قربانی سے تعلق رکھتا ہے، یہ معاملہ ہے کہ وہ ان باریک کپڑوں کو جو مانچسٹر اور لنکا شائر سے آتے ہیں اور ان کے ملک کو تباہ کر رہے ہیں، ان کو اُتار دیں اور انھیں اپنے لیے جائز نہ رکھیں۔

دوسرا کام ان کے لیے اِس جسم کی قربانی کے ساتھ جو میں اُن کے سامنے پیش کرتا ہوں، وہ کون سی قربانی ہے؟ میرے دوستو، وہ مال کی قربانی ہے، جس کے لیے تمھیں آج تیرہ سو برس سے پکارا جاتا رہا ہے کہ اپنی جانوں اور مال کو سچائی کی راہ میں قربان کرو۔ اگر آج مسلمانوں کے بس میں اتنا نہیں ہے کہ وہ سمرنا پہنچیں اور دشمنانِ اسلام کے مقابلہ میں اپنی لاشیں تڑپائیں! اگر آج مسلمانوں کی قسمت میں یہ دولت نہیں لکھی ہے، تو کتنے افسوس کی بات ہے کہ وہاں کے مسلمان بھائیوں کے روپیہ سے بھی مدد نہ کریں۔ ہندستان کا کوئی مسلمان اپنے کو مسلمان کہنے کا حق نہیں رکھتا، جب تک وہ زیادہ سے زیادہ اپنے مال کو آج حکومتِ انگورہ اور مجاہدینِ انگورہ کے لیے قربان نہ کردے۔

بلاشبہہ مرکزی خلافت کمیٹی کا یہ فرض تھا کہ وہ سب سے پہلے اس امر

۴

# خطبۂ اختتامیہ

## مجلسِ خلافت

آگرہ، ۲۶ اکتوبر ۱۹۲۱ء

برادرانِ عزیز!

دو دن سے آپ کے صوبے کی مجلسِ خلافت مختلف جلسوں اور صحبتوں میں اپنے فرائض انجام دے رہی تھی، یہ اُس کا آخری جلسہ ہے۔

میں آپ کے سامنے اس وقت جو چیز آشکارا کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اگر آپ اس جلسے کے اختتام کے منتظر تھے، اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اِس جلسے کا کام ختم کر چکے ہیں، تو میں آپ کے اس گمان کی تصدیق کرتا ہوں کہ جلسے کا کام ختم ہو چکا۔ مگر یہ بھی یاد دلانا چاہتا ہوں کہ آپ کا کام ابھی تک ختم نہیں ہوا، بلکہ شاید اِس وقت تک شروع بھی نہیں ہوا۔ جس قدر کام قول سے تعلق رکھتا تھا، زبانوں سے تعلق رکھتا تھا، تو میں اعلان کرتا ہوں کہ وہ کام پورا ہو چکا۔

لیکن اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اِس عالم کے علاوہ ایک دوسرا عالم بھی ہے، زبان کا عالم نہیں، فعل کا عالم، تو میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ تمھارا کام ختم نہیں ہوا، بلکہ شاید ابھی شروع بھی نہیں ہوا۔ جہاں تک صداؤں کا تعلق تھا، تم صدائیں

حضرات اسی جوش و عمدگی کے ساتھ اُس جلسے میں بھی حصّہ لیں گے جس عمدگی کے ساتھ آج اس جلسہ میں آپ نے حصّہ لیا ہے۔ اس لیے کہ نہایت ضروری اور اہم گزارشات ہیں، جو اس میں عرض کی جائیں گی۔ اس اعلان کے بعد آج کے جلسہ کے اختتام کا میں اعلان کرتا ہوں۔

وہ ہیں، جن کا ہم اوّل وقت سے انتظار کر رہے تھے۔ جن کے متعلق ہمارا یقین ہے کہ جس میدانِ جنگ میں ہم نے قدم رکھا ہے، اس کی آخری منزل طے نہ ہوگی، جب تک ان گرفتاریوں کا سلسلہ تمام ہندستان کے طول و عرض کا احاطہ نہ کر لیگا۔ یہی وہ چیز ہے جس کے انتظار میں ہم بیقراری کی صبحیں اور شامیں بسر کر رہے تھے۔

میں اپنی کمزوریوں کو چھپانا نہیں چاہتا۔ یہ میدان خود ہم نے نہیں کھولا۔ ہم اپنے لوگوں کی استطاعت اور صلاحیت کے منتظر تھے، لیکن گورنمنٹ صبر نہ کر سکی۔ اس نے ایک قدم بڑھایا، اور جس چیز کے ہم بھوکے پیاسے تھے، اور جس کی تاخیر ہمارے کاموں کو روکے ہوئے تھی، گورنمنٹ نے اس دعوت کا اعلان کر دیا۔

اس دعوت کی اوّلین راہ یہ تھی کہ گورنمنٹ نے ملک کے ان نمایاں پیشواؤں میں سے چند افراد کو گرفتار کیا، جن کے متعلق ملک کا خیال ہے کہ وہ تحریک خلافت کے روحِ رواں تھے۔ گورنمنٹ نے محمد علی، شوکت علی[2]، مولانا حسین احمد[3]، ڈاکٹر کچلو[4]، پیر غلام مجدد[5]، مولانا نثار احمد[6]، جگت گرو سری شنکر آچاریہ[7] جی اور اسی سلسلے میں دہلی میں مولانا احمد سعید صاحب[8]، عبدالعزیز صاحب[9] اور دیگر اشخاص کو یکے بعد دیگرے گرفتار کر لیا۔

گورنمنٹ اگر گرفتار کرنا چاہتی تھی، تو گرفتاری کے لیے کسی جرم کی ضرورت نہ تھی۔ دنیا کی ہر قوم و ملک کی تاریخ میں ایک زمانہ آتا ہے، جب ملک کا ہر باشندہ، ظلم، گھمنڈ اور مادّی طاقت کی نظروں میں مجرم بن جاتا ہے، اس لیے کہ وہ آزادی چاہتا ہے اور ظلم کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔ قوم کی تاریخ میں یہ فیصلہ کن گھڑی ہوتی ہے۔

آج ہندستان کا کون بدبخت بسنے والا ہے جو گورنمنٹ کی نظروں میں مجرم نہیں ہے؟ اور ہندستان کا وہ کون محروم باشندہ ہے، جسے اس جرم سے انکار ہوگا؟

گورنمنٹ کی ہندستان میں بدبختیوں کی اگر تاریخ لکھی گئی، تو یقیناً اس تاریخ میں سب سے آخری بدقسمتی یہ شمار کی جائیگی کہ گورنمنٹ نے اپنی اس سب سے

سن چکے اور سنا چکے، لیکن اب وہ گھڑی آگئی ہے کہ چند لمحوں کے لیے اپنے عمل کا احتساب کرو کہ کتنا تم نے عمل کیا ہے، اور کتنے عمل کی منزل سَر کرنے کے لیے تم تیار ہو!

دوستو! مجھے چھوڑ دو کہ وہ دعوت آپ کے سامنے پیش کروں، جو آج نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ سچائی کی قدر کرنے والے ہر انسان کے لیے سب سے بڑی دعوت ہے۔ جس دعوت کو میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں، وہ کوئی تجویز نہیں ہے، تجویز ہوتی تو وہ اپنے رسوم کے ساتھ آپ کے سامنے آتی۔ وہ دعوت ہمارا ایک مسلّمہ اعتقاد ہے، ایک مسلّمہ یقین ہے، مذہب کا ایک مسلّمہ رکن ہے، مذہب کا ایک مسلّمہ عمل ہے، اور کوئی مسلمان جو ایمان کا دعویٰ رکھتا ہے، اُس سے میں مطالبہ کر رہا ہوں کہ یا تو اُسے اپنے عمل سے ثابت کر دے اور یا اسلام اور اُس کی صداقت کا دعویٰ ہمیشہ کے لیے ختم کر دے۔ وہ اعتقاد ایمان کے اعتبار سے کوئی نیا اعتقاد نہیں ہے۔ اِس وقت کوئی خاص ضرورت نہ تھی کہ میں خصوصیت سے اس کا اعلان کرتا، یا اس پر زور دیتا۔ وہ اعتقاد اگرچہ اس وقت سے موجود ہے، جب سے دنیا میں انسان موجود ہے۔ اور مسلمانوں کے دلوں اور عمل میں تو وہ اعتقاد تیرہ سو برس سے برابر چلا آرہا ہے۔ ہندستان میں بھی اس کا بار بار اعلان کیا جا چکا ہے۔ اس لیے کوئی ضرورت نہ تھی کہ خاص طور پر اس کا اعلان کیا جاتا۔

تمھیں معلوم ہے کہ گزشتہ ہفتوں میں گورنمنٹ نے فیصلہ کیا کہ ملک میں جو مختلف نمایاں اشخاص، خلافت اور ہندستان کی آزادی کی تحریک میں حصہ لے رہے ہیں، ان کی گرفتاری کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔ گورنمنٹ کو اُتنا ہی حق حاصل تھا، جتنا ہر غرور اور گھمنڈ کو حق حاصل ہو چکا ہے کہ جس شہری کی چاہے، زنجیر اور طوق سے تواضع کرے۔ اس کی نہ ہم شکایت کرتے ہیں، نہ شکایت کی ضرورت سمجھتے ہیں۔ یہ گرفتاریاں

کافی نہیں کہ حرام ہے؛ بلکہ اسلام اور کفر کا فیصلہ کر دینے والا ہے۔ ہر لمحہ جو ایک بدبخت کے لیے انگریزی جھنڈے کے نیچے گذریگا، وہ اس کے لیے حرام ہے۔
۱۹۱۶ء میں مَیں نے یہ چِٹھی وائسرائے کے پاس بھیجی تھی۔ اُس کی نقل گورنمنٹ آف انڈیا کے پاس موجود ہونا چاہیے۔ کیا کراچی میں اس مسئلے کی ابتدا ہوئی؟ نہیں۔ اس مسئلے کا بار بار اعلان ہوتا رہا ہے۔ ۲۸ فروری ۱۹۲۰ء کو جب مسئلہ خلافت کے ابتدائی ایام تھے، انھی ایام میں کلکتہ میں خلافت کمیٹی کا جلسہ ہوا؛ اس کا صدر میں تھا۔ اس جلسے میں کراچی کی تجویز سے بھی زیادہ صاف لفظوں میں، خصوصیّت سے سپاہیوں کو مخاطب کر کے اسلام کے اس عقیدے کا اعلان کیا گیا تھا کہ موجودہ حالات میں چونکہ انگریزی حکومت اسلام کے مقابلے میں لڑنے والا جتھا ہے، اس لیے کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ برٹش گورنمنٹ کی فوج میں نوکری کرے یا نوکر رکھائے۔
یہ تجویز اور مختلف جلسوں میں بھی بار بار پاس کی گئی۔ بریلی میں جمعیۃ العلمار کا جلسہ ہوا۔ وہاں بھی یہ پاس ہوئی۔ پھر میں آپ کو بتلانا چاہتا ہوں کہ میری انھی انگلیوں سے اٹھارہ مہینوں کے اندر تین جز دسے زیادہ صفحات اس موضوع پر لکھے گئے اور وہ چھپ کر شائع بھی ہو چکے، جس کی بارہ ہزار سے زیادہ کاپیاں نکل گئیں۔
اگر یہ جرم ہے تو اسے چھوڑ دو کہ اس جرم کی تیرہ سو برس کی تاریخ کیسی ہے! میں تو تمھارے سامنے اٹھارہ مہینے کی تاریخ دہرا رہا ہوں، جب اِس جرم کا پکار پکار کر اعلان کیا گیا؛ دس دس پندرہ پندرہ ہزار آدمیوں نے اپنی ٹولیاں بنا کر اس جرم کا ارتکاب کیا۔ اُس وقت گورنمنٹ کے عمّال کہاں تھے؟
پس فی الحقیقت اگر گورنمنٹ گرفتار کرنا چاہتی تھی، تو ہم اسے دعوتیں دے رہے تھے کہ کاش! وہ گرفتار کرنے کے لیے تیار تو ہو۔ جس وقت ان گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا، میں سچ کہتا ہوں کہ آرزو پیدا ہوئی کہ یہ گرفتاریاں اچانک شروع ہو کر رک نہ جائیں، اور سچ

بڑی سلطنت کو اپنی سب سے بڑی فتح سمجھا۔ اور غرور سے دیوانی ہو گئی۔
گورنمنٹ نے ان زندانیانِ حق کے لیے ایک ایسا جرم انتخاب کیا، جو اگر جرم ہے، تو صرف محمد علی، شوکت علی، حسین احمد کا نہیں ہے، بلکہ فی الحقیقت سات کروڑ قائلانِ کلمۂ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا، بلکہ ہندستان کے بتّیس کروڑ بسنے والوں کا متّفقہ جرم ہے۔
آپ کو معلوم ہے کہ پچھلے دنوں کراچی میں مرکزی خلافت کمیٹی کا ایک جلسہ ہوا تھا اور اس جلسے میں ایک ایسی تجویز بھی پاس کی گئی تھی، جو احکام شرعی کی بنا پر، انصاف اور اس کے قدرتی قانون کی بنا پر، گزشتہ اٹھارہ مہینے کے اندر بار بار پاس ہو چکی ہے۔ گورنمنٹ نے اسی تجویز کو گرفتاری کی بنیاد قرار دیا ہے۔
اب اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ چیز ہمارے سامنے آتی ہے کہ اگر چند لمحوں کے لیے تسلیم کر لیا جائے کہ اس تجویز میں اسلام کا جو عقیدہ پیش کیا گیا ہے، وہ کوئی نیا عقیدہ ہے اور اس کی نئی بندش ہے۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس تجویز میں اسلام کا جو عقیدہ پیش کیا گیا ہے، وہ کوئی نیا عقیدہ ہے، اور اُس کی نئی بندش ہے۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے، تو کیا گزشتہ اٹھارہ مہینے کے اندر اس کا بار بار اعلان نہیں ہو چکا ہے؟ اسی قدر نہیں، بلکہ کئی سال پہلے بھی اس کا اظہار و اعلان ہو چکا ہے۔
۱۹۱۶ء میں جب گورنمنٹ نے مجھے نظر بند کیا اور گورنمنٹ آف انڈیا نے اعلان کیا کہ یہ شخص، ملکِ معظّم کے دشمنوں سے ساز باز رکھتا ہے، تو میں نے ایک چٹھی لکھی تھی اور نہایت تفصیل سے اسلام کے احکام درج کر دیے تھے، جن کی رُو سے کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ ایک لمحہ کے لیے بھی برٹش گورنمنٹ کی نوکری کرے۔
میرے الفاظ یہ تھے کہ نہ صرف یہ حرام ہے بلکہ قرآن و حدیث کے احکام کے بموجب یہ لفظ

گرنے والا ہے، اور اس کا عالم یہ ہوا ہے کہ ہوش و حواس باختہ ہونے لگے ہیں؛ ہاں، چونکہ گورنمنٹ کی سطوت مٹنے والی ہے اور دنیا کی تاریخ نے، اور دنیا کی تاریخ کے فلسفوں نے، ہمیں بتلا دیا ہے کہ جب کسی قوم کے گھمنڈ اور طاقت کا زوال ہوتا ہے، تو جسمانی قوتوں کا زوال بعد میں ہوتا ہے۔ پہلے عقل کا زوال ہوتا ہے۔ یہ عقل کے زوال کا تماشا ہمارے سامنے ہے۔

میں نہیں جانتا کہ جو کچھ ہو رہا ہے، تم اسے ایک ہنگامہ یا تماشا سمجھتے ہو، مگر یہ ہنگامہ نہیں ہے۔ دنیا کے لیے ایک عجیب و غریب منظر تیار ہو رہا ہے۔ ہندستان کی آنے والی تاریخ کا مؤرخ بےچین ہے۔ ہندستان کی تاریخ اپنی فیصلہ کن گھڑیوں سے گزر رہی ہے، اور میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر ہے، جو میں پچھلی تاریخوں میں دیکھتا تھا۔ میں اس وقت روما کو ڈوبتے ہوئے دیکھ رہا ہوں، میں کلدانیوں کا خاتمہ دیکھ رہا ہوں؛ میرے سامنے تختِ جمشید الٹ رہا ہے، اور تاریخِ عالم ہم کو انقلاب کا ایک آخری تماشا دکھا رہی ہے۔

درحقیقت یہ زوالِ عقل اور اختلالِ دماغ کا نتیجہ ہے کہ گورنمنٹ اپنے قدم کو ہوشیاری کا قدم سمجھ رہی ہے، حال آنکہ یہ اس کے زوال کا قدم ہے۔ یہ گرفتاریاں انگریزوں کے زوال کا تماشا پیش کر رہی ہیں۔ گورنمنٹ نے محمد علی، شوکت علی، سیف الدین کچلو، حسین احمد، شنکر آچاریہ کو گرفتار نہیں کیا ہے، بلکہ گورنمنٹ نے آخری اعلان کر دیا ہے کہ وہ اسلام کو اور دنیا کی متفقہ سچائی کو گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ لیکن گورنمنٹ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اِس کا گھمنڈ لاکھ اونچا سہی، اِس کے گھمنڈ سے بھی اونچی ایک طاقت موجود ہے۔ گورنمنٹ سمجھتی ہے کہ ہم سے بڑھ کر دنیا میں کون ہے، مگر وہ فاطر السموات والارض بتاتا ہے کہ حقیقی طاقتور اللہ تعالیٰ ہے۔

چونکہ گورنمنٹ نے اپنے عمل سے اسلام کو، اسلام کے عقیدے کو، دنیا کی عالمگیر صداقت کو،

کہتا ہوں کہ اس اٹھارہ مہینے میں مجھ پر کوئی گھڑی ایسی نہ گزری تھی، جیسی وہ پاک گھڑی جب گورنمنٹ کی درماندگیاں سامنے آگئیں۔ اور اب اگر گرفتاریوں کا سلسلہ آگے نہ بڑھا، تو میرے قلب میں مایوسی کا داغ پڑ جائیگا کہ نصرت و مراد کا یہ ایک دروازہ تھا، جو افسوس کہ کھل کر بند ہو گیا۔

گورنمنٹ اگر گرفتار کرنے کے لیے تیار ہے، تو اور مجرموں کو چھوڑو، ایک مجرم تمھارے سامنے کھڑا ہے۔ اگر اس عقیدے کی دعوت جرم ہے، تو میں نے محض اعلان نہیں کیا، محض دور سے دعوت نہیں دی، بلکہ میں نے سپاہیوں سے کہا ہے کہ بارش کی بوندوں کی طرح خدا کی لعنت تم پر برس رہی ہے۔ اگر لعنت سے بچنا چاہتے ہو تو انگریزی راج کی غلامی چھوڑ دو۔

ہاں، ہاں، میں نے سپاہیوں سے، ہندستان کی برٹش فوج سے یہ کہا ہے، اور جب تک میرے حلق میں آواز پھنستی نہیں، یہی کہتا رہونگا۔ آج بھی اعلان کرتا ہوں، اور جب تک میری زندگی باقی ہے، ہر صبح کو، ہر شام کو، میرا پہلا فرض یہی ہوگا کہ سپاہیوں کو ورغلاؤں اور ان سے کہوں کہ گورنمنٹ کی نوکری چھوڑ دو۔ کیا عظیم الشّان برٹش گورنمنٹ، جس کی حکومت میں کبھی سورج نہیں ڈوبتا، تیار ہے کہ گرفتار کرے؟ اگر یہ جرم ہے تو اس جرم کا ارتکاب تمام ملک کر رہا ہے۔ میں نے سپاہیوں سے بھی کہا ہے، اور لوگوں سے بھی کہا ہے کہ تم سپاہیوں کے پاس چھاؤنیوں میں جاؤ اور سپاہیوں کو یہ پیغام سناؤ۔ پھر برٹش گورنمنٹ اگر اپنی طاقت کا گھمنڈ رکھتی ہے، تو کیوں نہیں قدم آگے بڑھاتی؟ کیا گورنمنٹ کی مشینری پر فالج گر گیا ہے؟

عزیزانِ من!

اس سلسلے میں یہ چیز میرے سامنے آئی ہے کہ گو بار بار اس مسئلے کا اعلان کیا جاتا تھا، مگر چونکہ اب گورنمنٹ نے اپنے ذہن میں بڑی دانشمندی سمجھ کر، مگر یہ بھول کر کہ اب ستون

برٹش گورنمنٹ سے مددگاری کا کوئی رشتہ بھی رکھنا جائز نہیں۔ اگر آج یہ صورت ہوتی کہ برٹش گورنمنٹ گناہ اور پاپ کے لیے سپاہیوں کو نوکر نہ رکھتی، بلکہ نماز روزوں کے لیے نوکر رکھتی، تب بھی اس کی نوکری حرام ہوتی۔ جب برٹش گورنمنٹ فریق محارب ہے، تو اب یہ سوال نہیں رہا کہ اس کی نوکری میں ہم کو کیا کام کرنا پڑتا ہے۔ کوئی کام بھی کرنا پڑے، برٹش گورنمنٹ کی نوکری حرام ہے۔ اگر انگریزی راج کی فوج میں سپاہی کو گناہ نہیں کرنا پڑتا، بلکہ انگریزی راج، فوجی چھاؤنیوں میں مسجدیں اور مندر بناکر مسلمان اور ہندو سپاہیوں سے کہتا کہ صبح و شام خدا کے آگے ! جھکے ٹیکو، تو بھی میں یہی کہتا کہ انگریزی راج کی فوج میں بھرتی ہونا کسی ہندو مسلمان، کے لیے جائز نہیں۔

اس نوکری کا اصلی مقصد وہ ارادہ ہے۔ وہ نیت ہے جس کی نسبت ابھی چند منٹ میں تم سنو گے کہ مسلمانوں کے لیے سب سے بڑا گناہ، سب سے بڑی معصیت، جو خدا کی لعنت کو پھیلاتی اور خدا کی پھٹکار کو ظاہر کرتی ہے، وہی عمل ہے جس کے لیے ہندستان کے بدبخت مسلمانوں کو انگریزی فوج میں بھرتی کیا جاتا ہے۔

ہندستان کی یہ فوج کس غرض سے ہے؟ صرف دو غرض سے: ایک تو وہ ہے جس کا تعلق ہندستان کے اندر سے ہے، اور ایک وہ ہے جس کا تعلق باہر کی دنیا سے ہے۔

اگر تم پوچھنا چاہتے ہو کہ اس فوج کا ہندستان میں کیا کام ہے؟ تو اس کا جواب میں نہیں دے سکتا، جلیان والا باغ کی وہ مٹی دے سکتی ہے[12]، جو ہندو مسلمانوں کے خون سے تر ہو رہی ہے۔ کس نے اپنے بھائیوں پر گولیاں چلائی تھیں؟ ہندستان کے سپاہیوں نے!

ہندستان کے اندر انگریزی فوج کا ہندستان کا سپاہی کیا کرتا ہے؟ ہندستان کو غلام بناتا ہے اور ہندستانیوں کا خون بہاتا ہے۔ کیا تم جانتے ہو کہ ہندستان کی حکومت ہندستان کی طاقت کس نے پامال کی؟ میں تو بتلانا چاہتا ہوں کہ دو سو برس پہلے، جو

عالمگیر راستی کو چیلنج دیا ہے۔ اس لیے ہم میں سے ہر شخص کا فرض ہوگا کہ جب سچائی کو پامال کیا جائے، سچائی کو جرم قرار دیا جائے تو خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی چیز ہو، اس وقت نوعِ انسان کے لیے بڑی سے بڑی عبادت یہ بن جاتی ہے کہ ظلم کا مقابلہ کرے۔
آخری حج کے موقع پر ایک شخص نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، سب سے بڑا اور سب سے بہتر جہاد کیا ہے؟ حضرت نے کچھ دیر تامل کرکے فرمایا: "سب سے افضل جہاد ہے، ظالم حاکم کے روبرو کلمۂ حق کا اعلان کر دینا!"

عزیزانِ من!
اگرچہ یہ مسئلہ ہمارے لیے کوئی نیا مسئلہ نہ تھا، جس کی پکار ہمارے لیے ضروری ہوتی، لیکن عاقبت نااندیش اور قریبِ زوال گورنمنٹ نے اس چیز کو جرم قرار دے کر آج ہر مسلمان کو اور ہر سچائی پسند انسان کو، ہندستان کے ہر مسلمان اور ہر ہندو کو، جو دین کو، دھرم کو عزیز رکھتا ہے۔ مجبور کر دیا ہے کہ وہ ساری باتوں سے بڑھ کر سب سے بڑی نیکی، سب سے بڑا اجر، اللہ کی محبوبیت کا سب سے بڑا وسیلہ اسی چیز کو سمجھے اور پوری آزادی سے اعلان کرے کہ انگریزی گورنمنٹ کی نوکری حرام ہے، کفر ہے اور ہر سپاہی کو نوکری ترک کر دینا چاہیے۔
لیکن قبل اس کے کہ میں اس ٹکڑے کو ختم کروں۔ آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ میری زبان سے ابھی لفظ "حرام" آپ نے سنا تھا۔ یہ لفظ عربی زبان کا ہے، مگر کیا عربی زبان کا لفظ ہونے کی وجہ سے اس کی سچائی اسلام کے لیے مخصوص ہو گئی؟ کون صداقت پسند ہے، انگریز ہو، عیسائی ہو، یہودی ہو، جو ایک منٹ کے لیے بھی مان سکتا ہے کہ ظالم کی مدد کرنا، بندگانِ خدا کا خون بہانا، ان کے پیروں میں غلامی کی بیڑیاں ڈالنا، ثواب کا کام ہے۔ کیا دنیا کا کوئی مذہب بھی ایک گھڑی کے لیے اسے تسلیم کریگا؟
برٹش گورنمنٹ، اسلام کے اور ہندستان کے مقابلے میں لڑنے والا فریق ہے۔ اس لیے

اور اپنے وطن کو غلام بنائیں۔

اب سنو! ہندستان کی فوج کو ہندستان کے باہر کیا کام کرنا پڑتا ہے! میں وہ داستان، وہ کہانی تمھارے کانوں کو نہ سناؤں۔ اگر تمھارے دل کے ٹکڑے ہوں، تو اُسے ان پر نقش کر دوں۔ آہ، وہ ترک، جو چھ سو برس سے اپنے سینوں کو اسلام کی حفاظت کے لیے ایک دیوارِ آہنی بنائے ہوئے ہیں، انھی ترکوں کے سینوں پر کس نے گولیاں برسائیں؟ بدبخت ہندستانیوں نے۔ قسطنطنیہ کے ساحل پر کون قدم تھے جو اترے؟ بدبخت ہندستانیوں کے قدم۔ مسلمانوں کا خون بہانا، ایک ظالم کی زنجیر کو خدا کی آزاد مخلوق کے پاؤں میں ڈالنا، اس دنیا کی کون سی سچائی، کون سا دین، کون سا دھرم ہے، جو ایک گھڑی کے لیے بھی اسے نوعِ انسان کے لیے سب سے بڑی پھٹکار اور لعنت نہ کہیگا؟

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اور اسلام کے قانون نے اُس نوکری کو، اُس کام کو، جس میں انسان کا خون بہانا پڑے، ایک ایسا گناہ قرار دیا ہے، جس کے لیے رسول کی زبان پر کفر کا لفظ جاری ہوا ہے۔ اسلام کے قانون نے مسلمانوں ہی کا قتل نہیں، بلکہ کسی انسان کا بھی قتل کرنا اور اس کا خون بہانا، ایک بہت بڑی معصیت، گناہ، پاپ قرار دیا ہے چنانچہ سورۂ فرقان میں فرمایا ہے: وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ یعنی وہ لوگ جو خدا کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک نہیں کرتے، کسی جان کو قتل نہیں کرتے جسے اللہ نے روک دیا ہے، اور جسے اللہ نے حرام کر دیا۔ لیکن اگر انھیں کرنا پڑتا ہے تو صرف ان جانوں کے لیے وہ قتال جائز رکھتے ہیں، جن جانوں کو اللہ کی عدالت کے قائم رکھنے کے لیے سزا دینا ضروری ہے۔

اس قانون کی رُو سے اگر قتلِ نفس جائز ہے۔ تو صرف ان جماعتوں، فوجوں، جتھوں کا، جن کا وجود دنیا کی ہدایت و حریت کے لیے، قوموں کے ایمان کے لیے، سچائی کی بقا

انگریزی راج کے آنے کا زمانہ ہے، تمہارے ملک کو غلام بنانے کے لیے نہ دنیا کا خزانہ آیا تھا اور نہ برطانیہ کے جزیرے کے ڈھلے ہوئے ہتھیار آئے تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ کوئی انگریزی فوج نہیں آئی ہندستان کو غلام بنانے کے لیے اور کوئی برطانوی سونا چاندی نہیں آیا ہندستان میں بکھیرنے کے لیے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے آج تک، بتاؤ کہ ہندستان کی تاریخ میں ایک واقعہ بھی موجود ہے کہ ہندستان کو انگریزی راج کا غلام بنانے کے لیے کوئی فوج بھی برطانیہ کے جزیرے سے آئی، اور کوئی لدا ہوا خزانہ سمندر کے کنارے لگا؟ جس سوراج کے لیے آج تم رو رہے ہو، جس کے لیے تمہارے دلوں میں سوراخ پڑ گئے ہیں، بدبخت ہندستان کے بسنے والو، سُن لو کہ اس سوراج کو خود ہندستان کی فوجوں نے پامال کیا ہے، وہ ہندستان ہی کی فوج تھی جس نے مٹھی بھر گیہوں کے لیے اپنے دین کو، دھرم کو بیچا، جس نے اپنی روح کو، آتما کو انگریزوں کے حوالے کر دیا، تاکہ ہندستان کو، ان کے وطن کو، دیس کو، انگریز غلام بنالیں! وہ ہندستان ہی کا خزانہ تھا، جو اس قوم کے آگے ڈال دیا گیا کہ وہ جی بھر کر چوس لے ہندستان کے خون کو۔ وہ تمہاری غفلت، تمہاری نااتفاقی تھی، جس نے تم کو غلام بنایا۔

آج صبح یہاں جو تقریریں ہو رہی تھیں۔ میرے عزیز انھیں سُن سُن کر لعنت کی صدائیں بلند کر رہے تھے۔ اس سے میرے دل میں جوش پیدا نہ ہوا۔ لائڈ جارج کا نام لیا جاتا ہے، تو تم چیخ اٹھتے ہو، لعنت! لعنت! لیکن، میرے دوستو، لعنت تمہاری غفلت پر، لعنت تمہاری ایمان فروشی پر، اور لعنت اِس پر کہ تم نے خدا کی چوکھٹ چھوڑ دی اور بندوں کو معبود بنالیا۔

میرے دوستو!

خدا کے اس آسمان کے نیچے اُس ملک کے بسنے والوں سے بڑھ کر کوئی بدبخت ہو سکتا ہے کہ انھیں دو وقت کی روٹی بھی ملتی ہے، تو اس کام کے لیے کہ اپنے بھائیوں کا خون بہائیں

بخاری اور مسلم میں حضرت اُسامہ کا واقعہ موجود ہے! انھیں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ایک خاص موقع پر دشمنوں سے مقابلہ کے لیے بھیجا تھا، جن کی قوتیں اسلام کو نقصان پہنچانے پر لگی ہوئی تھیں۔ حضرت اسامہ نے ایک شخص پر تلوار اٹھائی اور جوں ہی وار کرنا چاہا، وہ کلمۂ توحید پکار اٹھا۔ حضرت اُسامہ نے پروا نہ کی اور اسے قتل کر ڈالا۔ آنحضرت کے سامنے یہ واقعہ بیان کیا گیا، تو حضرت اُسامہ کہتے ہیں کہ سنتے ہی حضور کے قلبِ مبارک پر اس درجہ حزن و ملال چھا گیا کہ فرمایا: اے اسامہ! افسوس تو نے اس آدمی کو مار ڈالا، حال آنکہ اس نے لا الٰہ الا اللہ کہا تھا!

حضرت اُسامہ کہتے ہیں کہ آپ بار بار اسی جملے کو دہراتے رہے اور بار بار اس پر افسوس و غم کا اظہار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ میرے دل میں تمنّا پیدا ہوئی کہ آج کے دن کے پہلے میں مسلمان ہی نہ ہوا ہوتا! اور مجھے حضور کا یہ غم نہ دیکھنا پڑتا!

یہ اظہارِ غم اس لیے تھا کہ ایک ایسے شخص کو قتل کر دیا گیا تھا، جو آخری وقت سہی، مگر مسلمان ہو گیا تھا۔ اُسامہ نے عرض کیا، یا حضرت! اس شخص نے محض جان کے خوف سے کلمہ پڑھا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ خدا کو تو کیا جواب دیگا، جب کلمۂ لا الٰہ الا اللہ خون میں چادر لے کر تیرے سامنے آئیگا۔

اس سے اندازہ کرنا چاہیے کہ ایک شخص نے میدانِ جنگ میں اس کلمے کا اقرار کیا، کب؟ اُس وقت جب اُسامہ کی تلوار اس کے سر پر پہنچ چکی تھی۔ زیادہ سے زیادہ ایک لمحہ وہ مسلمان رہا ہوگا۔ ایک لمحے کا مسلمان، اللہ کے رسول کو اتنا عزیز تھا!

اب مجھے بتاؤ کہ ان بدبخت مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا، جنھوں نے ان مومنوں کو بندوقوں کا نشانہ بنایا۔ جو سو برس سے اسلام کی حفاظت کر رہے ہیں؟ کھلی بات ہے کہ آج انگریزی فوج میں بھرتی ہونا یا اس فوج میں رہنا یا دوسروں کو رکھانا، یہ سب کے سب ملعون اور پھٹکار کے کام ہیں۔ یہ کام مسلمانوں کو مٹانے اور ہندستان کو غلام

کے لیے ایک فتنہ ہو۔ قرآن کے قانون نے فتنہ و فساد کو قتال سے زیادہ سنگین قرار دیا ہے[14]۔ اسی طرح، جس طرح ایک جج، عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر پھانسی کو جائز قرار دیتا ہے۔ قاتل اس کے سامنے اس جرم میں لایا گیا ہے کہ اس نے ایک آدمی کا خون کیا ہے۔ جج حکم دیتا ہے کہ قاتل کو پھانسی پر چڑھا دیا جائے۔ جج بھی قتل کرتا ہے، مگر اس کا یہ قتل کرنا، قتل نہیں ہے، زندگی کا اعلان ہے۔ قصاص میں تو فی الحقیقت زندگی چھپی ہوئی ہے: وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ[15] اگر قاتلوں سے قصاص نہ لیا جائے، اگر ظالموں سے خدا کے بندوں کو نہ بچایا جائے، تو دنیا ظلم کا ایک جہنم بن جائے۔

شریعت نے قتلِ نفس کو سب سے بڑا گناہ قرار دیا ہے جو دنیا میں انسان کر سکتا ہے۔ اور اگر قتلِ نفس کو جائز رکھا ہے تو صرف فتنہ و فساد کے دور کرنے کے لیے، اور جب کہ علاج ہو جائے تو پھر اس علاج کو جائز نہیں رکھا۔

ایسی حالت میں کیونکر ممکن تھا کہ اسلام مسلمانوں کا مسلمانوں کے ہاتھوں قتل جائز رکھتا؟ اسلام نے بلا عذرِ شرعی مسلمانوں کے قتل کو ایک ایسی معصیت بتایا ہے کہ بمنزلہ کفر کے ہے۔ حضرت رسول نے فرمایا، میرے بعد تم کافر نہ ہو جانا، کافروں کا چلن نہ اختیار کر لینا اور کافروں کا چلن یہ ہوگا کہ مسلمان مسلمانوں کی گردنیں مارنے لگیں۔ اسی طرح بخاری اور مسلم کی حدیث میں فرمایا، جس نے مسلمانوں پر ہتیار اٹھایا، وہ مسلمانوں میں باقی نہیں رہا۔ یہ اللہ کے رسول کا قوم ہے اور میں اس کی کوئی تاویل نہ کرونگا۔ اسی طرح قرآن کی نصِ قطعی موجود ہے: وَمَن يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا[16] یعنی جس شخص نے جان بوجھ کر کسی مسلمان کو قتل کیا، تو اس کی جزا یہ ہے کہ ہمیشہ جہنم کے عذاب میں رہے اور اللہ کی لعنت میں مبتلا رہے۔

## ۵

# خطبۂ صدارت

## اجلاس جمعیۃ العلماء ہند

**لاہور، ۱۸ - ۲۱ نومبر ۱۹۲۱ ء**

الحمد للہ الذی جعلنا امۃ التوحید وجعل دیننا دین التوحید و سیاستنا سیاسۃ التوحید و اعز من استقاموا منا علی التوحید و اذل من الخوف من التوحید لیعیدنا کما بدانا الی التوحید انہ ھو یبدئ ویعید وھو الغفور الودود ذوالعرش المجید فعال لما یرید۔

والصلوۃ والسّلام علی محمد خاتم انبیائہ و رسلہ وصفوتہ من خلقہ الذی بعثہ بتوحید الالوھیۃ والربوبیۃ، لیحرّر الخلق من رق العبودیہ للعوالم السماویۃ والارضیۃ، وبتوحید السیاسۃ تکون الشعوب والقبائل امۃ واحدۃ تضمنھا شریعۃ عادلۃ واحدۃ لیطلقھم من قیود الحکومۃ المستبدۃ الجائرۃ و یفکھم من اغلال الجنسیۃ الخاسرۃ فعز باتباعہ المؤمنون وذل باعراضھم المعرضون وانہ لکتاب عزیز لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من

بنانے کے کام ہیں۔ اس لیے اسلام کے قانون میں بہت بڑے کفر کے کام ہیں۔

میرے دوستو!

اگر کراچی کی تجویز میں اسی بات کا اعلان کیا گیا ہے، تو یہ کراچی کی تجویز نہ تھی، بلکہ اسلام کے قانون کا اعلان تھا۔ اب اگر یہ جرم ہے، تو میں تم سب سے پوچھتا ہوں اور ہر اُس شخص سے، جس کے دل میں سچّائی کا چراغ بجھ نہیں گیا ہے کہ کیا اسے اس جرم سے انکار ہوسکتا ہے؟ ہم کو معلوم ہے کہ برٹش گورنمنٹ کے پاس بڑے بڑے جیل خانے ہیں، لیکن کوئی ایسا جیل خانہ نہیں ہے، جس میں برٹش گورنمنٹ، سچائی اور ایمان کو قید کرسکے.....!

اے عزیزانِ ملّت!

آئیے ایک نظرِ تفکر اس منظر پر ڈال لیجیے، جو اس وقت آپ کو دعوتِ نظارہ دے رہا ہے۔ آپ میں بہت سی آنکھیں ایسی ہونگی، جنھوں نے دنیوی جاہ و جلال کے بڑے بڑے منظر دیکھے ہونگے۔ بہت سی آنکھیں ایسی ہونگی، جن کے سامنے بارہا اربابِ حکومت و دولت کی شان و شوکت نے جلوہ فرشیاں کی ہونگی اور عجب نہیں کہ کچھ نظریں ایسی بھی ہونگی، جو حکمرانوں کے درباروں کی ہیبت و جبروت کا نظارہ کر چکی ہوں۔ لیکن آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ کشش و نظر فریبی کے ان تمام سامانوں اور جلووں میں سے کوئی ایک بات بھی یہاں نظر نہیں آتی؛ دولت کی شان و شوکت کا یہاں نام ونشان نہیں ہے، دنیوی حکومت و فرمانروائی کی نمود و نمایش سے یہاں کا گوشہ گوشہ خالی ہے، نہ زریں لباسوں کی آرایش ہے، نہ مسند نشینوں کی زیبایش؛ فقرائے علم کا مجمع ہے، بوریانشینانِ حق کی مجلس ہے، نیازمندانِ صدق و بے نیازانِ دنیا کا جمگھٹا ہے۔ یہاں آپ کو اُس دنیا کی شان و شوکت نہیں مل سکتی، جسے چھوڑ کر اس وقت آپ آرہے ہیں۔ البتہ اگر اقلیمِ حق اور شہرستانِ صدق و صفا کا جاہ و جلال دیکھنا مطلوب ہو، تو انھیں فقرائے علم کے پھٹے پرانے کپڑوں اور پرشکوہ صورتوں کے اندر ڈھونڈ سکتے ہیں۔ یہ ان لوگوں کا مجمع ہے جنھوں نے فقر و فاقہ کو ہمیشہ اپنی دولت سمجھا، زہد و تقویٰ کو اپنی اقلیمِ استغنا کا تاج و تخت بنایا۔ بے نیازی و بے مرادی کے لازوال خزانوں پر ہمیشہ قانع رہے اور عشقِ حق اور پرستاریِ علم کی بوریائے کہنہ پر بیٹھ کر دنیا اور دنیا کی ساری عظمتوں سے بے پروا رہے؛ لیکن باایں ہمہ جن کے کبرِ حق اور سطوتِ الٰہی کا یہ عالم رہا کہ شاہانِ عالم نے ان کے پھٹے پرانے دامنوں پر عقیدت و اطاعت کی آنکھیں ملیں اور تاج و تخت اور حکومت کو ہمیشہ ان کے پائے استقامت کی ٹھوکریں نصیب ہوئیں۔ انھوں نے اللہ کی چوکھٹ پر سرِ نیاز جھکا کر تمام کرۂ ارضی کی عظمتوں اور

خلفہ تنزیل من حکیم حمید۔

جمعیۃ العلماء ہند کا یہ تیسرا سالانہ اجتماع ہے، جس کی صدارت کے لیے آپ نے اس عاجز کو منتخب فرمایا ہے۔ بلاشبہہ یہ ایک بڑی عزت ہے جو ہندستان کی اسلامی آبادی میں کسی خادمِ علم و ملّت کو حاصل ہوسکتی ہے۔ لیکن دنیا کی تمام عزتوں کی طرح ادائے فرض و مسئولیت کا بارِ گراں بھی اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ میں آپ تمام بزرگانِ دین کا شکر گزار ہوں اور امید کرتا ہوں کہ جس طرح آپ کے لطف و کرم نے میری بے بضاعتی کو قبول فرمالیا ہے، اسی طرح آپ کی رفاقت و مساعدت میری کمزوری اور درماندگیوں کے لیے بھی پردہ پوش ہوگی۔ آیئے! عزم و عمل کی اس نازک اور پرآشوب گھڑی میں ہم سب کے دل اُس کارفرمائے حقیقی کے آگے جھک جائیں، جس کے فضل و کرم کے بغیر ہماری کوئی سعی و جستجو کامیاب نہیں ہوسکتی۔ وہ کریم کارسازِ ہماری درماندگیوں اور بیچارگیوں پر رحم فرمائے! ہماری خطاؤں اور لغزشوں کو بخش دے! اپنی رحمتوں اور برکتوں کا دروازہ ہم پر کھول دے! اور اس کی توفیقِ چارہ سازکی دستگیریوں سے ایسا ہو کہ ہم سب کی نیتیں خالص ہم سب کے اعمال صالح، ہم سب کے ارادے راسخ اور ہم سب کے قدم حق و صدق اور صراطِ مستقیم پر قائم و استوار ہوجائیں! رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا

حضرات علمائے کرام!

قبل اس کے کہ ہمارا سفرِ نظر و فکر شروع ہو۔ مجھے ایک لمحہ کے لیے ان عزیزانِ ملّت سے مخاطب ہونے دیجیے، جو آج آپ کی مجلس میں چشمِ نظارہ اور دلِ پرشوق لے کر حاضر ہوئے ہیں۔

ہوئی عظمت دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں، تو صرف انھی کی اطاعت اور پیروی سے:

در سفالیں کاسۂ رنداں بخواری منگرید
کیں حریفاں خدمتِ جامِ جہاں بیں کردہ اند
قدسیاں بے بہرہ انداز جرعۂ کاس الکرام
ایں تطاول بیں کہ با عشاقِ مسکیں کردہ اند[۴]

# اخلاصِ نیّت اور اصابۃ عمل

حضرات!

ہمارا یہ اجتماع اور احتفال ایک جماعتی عمل ہے۔ ہم سب جمع ہوئے ہیں کہ اپنے گم کردہ مقصد کی جستجو کریں۔ اس لیے ضروری ہے کہ حکمتِ الٰہی نے تمام اعمال کی کامیابی کے لیے جو شرائط مقرر کر دی ہیں، وہ اس عمل کی کامیابی کے لیے بھی ضروری ہوں۔ پس ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ مقصد کی جستجو سے پہلے خود اپنے اندر اُن شرائط کی جستجو کر لیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو قوتیں عطا کی ہیں: دماغ دیا ہے، جو ارادہ کرتا ہے؛ اور اعضا و جوارح دیے ہیں، جو اس ارادہ کو فعل میں لاتے ہیں۔ پس ہر انسانی عمل کی کامیابی کے لیے قدرتی طور پر دو باتیں ضروری ٹھہریں: ارادہ کا صحیح ہونا، اور فعل کا صحیح طریق پر انجام پانا۔ دنیا کا کوئی عمل نہیں، جو ان دو شرطوں کے بغیر وجود میں آسکے۔ علوم و اخلاق میں ان ہی دو حقیقتوں کو مختلف ناموں سے تعبیر کیا ہے؛ عزم، منصوبہ، تصور، اعتقاد، وغیرہ۔ سب سے وہی حقیقت مراد ہے، جو افعال سے پہلے وجود میں آتی ہے اور افعال کے لیے بمنزلۂ علّت وسبب کے ہوتی ہے۔ جب تک وہ صحیح نہ ہوگی، فعل بھی صحیح نہیں ہوسکتا۔ یہ بڑا لاہال کی عمارت ہے جس میں ہم سب آج مجتمع ہوئے ہیں۔ یقیناً اس کی دیواریں اور محرابیں ہاتھوں نے چنیں، اور اینٹ گارا بنا کر تیار کی گئیں۔ لیکن کیا یہ سب کچھ وجود میں آسکتا،

رفعتوں کو اپنے سامنے سرنگوں کر دیا تھا:

مبیں حقیر گدایانِ عشق را کیں قوم
شہانِ بے کمر و خسروانِ بے کلہ اند[۳]

یہ سچ ہے کہ آج یہ خود اپنی ہی غفلت و خود فراموشی کی بدولت اپنی وہ رفعت و عظمتِ الٰہی کھو چکے ہیں اور اب ان کی عظمت و جلال کی حقیقت بھی تاریخِ ماضی کا ایک افسانہ بن کر رہ گئی ہے، خدا نے ان کو جس منصبِ عظیم و جلیل پر سرفراز فرمایا تھا، اس کی قدر انھوں نے نہ پہچانی اور خود اپنے ہی ہاتھوں اپنے شرفِ عزت کا خلعت پارہ پارہ کر دیا۔ خدا نے دنیا کو ان کے سامنے گرایا تھا، لیکن افسوس ہے کہ یہ خود دنیا کے سامنے گر گئے۔ خدا نے ان کو صرف اپنی ہی چوکھٹ پر جھکایا تھا، لیکن انھوں نے انسانوں کی چوکھٹوں پر جبہہ سائی کی۔ جب اللہ اور اس کے کلمۂ حق کی خدمت کی جانب سے ان کے دل غافل ہو گئے، تو دنیا نے بھی ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں۔ بلاشبہہ یہ ایک حقیقت ہے۔ لیکن اے نظارگیانِ مجلس! خواہ زمانہ کے انقلابات و حوادث نے انھیں کتنا ہی حقیر و بے مرتبت بنا دیا ہو، لیکن خدارا، آپ انھیں چشمِ حقارت سے نہ دیکھیں، یہی ہیں، جنھوں نے اسی دنیا میں خدا کے رسولوں کی نیابت کی ہے۔ یہی ہیں، جو اُن کی وراثت کے حقدار ٹھہرے ہیں۔ یہی ہیں، جن کے ہاتھوں میں امتِ مرحومہ اور خیر الامم کی قیادت و ہدایت کی باگ رہی ہے۔ یہی ہیں، جو آج تیرہ سو برس سے خدا کی زمین پر اس کے کلمۂ حق کی حفاظت کر رہے ہیں۔ یہی ہیں، جن کی عظمتِ لازوال کے نقوش صفحۂ عالم پر ثبت ہیں، اور جن کی ہیبت و سطوت کے افسانے آج تک زبانِ تاریخ پر جاری ہیں اور پھر یاد رکھیے کہ یہی ہیں، جو باوجود اپنی تمام کوتاہیوں اور درماندگیوں کے اب بھی آپ کی قسمت کے مالک اور آپ کی سعادت و شقاوت کی باگ اپنے ہاتھوں میں رکھتے ہیں۔ آپ کو اگر زندگی مل سکتی ہے، تو انھیں کے ہاتھوں سے؛ اور اگر آپ اپنی کھوئی

قرآن حکیم نے جا بجا انبیاے کرام علیٰ نبینا وعلیہم الصّلوٰۃ والسّلام کا اسوۂ حسنہ ہمیں بتلایا ہے کہ خدمتِ انسانی اور دعوتِ امت کی راہ میں ان کا اعلان کیا تھا! مَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعَالَمِیْنَ[8]۔ حضرت عمر رضی اللہ کی نسبت امام دارمی نے روایت کیا ہے کہ ہمیشہ یہ دعا مانگا کرتے اللھم اجعل عملی کلہ صالحًا واجعلہ لوجہک خالصا ولا تجعل لاحد فیہ شیئًا[9]۔

حضرات! گزشتہ پچاس برس سے ہندستان میں مختلف اغراض ومقاصد سے مجالس واجتماعات کا سلسلہ شروع ہوا ہے اور جہاں ان کا وجود ہمارے تمام اجتماعی اعمال کے لیے بحکم شوریٰ ضروری ہے، وہیں نیّات ومقاصد کے لیے ایک نئی امتحان گاہ بھی پیدا ہوگئی ہے۔ ان مجالس میں شہرت کے ذرائع ہیں، ترفّع کے مواقع ہیں، نمود ونمایش کے مطامع ہیں۔ ان میں تقریریں کی جاتی ہیں، جن کی تحسین میں نعرہ ہاے توصیف بلند ہوتے ہیں؛ ان کے عہدے اور مناصب ہیں، جن کے لیے امیدواروں میں منافست ومسابقت کی کشمکش ہے؛ ان کی صدارت وریاست ہے، جس کی طمع بسا اوقات ہمارے اخلاصِ عمل پر غالب آجاتی ہے۔ پس، ہم سب کا پہلا فرض یہ ہونا چاہیے کہ اپنی اپنی نیتوں اور ولولوں کا کامل راستبازی کے ساتھ مراقبہ کریں، اور ان مہلکاتِ راہ سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہ ہوں۔ ہمارا مقصود نہایت عظیم ہے اور ہم نے اداے فرض اور خدمتِ انسانی کی ایک ایسی راہ میں قدم رکھا ہے، جس سے بڑھ کر ذمہ داری کی انسان کے لیے کوئی راہ نہیں ہوسکتی۔ ہمارے کاندھوں پر اللہ کے رسولوں اور نبیوں کی نیابت کا مقدس بوجھ ہے اور ہمارے سامنے حق کی شہادت اور امّتِ مرحومہ کی احیاء وتجدید کا عظیم الشان کام ہے۔ حیف ہے! اگر ایک ایسے مقدس اور پاک کام میں بھی اپنی نیتوں کو پاک نہ رکھ سکیں اور اغراض واہوا کی ایک ادنیٰ کدورت بھی ہمارے دلوں کو ملوّث کرسکے۔ پس ہر حال میں پہلا کام تصحیح واخلاصِ نیت کا ہے۔ جب تک اس اوّلین منزل سے قدم کامیاب نہ گذر جائیں گے، فوز وفلاح کی

اگر معمار اور انجنیر کے دماغ میں پہلے اس کا صحیح نقشہ ارادہ و تصور کی حالت میں نہ کھنچ جاتا؟ پہلے یہ ہال انجنیر کے دماغ میں بن چکا، تب کہیں جاکر اس زمین پر وجود میں آیا۔ اسی حقیقت کو شریعت نے ایک جامع اصطلاح میں نیّت اور عمل سے تعبیر کیا ہے اور تمام ایمانیات اور عبادات کو ان ہی دو حقیقتوں کی تصحیح و اصلاح سے مرکّب کیا ہے۔ نیت، دماغ کا ارادہ اور دل کا یقین اعتقاد ہے، اور عمل اس کا ظہور ہے، جو ظاہر میں مرتّب ہوتا ہے۔ پس شریعت بتلاتی ہے کہ تمام کاموں کی کامیابی کے لیے پہلی شرط نیت کی تصحیح اور درستگی ہے۔ یہی اصلی جڑ ہے، باقی سب شاخیں۔ انما الاعمال بالنیات[5] اور لکل امرئ ما نوی فمن کانت ھجرتہ الی اللہ و رسولہ فھجرتہ الی اللہ و رسولہ ومن کانت ھجرتہ لدنیا یصیبھا او امرأۃ یتزوجھا، فھجرتہ الی ما ھاجر الیہ[6]۔ فقیہ الامت حضرت امام بخاری نے اسی لیے اس جامع الکلم کو اپنی جامع صحیح کا سرنامہ و عنوان قرار دیا کیونکہ تمام اعمال کی بنیاد اور تمام ایمانیات و عبادات کی اصل یہی قانونِ الٰہی ہے اور اس لیے جو کچھ بھی اس کتاب میں روایت کیا گیا ہے، گویا وہ سب کا سب اسی کی شرح اور اسی اجمال کی تفصیل ہے۔

حضرات!

آپ نے اپنے بزرگانہ لطف و کرم سے جو خدمت میرے سپرد کی ہے، میں اس کی انجام دہی میں خیانت کرونگا۔ اگر اس حقیقت کی طرف سب سے پہلے آپ کو توجہ نہ دلاؤں۔ اس راہ کی سب سے پہلی شرط نیّت کا اخلاص ہے اور ہر اُس قلب پر فلاح و کامیابی کی لذّت حرام ہے، جو اخلاصِ نیّت کی دولت سے محروم ہو۔ اخلاصِ نیّت سے مقصود یہ ہے کہ جو کام کیا جائے، اس سے مقصود صرف ادائے فرض ہو اور اللہ اور اس کی مرضات ہوں، وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ غرضِ نفس اور ذات کی خواہشوں اور آلودگیوں کو اس میں دخل نہ ہو۔

یکون علی السنۃ

لیکن سنّت سے یہاں مراد صرف عبادات و طاعات ہی کی سنن نہیں ہے، بلکہ اعمالِ نبوت کے تمام سنن و نوامیس مقصود ہیں، جن کی راہیں اللہ تعالیٰ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ و السّلام پر کھول دیتا ہے اور وہ ان کے ذریعہ معالجۂ نفوس و تزکیۂ قلوب و تشکیلِ جماعت و تاسیسِ امتِ صالحہ کا عملِ عظیم انجام دیتے ہیں۔ یہ بات کہ انسان کی بھیڑوں کو ایک منظم و مقوّم امتِ صالحہ و عاملہ کی شکل میں بدل دینا اور بکھرے ہوئے اجزا سے ایک متحدہ و مؤتلف قومیت میں ڈھال لینا اور تمام امراضِ اجتماعیہ اور عللِ المعانویہ کی تداوی و طبابت سے عہدہ برآ ہونا ایک خالص عملِ نبوت ہے اور انبیائے کرام کے بعد صرف وہی ورثائے نبوت اس عمل کو انجام دے سکتے ہیں، جو اسوۂ حسنۂ نبوت سے متاسی ہوں، جن پر اللہ تعالیٰ نے حکمتِ نبوت کے اسرار و غوامض کا دروازۂ وراثت و نیابت کھول دیا ہو۔ شرح اس اجمال کی بہت طولانی ہے، یہاں صرف اشارہ مقصود ہے اور ان مطالب کو اپنی بعض تالیفات میں مشرّح لکھ چکا ہوں۔

حضرات علمائے کرام اور ارکانِ جمعیۃ!

اس وقت بہت بڑی آزمایش ہمارے طریقِ عمل کے لیے درپیش ہے۔ ہم نے مدّتوں کی غفلت کے بعد قومی و اجتماعی اعمال کی کشمکش و کشاکش میں قدم رکھا ہے۔ اس لیے سب سے پہلے ہماری نظر آج کل کے مجلسی و اجتماعی کاموں کے طرق و اسلوب پر پڑتی ہے اور تقلید و محاکات کا جذبہ ہمیں بے اختیار ان کی جانب کھینچنے لگتا ہے۔ لیکن میں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ آپ کی راہ ان راہوں سے بالکل الگ ہے اور کتاب اللہ کی ہدایت اور حکمتِ نبوت کی سنّت نے آپ کو دنیا اور دنیا والوں کے تمام گڑھے ہوئے طریقوں اور قاعدوں سے مستغنی کر دیا ہے۔ آپ اس لیے نہیں ہیں کہ انسانوں کے بنائے ہوئے طریقوں کی تقلید کریں، بلکہ آپ کو علم و شریعت اس لیے دیا گیا ہے تاکہ دنیا کی آنکھیں

کوئی منزل رونما نہیں ہوسکتی۔

دوسری شرط اس ارادہ کی صحتِ عمل ہے۔ صحتِ عمل سے یہ مقصود ہے کہ جب ارادہ و اعتقاد صحیح ہوگیا، تواب اس کو فعل میں لانے کے لیے جو طریقے اختیار کیے جائیں، وہ نہجِ حق وصواب پر ہوں، یعنی ہر طرح کی گمرہی، کجروی اور کمزوری و نقائص سے محفوظ ہوں۔ اس بارے میں قرآن حکیم نے ہمیں بتلایا ہے کہ تمام برکاتِ عمل کا اصلی مبدا، و سرچشمہ انبیاء کرام کا اسوہ حسنہ ہے۔ لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ[10] اور قَدْ کَانَتْ لَکُمْ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ فِیْ اِبْرَاهِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ[11] اور پانچ وقت ہم خدا کی سکھلائی ہوئی یہ دعا مانگا کرتے ہیں: اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ[12]۔ سورۂ نساء میں بتلا دیا ہے کہ جماعت مَنْ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ کون ہے؟ فرمایا ہے سب سے پہلا طبقہ ان میں انبیاء کرام کا ہے اَلَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا[13]۔ پس صرف وہی عمل مقبول ہوسکتا ہے، جو وجہ صواب پر ہوا؛ اور وہ نہیں ہے، مگر انبیائے کرام کا اُسوہ۔ جو عمل اس اسوۂ متاسی طریقۂ نبوت سے متحقق اور منہاجِ نبوت کے قدم بقدم نہ ہوگا، وہ کبھی مقبول و مشکور نہیں ہوسکتا۔

حضرات!

یہی وہ شرطیں ہیں جن کی تکمیل پر ہمارے تمام اعمال کی کامیابی بھی موقوف ہے۔ کتنا ہی اخلاصِ نیت ہو لیکن صحتِ عمل کے بغیر عمل کی کامیابی حاصل نہ ہوگی۔ اسی طرح خواہ کتنا ہی بہتر طریق صواب اختیار کیا جائے، لیکن اگر اخلاصِ نیت کی رُو سے عمل خالی ہوگا تو کبھی کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکیگا۔ چنانچہ اسی بنا پر صحابہ و سلف سے آیۂ کریمہ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا[14] کی تفسیر میں منقول ہے (رواہ ابن عساکر و ابن کثیر والسیوطی وغیرہم) ای خلصہ واصوبہ۔ پھر اس کی تشریح کی۔ اذا کان العمل خالصًا ولم یکن صوابًا لم یقبل واذا کان صوابًا ولم یکن خالصًا لم یقبل حتیٰ یکون خالصًا صوابًا والخالص ان یکون للہ والصواب ان

نہیں ہے:

دلآرامی کہ داری دل درو بند دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند[۲۵]

# فقید الملّۃ والدین

حضرات!

اس تمہیدِ بیان کے بعد میں بالکل آمادہ تھا کہ مقاصد و مطالب کا سفر شروع کردوں، لیکن اچانک ایک غمگین حادثہ کی یاد نے میرے قدم روک دیے۔ آپ کی اس جمعیۃ کا گزشتہ اجلاس مجمع علماے ہند کے جس بزرگ و محترم وجود کی رہنمائی و صدارت میں منعقد ہوا تھا، آج وہ ہم میں نظر نہیں آتا اور اس کی موجودگی کی برکتوں سے ہم محروم ہو گئے ہیں۔ میرا اشارہ حضرت مولانا محمود الحسن[۲۶] کی ذاتِ گرامی کی جانب ہے۔ اور میں یقین کرتا ہوں کہ آج آپ میں سے ہر فرد کو ان کی یاد دعوتِ غم دے رہی ہوگی۔ ان کی وفات بلاشبہہ ایک قومی ماتم ہے اور ہم سب کو ان کی عزت میں چند لمحوں کے لیے رک جانا چاہیے۔

حضرات!

مولانا مرحوم ہندستان کے گزشتہ دور کے علما کی آخری یادگار تھے۔ ان کی زندگی اس عہدِ حرمان و فقدان میں علماے حق کے اوصاف و خصائل کا بہترین نمونہ تھی۔ ان کا آخری زمانہ جن اعمالِ حقہ میں بسر ہوا وہ علماے ہند کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہینگے۔ ستر برس کی عمر میں جب ان کا قدان کے دل کی طرح اللہ کے آگے جھک چکا تھا، عین جوارِ حرم میں گرفتار کیے گئے، اور کامل تین سال تک جزیرۂ مالٹا میں نظر بند رہے۔ یہ انھیں صرف اس لیے برداشت کرنی پڑی کہ اسلام و ملّتِ اسلام کی تباہی و بربادی پر ان کا خدا پرست دل صبر نہ کر سکا اور انھوں نے اعداے حق کی مرضات و اہوا کی تسلیم و

آپ کی طرف امید و طلب سے اٹھیں اور آپ کی ہدایت ان کے لیے اتباع و تقلید کا پیام ہو۔ آپ کے پاس اللہ کی کتاب ہے اور اس کے رسول کی سنّت ہے اور ان دو چیزوں سے بڑھ کر اور کونسا مبدأ علم اور سرچشمۂ حکمت ہو سکتا ہے، جو انسانی اعمال کے تمام اصول و فروع کے لیے دنیا میں وجود رکھتا ہو! دنیا میں علم و یقین صرف وحیِ الٰہی اور علوم و اعمالِ نبوّت ہیں۔ اس کے سوا علم و یقین کا اس سارے دنیا کے نیچے وجود نہیں۔ اس کے ماسوا جس قدر بھی ہے، قرآن پکار پکار کر کہتا ہے کہ ظن ہے، تخمین ہے، قیاس ہے، اٹکل ہے، تخرّص اور تلعّب بالرّیب ہے، ظلمت ہے ظُلُمٰتٌ بَعۡضُهَا فَوۡقَ بَعۡضٍ[15] ہے۔ مَا لَهُمۡ بِذٰلِكَ مِنۡ عِلۡمٍ اِنۡ هُمۡ اِلَّا يَظُنُّوۡنَ[16]۔ بَلۡ هُمۡ فِیۡ شَكٍّ يَّلۡعَبُوۡنَ[17]۔ مَا لَهُمۡ بِهٖ مِنۡ عِلۡمٍ اِنۡ يَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغۡنِیۡ مِنَ الۡحَقِّ شَيۡـًٔا[18]۔ اَفَمَنۡ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ كَمَنۡ زُيِّنَ لَهٗ سُوۡٓءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوۡۤا اَهۡوَآءَهُمۡ[19]۔ وغیر ذالک من الآیات والقواطع۔ علم، یقین، برہان، بصیرت، فرقان النّور اور نورٌ علیٰ نور، تو صرف اسی اعلم الخلائق اور اعرف العباد کی درسگاہِ سنّت و حکمت سے مل سکتا ہے، جو شک کی جگہ یقین کا، جہل کی جگہ علم و بصیرت کا، ظن و رائے کی جگہ بیّنہ و حجّت کا، قیاس و تخمین کی جگہ برہان و فرقان کا، اور ان سب سے بھی بڑھ کر یہ کہ نور کا۔ تِبۡيَانًا لِّكُلِّ شَىۡءٍ[20] کا اور عُرۡوَةِ الۡوُثۡقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا[21] کا، تمام نوعِ انسانی کے سامنے اعلان کر رہا ہے اور تمام کرۂ ارضی کو یہ کہہ کر بلا رہا ہے۔ هٰذِهٖ سَبِيۡلِىۡۤ اَدۡعُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيۡرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِىۡ[22] (یوسف) پس اب سوال یہ ہے کہ هَلۡ يَسۡتَوِى الۡاَعۡمٰى وَالۡبَصِيۡرُ[23]۔ اور هَلۡ يَسۡتَوِى الَّذِيۡنَ يَعۡلَمُوۡنَ وَالَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ[24]۔

پس اے علمائے ملّت! آپ کو اپنے طریقِ عمل و نظمِ کار کے لیے صرف کتاب و سنّت ہی کو دستور العمل بنانا چاہیے۔ اور ہر طرف سے آنکھیں بند کر لینی چاہییں۔ دنیا علم و بصیرت کے لیے آپ کی محتاج ہے، آپ کو علم و بصیرت کے لیے دنیا والوں کی احتیاج

اسوۂ حسنہ پیش کیا ہے : لَقَدْ کَانَ فِیْ یُوْسُفَ وَاِخْوَتِہٖٓ اٰیٰتٌ لِّلسَّآئِلِیْنَ۔[۳۲]
حضرت یوسف مصر کے بازاروں میں غلام بنا کر فروخت کیے گئے۔ پھر ان کے سامنے دو راہیں کھلیں : ایک میں اللہ کی معصیت تھی اور ایک میں انسان کا ظلم۔ انھوں نے قید خانے کی مصیبت گوارا کر لی، مگر معصیت کی عیش و آزادی گوارا نہ کی۔ ان کو حق کی فتح اور ظلم کے خسران پر اس قدر یقین و ایمان تھا کہ خوشی خوشی قید خانے چلے گئے اور ان کی روح ہمیشہ اس یقین سے معمور رہی کہ اگر وہ حق پر ہیں تو بالآخر کامیابی و فتحمندی ان ہی کے حصہ میں آئیگی۔ ان کے استغراقِ ایمانی اور ادائے فرضِ دعوتِ حق کا یہ حال تھا کہ قید خانے میں بھی زبان کھلی، تو اپنے نفس کے لیے نہیں، بلکہ حق و ہدایت کی تبلیغ و دعوت ہی کے لیے کھلی۔ یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ۔[۳۳] بالآخر جب فیصلۂ حق و باطل کا وقت آگیا، تو نصرتِ الٰہی ظاہر ہوئی اور جو زنجیریں قید خانۂ مصر میں پہنائی گئی تھیں، وہی بالآخر مصر کا تاج و تخت بن کر نمودار ہوئیں رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْکِ وَعَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ۔[۳۴] اس اسوۂ یوسفی کے بصائر و عبر بیشمار ہیں، مگر زیادہ نمایاں حیثیت جو ہمارے سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ جو شخص تاجِ مصر سر پر رکھنے کا طلبگار ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے زندانِ مصر کے طوق و زنجیر کو اپنے دست و گردن کا زیور بنا لے۔ ہم تختِ مصر کا جاہ و جلال دیکھ کر للچانے لگتے ہیں، مگر زندانِ مصر کی قید و محن فراموش کر دیتے، حالانکہ طلبگارانِ تاجِ آزادی کے لیے پہلی منزل زندان و قید ہی کی ہے :

اے کہ از دیدارِ یوسف غافلی — داغِ یعقوب و زلیخا را نگر[۳۵]

بلاشبہ حضرت یعقوب علیہ السّلام کی چشم پُرشوق ایک مدت کے ہجر و فراق کے بعد جمالِ یوسفی سے روشن ہوئی اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ[۳۶] مگر معلوم ہے کہ

اطاعت سے مردانہ وار انکار کردیا۔ فی الحقیقت انھوں نے علمائے حق وسلف کی سنّت زندہ کردی اور علمائے ہند کے لیے اپنی سنّتِ حسنہ یادگار چھوڑ گئے۔ وہ اگرچہ اب ہم میں موجود نہیں ہیں، لیکن ان کی روح موجود ہے، اور اس کے لیے جسم کی طرح موت نہیں۔

وَمَا دام ذکر العبد بالفضل باقیا
فذلک حی وھو فی التراب ھالک[۲۷]

# اسوۂ یوسفی

حضرات!

ٹھہریے، ابھی ایک اور جماعت بھی ہے جو آپ کے دلوں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے: یہ ہمارے رفقائے طریق ہیں، جو کل تک ہمارے ساتھ دعوت وتبلیغ حق میں سرگرم تھے اور جن کو آج اس جمعیۃ کی صفِ اوّل میں ہونا تھا، مگر وہ یہاں نظر نہیں آتے۔ وہ اس وقت آپ کو کہاں ملیں گے؟ آپ انھیں اس مصرِ فراعنہ میں نہ ڈھونڈیں، جس کی وسیع آبادیاں اگرچہ آلِ فرعون کے لیے عیش کدۂ حکومت وآزادی کا حکم رکھتی ہیں، مگر اسیرانِ بنو اسرائیل کے لیے سرتاسر زندانِ استبداد ہیں۔ وہ آپ کے کنعانِ مدّت کے عزیز گم گشتہ ہیں۔ اگر آپ ڈھونڈتے ہیں، تو اسی یوسف کدۂ عزت واقبال میں ڈھونڈیے، جہاں اگرچہ اَلسِّجۡنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدۡعُوۡنَنِیۡ[۲۸] کے زنجیر وطوق میں گرفتار ہیں مگر فی الحقیقت اِنَّكَ الۡيَوۡمَ لَدَيۡنَا مَكِيۡنٌ اَمِيۡنٌ[۲۹] اور كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوۡسُفَ فِى الۡاَرۡضِ[۳۰] کا تاج وتختِ فتح ومراد بھی اسی زنجیر وطوق سے ڈھالا جارہا ہے قَدۡ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيۡنَا اِنَّهٗ مَنۡ يَّتَّقِ وَيَصۡبِرۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ۔[۳۱]

حضرات! قرآن کریم نے ہمارے سامنے حضرت یوسف علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسّلام کا

وجدت ثنتی یا سعد عنها فزدتنی
جنونا فزدنی من حدیثک یا سعد[42]

حضرات!
اگر اللہ کی محبوبیت، خدمتِ ملت کی لازوال عزت، دعوت و شہادتِ حق کا شرفِ بے مثال، صرف ان ہی زنجیروں اور ہتھکڑیوں کے معاوضے میں مل رہا ہے، تو اس سے زیادہ ارزاں سودا اور کون ہو سکتا ہے! اور ہزار رشک و حسرت ان خوش نصیبوں پر جو اس دولتِ بیکراں اور سعادتِ بے ہمتا سے شادکام ہوئے:

تمنت سلیمی ان نموت بحبها
واھون شیء عندنا ما تمنت[43]

حضرات!
یقیناً یہ وہی وقت ہے جس کی صحاح کی حدیث میں خبر دی گئی۔ الصبر فیھن کالقبض علی الجمر[44] (ان وقتوں میں ایمان و حق پر استقامت ایسی مشکل ہو جائیگی، جیسے انگاروں کو مٹھی میں لینا) سو واقعی آج یہی حال ہو رہا ہے، آج ایمان پر قائم رہنا گویا آگ سے کھیلنا ہے اور اس کے لیے تیار نہیں، اسے چاہیے کہ اس شعلہ زارِ حق پرستی سے ہٹ جائے، اور اسے جانبازانِ ایمان کے لیے چھوڑ دے۔

حضرات!
خدارا، بتلائیے، میں اپنے دل کے خونچکاں زخموں کا مرہم کہاں ڈھونڈوں؟ کون ہے، جو اس درد و غم کا لذت شناس ہو سکتا ہے، جس کو برسوں سے اپنے سینۂ مجروح میں چھپائے ہوئے ہوں؟ جب سوچتا ہوں کہ ہمراہانِ طریق آج قید خانوں میں اسیر ہیں، اور میں نامراد جلسوں کی صدارت کرتا پھرتا ہوں، تو یقین کیجیے کہ مجھے اپنی اس زندگی اور نام نہاد آزادی سے وحشت ہونے لگتی ہے، اور میں لفظوں میں اور صداؤں میں

فتح و مراد کی یہ روشنی اسی سفیدیٔ چشم سے چمکی تھی، جو ایک مدت مدید کے صبر و طلب سے دیدۂ یعقوبی میں پھیل چکی تھی وَقَالَ یَا اَسَفٰی عَلٰی یُوْسُفَ وَابْیَضَّتْ عَیْنَاہُ مِنَ الْحُزْنِ فَھُوَ کَظِیْمٌ [۲] پس راہ کی پہلی آزمائش صبر کامل اور طلب صادق ہی کی ہے۔ جب تک طلبِ یعقوبی حاصل نہ ہو، طلعتِ یوسفی نظر افروز نہیں ہو سکتا:

یامن شکی شوقہ من طول فرقۃ

اصبر لعلک تلقی من تحب غدا [۳۸]

مولانا روم کے اشارات اس مقام پر کیا لطیف و بدیع ہیں:

تو کہ یوسف نیستی، یعقوب باش — روز و شب در گریہ و آشوب باش

پیشِ یوسف نازشِ خوبی مکن — جز نیاز و آہِ یعقوبی مکن [۳۹]

سورۂ یوسف نے یہ حقیقت بھی آشکارا کر دی کہ اگر ایک غلامِ زندانی اپنے حسنِ عمل و استقامت سے ملک کے تاج و تخت کا مالک ہو جا سکتا ہے، تو کیا ایک پوری قوم ایمان و عمل کے غیر مفتوح اسلحہ سے مسلح ہو کر اپنی کھوئی ہوئی حکومت واپس نہیں لے سکتی؟ ولقد احسن القائل۔

ہزار رخنہ بدام و مرا بہ سادہ دلی — تمام عمر در اندیشۂ رہائی یافت [۴۰]

حضرات!

الحمد للہ کہ اسوۂ یوسفی کے اتباع و تأسی کا بابِ سعادت ملک و ملت پر کھل چکا ہے، اور زندانِ ہند میں اب روز بروز آزادگانِ حق کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ ابھی ابھی ہم ملک و ملت کے محبوب و محترم پیشواؤں کو کراچی کے قید خانہ میں وداع کر کے آ رہے ہیں اور آپ کی جمعیۃ کے سرگرم و فداکار ناظم مولانا احمد سعید [۴۱] دہلی سے میانوالی کے جیل میں اس طرح پہنچائے گئے ہیں کہ ان کے جسم پر قیدیوں کا کمبل پڑا ہوا تھا اور ہاتھ ہتھکڑیوں میں بندھے ہوئے تھے:

یہ مقدس دعا مانگی تھی؛ اصحاب کہف سے مقصود چند بندگانِ مومن و مخلص ہیں۔ رَبِّی اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ[48] جو ایک ایسی آبادی میں بستے تھے جس میں ہر طرف ظلم و ضلالت کی حکومت چھائی ہوئی تھی اور کوئی گوشۂ امن و عافیت ایسا نہ تھا جو پیروانِ حق کے لیے مامن و ملجا ہو سکتا۔ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ اللہ پر ایمان رکھتے تھے؛ اور طریقِ حق کو چھوڑ کر بطلان و ضلالت کے آگے سر جھکانا نہیں چاہتے تھے اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى[49] وہ صرف ایک ہی پروردگارِ عالم پر ایمان رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ ہمارا سر اس کے آگے جھک چکا ہے؛ اب وہ کسی ہستی کے آگے نہیں جھک سکتا۔ فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا[50] لیکن یہ حق پرستی ان کے حکمرانِ ملک کے قانون میں سب سے بڑا انسانی جرم ٹھہری، اور جب کہ ان کی آبادیوں میں ظلم کے لیے عیش و آزادی تھی، کفر کے لیے عافیت تھی، گمراہی کے لیے امن تھا، تو ان عشاقِ حق کے لیے صرف جنگلوں کے بھٹ اور پہاڑوں کے غاروں ہی میں امن و نجات کا گوشہ باقی رہ گیا تھا۔ بالآخر وہ آبادی سے نکل کر ایک پہاڑ کے غار میں پوشیدہ ہو گئے۔ اور انسانی آبادی کا دروازہ جن مظلوموں پر بند ہو گیا تھا، ان کے لیے خدا کے پہاڑ نے اپنی آغوش کھول دی۔ فَاْوٗۤا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا[51]

حضرات!

عہدِ قدیم کی یہ ایک داستانِ عبرت ہے جو کلامِ الٰہی نے ہمیں سنائی ہے، اور اس بارے میں قرآنِ حکیم کا اسلوبِ بیان آپ کو معلوم ہے کہ وہ کجکم فیہ بناء ما قبلکم وخبر ما بعدکم وحکم ما بینکم (رواہ الترمذی عن علی وصحہ، ابو نعیم فی الحلیۃ عن عدۃ طرق) ہمیشہ ماضی کو مستقبل کے لیے اور رفتہ کو آیندہ کے لیے بیان کرتا ہے اور اعمالِ انسانی کے یکساں و یک رنگ حوادث و ایام کو بطور تاریخی استقرا کے مرتب کر کے دائمی نتائج و عواقب کی طرف

درد و غم کی کشمکش ظاہر نہیں کر سکتا، جس سے میرا سینہ شق ہونے لگتا ہے۔ اگر احادیث میں روکا نہ گیا ہوتا کہ مومن کو ابتلا کی تمنا نہیں کرنی چاہیے، تو یقین کیجیے کہ میں اس آزادی سے اس قدر اکتا گیا ہوں کہ قید و بند کی آرزو میں کرتا۔ اور اس کے لیے خدا سے دعائیں مانگتا۔ اس پر بھی آپ کو معلوم ہے کہ قطع نظر ایامِ گزشتہ کے پچھلے دو ماہ کے اندر میں اپنی جانب سے بار بار معاملہ کو انتہا تک پہنچا چکا ہوں، مگر نہیں معلوم کیا بات ہے کہ ساری دنیا گرفتار کی جارہی ہے مگر مجھ مشتاق کے نام کوئی پیام نہیں آتا:

دیوانہ براہے رود و طفلی براہے — یاراں! مگر ایں شہر شما سنگ ندارد[45]

حضرات!

مجھے یقین ہے کہ میں آپ کے دلوں کی سچی ترجمانی کرونگا، اگر ان تمام عزیزانِ ملت کو آپ کی جانب سے پیامِ محبت و تشکر پہنچاؤں۔ پس ان سب پر سلام، جو دین و ملت کے نام پر زندان ہائے ہند میں اسیر ہیں؛ ان سب کے لیے ہمارے دلوں کی مخلصانہ تبریک، ہماری روحوں کا لازوال عشق اور اللہ کی خوشنودی و محبت کی ابدی و سرمدی بشارت! وہ وقت دور نہیں ہے، جب یا تو ہم ان تک پہنچیں گے، یا ان کو اپنے حلقۂ محبت و شوق کے اندر موجود پائیں گے۔ عَسَی اللّٰہُ اَنْ یَّاْتِیَنِیْ بِہِمْ جَمِیْعًا اِنَّہٗ ھُوَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ۔[46]

## دعا اصحابِ کہف

حضرات!

ابھی تھوڑی دیر ہوئی ہے کہ میں نے اس خطبہ کو شروع کرتے ہوئے اپنے دعائیہ کلمات کا خاتمہ اس دعا پر کیا تھا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا[47] آپ سے پوشیدہ نہیں ہے کہ یہ دعا بھی منجملۂ ادعیۂ قرآنیہ کے ہے اور سورۂ کہف میں ہمیں بتلایا گیا ہے کہ اصحابِ کہف نے اتباعِ حق کی راہ میں اپنے وطن و دیار کو چھوڑتے ہوئے

کر دیا۔ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَیْکُمْ اٰیَاتٍ مُّبَیِّنَاتٍ وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِکُمْ[62] اور عام طور پر بھی ہر جگہ ایامِ گزشتہ سے نتائج و عبر اخذ کیے ہیں اور انسان کی غفلت و اعراض پر افسوس کیا ہے کہ وہ آنکھ رکھ کر بھی نہیں دیکھتا اور کان رکھ کر بھی نہیں سنتا۔ فَکَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَۃٍ اَھْلَکْنٰھَا وَھِیَ ظَالِمَۃٌ فَھِیَ خَاوِیَۃٌ عَلٰی عُرُوْشِھَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَۃٍ وَّ قَصْرٍ مَّشِیْدٍ، اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَتَکُوْنَ لَھُمْ قُلُوْبٌ یَّعْقِلُوْنَ بِھَا اَوْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِھَا فَاِنَّھَا لَا تَعْمَی الْاَبْصَارُ وَلٰکِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ[63]۔

غرض قرآن حکیم کا مقصد قصص و اخبار سے موعظت و تذکیر ہے۔ آج کل فلسفۂ تاریخ کے بعض جدید مذاہب نے تاریخِ اقوام سے قوانینِ اجتماع اور طبیعتِ اقوام کے اصول اخذ کیے ہیں، لیکن قرآن حکیم نے موعظت و تذکیر کے ایک لفظ میں ہزار حقائق و معارف کے ساتھ اس حقیقت کو بھی آشکارا کر دیا ہے۔ قرآن کریم کا استدلال اس بارے میں یہ ہے کہ جس طرح عالمِ انسانی و مادی کے لیے ایک قانونِ طبیعت ہے اور اشیاء کے خواص و آثار ہیں، جو کبھی ان سے علیحدہ نہیں ہو سکتے: پانی ڈوباتا ہے، آگ جلاتی ہے، زہر کی یبوست ہلاکت کا باعث ہوتی ہے، صالح غذا سے جسم نشو و نما پاتا ہے، ٹھیک اسی طرح عالمِ معنویات کے لیے بھی ایک قانونِ طبیعت ہے؛ اور اشیا کی طرح عقائد و اعمال کے بھی خواص و نتائج ہیں، جو کبھی ان سے الگ نہیں ہو سکتے۔ باطل کے لیے ہمیشہ مٹنا ہے اور حق کے لیے ہمیشہ قائم رہنا ہے۔ اصلاح کا نتیجہ ہمیشہ زندگی ہے۔ ظلم و جور ضرور ہے کہ جب کبھی ہو، بالآخر شکست کھائے اور عدل و صداقت کے لیے ضروری ہے کہ جب کبھی ہو، فتح پائے۔ قرآنِ حکیم نے اسی قانونِ معنوی کو جا بجا سنت اللہ اور فطرۃ اللہ کے لفظوں سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ فی الحقیقت یہی ناموسِ خلقت ہے، آئینِ طبیعت ہے، آگ کی حرارت اور پانی کی برودت سے بھی زیادہ محکم و غیر متبدل۔ اور صرف عالمِ حیوانات ہی میں نہیں، بلکہ کارخانۂ ہستی کے ایک ایک وجود اور ایک ایک

توجہ دلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں بھی مسلسل یا متفرق قصص وایام ماضیہ کا ذکر کیا ہے، صاف صاف واضح کر دیا ہے کہ مقصد جمع تاریخ اور نقل وحکایت نہیں ہے، بلکہ وہ حقیقت ہے، جس کے الگ کر دینے کے بعد تاریخ افسانہ بن کر رہ جاتی ہے اور اس کے وجود میں دنیا کے لیے کوئی سود اور فائدہ باقی نہیں رہتا۔ یعنی موعظۃ وتذکیر، انتباہ واعتبار، واقعات وحوادث کے تسلسل ویک رنگی سے قوانینِ عالم کا ادراک وانکشاف اور گزشتہ سے آیندہ کا استنباط۔ چنانچہ سورۂ ہود میں جس کا محورِ بیان یہی حقیقت ہے فرمایا: وَ كُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ وَجَآءَكَ فِىْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَ مَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ[52]۔ اور عہدِ نوح سے لے کر عہدِ موسیٰ تک کے ایام کا ذکر کر کے نتیجہ نکالا: وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِىَ ظَالِمَةٌ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ[53] سورۂ یوسف کے آخر میں فرمایا: وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ[54]۔ یعنی کائناتِ ہستی کی آیتوں میں سے ایک آیت تو ملکوت السماوات کی ہے جس کا تفکر مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا[55] اور اِنِّىْ وَجَّهْتُ وَجْهِىَ لِلَّذِىْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا[56] کا بابِ عرفان وحقیقت کھولتا ہے اور دوسری قسم آیاتِ ارضیہ کی ہے اور آیاتِ ارضیہ میں سب سے زیادہ نمایاں آیت حوادث وایام کی ہے جو ہمیشہ قوموں اور ملکوں پر گزر چکے ہیں اور اب یا تو صرف ان کی داستانیں زبانوں پر باقی رہ گئی ہیں جَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ[57] یا اطلال وآثار ہیں۔ بہت سے مٹ چکے اور بہت سے ٹوٹی ہوئی دیواروں اور ویران کھنڈروں کی شکل میں عبرت سرائی کے لیے باقی ہیں۔ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ[58] پس اس آیت میں حوادث وایامِ امم کو بھی زمین کی آیتوں اور نشانیوں سے تعبیر کیا گیا اور اسی طرح سورۂ یونس، اعراف، شعرا وغیرہم میں بیانِ واقعات کے بعد فرمایا: فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ[59] فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ[60] اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً وَّمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ[61] سورۂ نور میں بالکل واضح

انھی قلوبِ صافیہ پر کھُل سکتا ہے، جن کو حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے انوارِ کتاب و سنّت کے اکتساب و استنارہ کے لیے مجلّیٰ و مزکّیٰ کر دیا ہو، اور جنھوں نے ظلماتِ قیل و قال اور آرائے رجال و صناعاتِ مخترعۂ جدل و خلاف کو سبلِ متفرقۂ یونانیہ و کلامیہ کے طلسماتِ ظنون اور کارخانہ جاتِ اہوا سے نکل کر فضائے بیکنارِ حکمتِ قرآن و سنّت کی سیر کی ہو۔ وَذَالِكَ فَضْلُ اللهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔[68]

بہر حال قرآن حکیم نے حیاتِ امم کے قانونِ الٰہی کا اعلان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ابتدائے خلقت سے جس طرح حق و عدالت کا ظہور یکساں رہا ہے، اسی طرح بطلان و فساد کا ظہور بھی ہمیشہ یکساں رہا ہے۔ جس طرح حق کی صدائیں ہمیشہ ایک ہی طرح اٹھتی رہیں، اسی طرح ظلم و عدوان کے دعوے بھی ہمیشہ ایک ہی طرح کے ہوئے ہیں۔ جس طرح حق و ہدایت کی شکل و صورت اور خصائص و اوصاف ہر عہد میں ایک ہی طرح کے رہے، اسی طرح بطلان و فساد کا رنگ روپ بھی ہمیشہ ایک ہی طرح کا رہا۔ چنانچہ وہ جا بجا کہتا ہے بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ۔[69] پھر اس استقرار کے بعد وہ اس قدرتی یقین و اذعان کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ جس طرح حق و باطل کی یہ دو زنجیریں متقابل و متوازی ابتدا سے چلی آتی ہیں، ضرور ہے کہ آیندہ بھی جاری رہیں، تاآنکہ حق کی آخری فتحمندی کا وقت آجائے اور بطلان و فساد کی تمام سرکش قوتیں مٹ جائیں۔ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ۔[70] پس ماضی میں جو نتائج نکلے ہیں، ضرور ہے کہ مستقبل میں بھی نکلیں۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوگا کہ حق و باطل، نور و ظلمت، ظلم و مظلومی کا معرکۂ آویزش و کشاکش گرم ہوگا۔ حق کا یہ خاصۂ طبیعت ہے کہ اس کی قوتِ ظلم اور استعدادِ فساد جس قدر بڑھتی جائیگی، اتنا ہی وہ ہلاکت و خسران کے لیے زیادہ تیار ہوتا جائیگا۔ حق کی مظلومی میں بالطبع داعیۂ فتح ہے اور ظلم کی سرکشی میں بالطبع داعیۂ خسران۔ کچھ عرصے تک

ذرّہ تک میں جاری و ساری ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ دنیا میں ہمیشہ اسی قانون کے ماتحت قوموں کو زندگی ملی ہے اور اسی کے ماتحت وہ ہلاک ہوئی ہیں۔ اور چونکہ قانون دائمی ہے اعمال یکساں ہیں، طبیعت غیر مبدّل ہے، خواص لاینفک ہیں، اور نتائج و ثمرات ناگزیر ہیں، اس لیے آیندہ بھی ہمیشہ وہی ہوگا، جو ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔ اور وقت کا امتداد و تغیّر اللہ کے قانونِ مکافات و مجازاتِ عمل کو متغیّر نہیں کر دیگا۔ زہر کھانے سے اگر ایک ہزار برس پہلے آدمی مرجاتا تھا، تو ایسا نہیں ہوسکتا کہ اب زہر کھانے سے زندگی ملے؛ اور اگر آگ پانچ ہزار برس پہلے جلاتی تھی، تو ایسا نہیں ہوسکتا کہ اب اس کے شعلوں میں انگلی ڈالو اور ٹھنڈک اور راحت ملے سُنَّۃَ اللّٰہِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِھِمْ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلاً [۶۴]

چنانچہ اسی بنا پر جابجا گزشتہ حوادث و انقلابات کے نتائج کو سُنَّۃُ الْاَوَّلِیْنَ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، اور آخرین کے لیے اس کو بطورِ دلیل و برہان استعمال کیا۔ انفال میں کہا وَاِنْ یَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِیْنَ [۶۵] اور فاطر میں کہا فَھَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِیْنَ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَبْدِیْلاً وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَحْوِیْلاً [۶۶] اور سورہ نساء میں فرمایا سُنَنَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ [۶۷]

پس سُنَّۃَ اللّٰہِ سے مقصود یہ قانونِ نتائجِ حق و باطل اور آیینِ فلاح و خسرانِ امم ہے نہ کہ مادّی و جسمانی خواص کا قانون، جیسا کہ معتزلۂ جدید اور مفتوحین فتنۂ علومِ جدیدہ نے استدلال کیا ہے۔ ایسا استدلال قطعاً تحریفِ معنوی ہے اور نظمِ قرآن کو بالکل درہم برہم کر دینا ہے۔

حضرات!

آپ حضرات کی نظرِ علم و بصیرت سے یہ حقیقت بھی مستور نہ ہوگی کہ قرآن حکیم نے اس ضمن میں جماعت انسانی کے وحدتِ اعمال، وحدتِ خواص اور وحدتِ نتائج کو ایک عجیب معجزانہ استدلالِ فطری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ البتہ اس کی فقہ و معرفت کا دروازہ صرف

نامرادیاں لوٹ آئی ہیں۔ اور تاریخ عالم کی ساری گزری ہوئی شقاوتیں ایک ایک کر کے پلٹ رہی ہیں۔ سرزمینِ اصحابِ کہف کا جبر و طغیان، فراعنۂ مصر کا ظلم و استبداد، نمارذۂ کلدان کا غرور و تمرّد، اصحابِ مدین کا انکار و اعراض، قومِ عاد کا فسق و عدوان، یہ سب کچھ بیک ظرف و زمان جمع ہو گیا ہے۔ مصر و ایران، بابل و نینوا، یونان و روما، اگرچہ اپنے اپنے وقتوں میں اللہ کی صداقت و عدالت کے مقابلہ کے لیے اٹھ چکے ہیں، لیکن اب ان کی سب کی جگہ اور ان سب سے بڑھ کر یورپ کی مدنیتِ ملعونہ ہے، جو پانچ سال تک آگ اور خون کے سیلابوں میں غرق رہ کر بھی بدستور مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً کا دعویٰ کر رہی ہے۔ اصحابِ کہف کی جماعت چند انفاس پر مشتمل تھی۔ اس لیے پہاڑ کی غار میں انھیں پناہ مل گئی۔ لیکن آج اصحابِ کہف کی سی مظلومی میں چند افراد ہی نہیں، بلکہ آبادیوں کی آبادیاں اور اقلیموں کی اقلیمیں تباہ ہو گئی ہیں، اور لاکھوں کروڑوں بندگانِ الٰہی پر ان کی بستیوں اور شہروں میں امن و آزادی کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ اس لیے نہ تو صحراؤں کے اس قدر گوشے ہیں جہاں انھیں پناہ مل سکے اور نہ پہاڑوں کی اس قدر غاریں ہیں، جو انھیں اپنی آغوش میں لے سکیں۔

حضرات!

آئیے، قبل اس کے کہ ہم اس صفِ ماتم میں بیٹھیں، ذرا اپنی ان بربادیوں پر بھی ایک نظر ڈالیں جن کے ماتم و فغاں سنجی کے لیے آج یہاں جمع ہوئے ہیں۔ تمام کرۂ ارضی کے مشارق و مغارب پر نظر ڈالیے اور ڈھونڈیے کہ پرستارانِ حق و اسلام کے لیے کوئی ایک گوشۂ امن بھی آج باقی رہا ہے؟ سانپوں کے لیے بھٹ ہیں، اور درندوں کے لیے غار ہیں، جہاں امن و بےفکری سے اپنی رات بسر کر سکتے ہیں۔ مگر آہ! پیروانِ اسلام کے لیے آج تمام کرۂ ارضی میں چار بالشت زمین بھی امن و عافیت کی باقی نہیں رہی۔ گویا اسلام کی پوری تیرہ صدیوں کی تاریخ اب محض ایک افسانۂ ماضی اور حکایتِ رفتہ ہے۔ اوراقِ دفاتر میں پڑھ لی جا سکتی ہے،

کشمکش جاری رہیگی۔ اور فساد کو تکمیلِ مادۂ خسران کے لیے ایک خاص زمانے تک مہلت دی جائیگی۔ اس مہلت کو قرآن حکیم نے جابجا تَمَتَّعُ اِلیٰ حِیْنٍ اور تربص و انتظار و اجل سے تعبیر کیا ہے۔ اور اس خاص وقت کو جو فرمانِ الٰہی کے ماتحت ظہور نتائج کے لیے مطلوب ہوتا ہے، اجلِ مقدر اور اجلِ مسمّیٰ کہا ہے۔ وَیَسْتَعْجِلُوْنَکَ بِالْعَذَابِ وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّی لَّجَآءَھُمُ الْعَذَابُ[1] اور سورۂ یونس میں فرمایا وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی ھٰذَا الْوَعْدُ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ قُلْ لَّآ اَمْلِکُ لِنَفْسِیْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ لِکُلِّ اُمَّۃٍ اَجَلٌ اِذَا جَآءَ اَجَلُھُمْ فَلَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَۃً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ[2] پس جب وہ وقت آجائیگا اور مادۂ فساد تکمیل تک پہنچ کر انفجار کے لیے تیار ہوجائیگا، تو پھر حق و باطل کا آخری فیصلہ ظہور میں آئیگا۔ حق کی مظلومی و درماندگی فتح پائیگی۔ باطل کی مغرور طاقت و سطوت کچھ کام نہ دیگی۔ قرآن حکیم کی اصطلاح میں اس آخری فیصلہ کا نام قضا بالحق ہے اور اب لوگوں نے اسے انتخابِ اصلح اور بقائے امثل کے نام سے بھی پکارنا شروع کیا ہے۔ فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰہِ قُضِیَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ ھُنَالِکَ الْمُبْطِلُوْنَ[3]۔

حضرات!

اصحابِ کہف کو اگر اپنے عہد کے ضلالت و طغیان سے درماندہ و لاچار ہوکر پہاڑ کی غار میں پناہ لینی پڑے، تو گو وہ عہد جاچکا ہے لیکن اس عہد کی ضلالت و طغیان اس دنیا سے رخصت نہیں ہوئی ہے۔ آج بھی عشاقِ حق کے عزم و ثبات کے لیے ایک ویسی ہی آزمایش درپیش ہے۔ آج بھی ظلم کی حکومت ہے، بطلان و فساد کی حکمرانی ہے جور و طغیان کا دور دورہ ہے اور اصحابِ کہف کی بستی کی طرح صرف ایک ہی قطعۂ ارضی نہیں، بلکہ تمام کرۂ ارضی کی خشکی و تری حق و عدالت سے محروم ہوگئی ہے اور خدا کی زمین پر اس کے مظلوم و درماندہ بندوں کے لیے کوئی گوشہ امن و عافیت باقی نہیں رہا ہے۔ ظَھَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا کَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ[4] گویا زمین کی تمام پچھلی

الا نفرس ابیات لہا ھم    و اما علی الخیر انصار و اعوان
ما ذا لتقاطع فی الاسلام بینکم    و انتموا یا عباد اللہ اخوان
لمثل ھذا یذوب القلب من کمد
ان کان فی القلب و ایمان اسلام [79]

حضرات!

یہ دعا اصحابِ کہف نے اس وقت مانگی تھی، جب ان کی آبادی کے دروازے ان پر بند ہو گئے تھے۔ آئیے، آج ہم اسی دعا کو وسیلۂ قبولیت بنائیں، جب کہ صرف ایک ہی آبادی کے نہیں، بلکہ تمام دنیا کے دروازے پیروانِ حق پر بند ہو گئے ہیں، اور ہر طرف ظلم و فساد کی حکومت پھیل گئی ہے۔ اس دعا میں رحمتِ الٰہی کی طلب ہے اور ارشادِ امر کا سوال ہے۔ رحمت، اللہ کی وہ وصفِ کاملہ ہے جو ہر طرح کے فیضان و بخشایش کا دروازہ کائنات ہستی پر کھولتی ہے اور رشدِ امر سے مقصود ہر طرح کی ہدایت و رہنمائی ہے، جو حصول و انجاحِ مقاصد کے لیے مطلوب ہو۔ پس گویا اعجازِ بلاغتِ قرآنی نے ان چند لفظوں کے اندر ان تمام برکات و مقاصد کو جمع کر دیا ہے جن کی نوعِ انسانی محتاج ہو سکتی ہے۔ اس کو رحمت کی ضرورت ہے اور جو اس کی درماندگیوں اور خطاؤں کو بخش دے؛ اور ارشادِ امر کی ضرورت ہے تاکہ صحیح راہِ کامیابی پر چل کر کامران و فتحمند ہو۔ ان ہی دو چیزوں کے ہم بھی آج محتاج و آرزومند ہیں۔ ہم نے خطائیں کی ہیں۔ پس اس کی رحمت مطلوب ہے، جو بخش دے۔ ہم نے راہِ عمل گم کر دی ہے اور رشد و ہدایت کے سائل ہیں، تاکہ صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جائیں: رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنۡ لَّدُنۡكَ رَحۡمَةً وَّهَيِّئۡ لَنَا مِنۡ اَمۡرِنَا رَشَدًا [80]

حضرات!

اب میں جمعیۃ العلماء کے وجود و مقاصد کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ اس سلسلے میں دو اہم مطالب سامنے آتے ہیں۔ ایک جمعیۃ العلماء کے مقاصد و وظائف کا مبحث ہے، جو اس

مگر بلاد و اقالیم ہیں دیکھی نہیں جا سکتی :

کان لم یکن بین الحجون الی الصفا
انیسٌ ولم یسمر بمکۃ سامرٌ[۷۷]

حضرات!
معلوم نہیں کہ آپ کے کانوں کا کیا حال ہے، مگر میں اپنے نامراد سامعہ کو کیا کروں جس سے ہر لمحہ ہر آن داشر الغوابۃ دنیا کی جگر دوز صدائیں ٹکرا رہی ہیں، اور میری مجروح آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ کفر و ظلم کے غلبہ و قہر سے ارضِ الٰہی کا ایک ایک چپّہ چیخ رہا ہے۔ پرستارانِ حق کی غربت و بیکسی ہر طرف سر پیٹ پیٹ کر ماتم کر رہی ہے اور فضائے کائنات کا ایک ایک ذرّہ قائمِ حق کو ڈھونڈ رہا ہے اور حامیانِ ملّت کو پکار رہا ہے۔

یا ناعی الاسلام قم فانعہ
قد زال عرف و بدا منکر[۷۸]

شیخ سعدی نے قتلِ بغداد کا مرثیہ لکھا اور ابو البقا نے تباہیِ اندلس پر ماتم کیا۔ وقت آگیا ہے کہ اس عہد کا ایک نیا ابو البقا اندلس و بغداد کا نہیں بلکہ تمام عالمِ اسلامی کا مرثیہ لکھے :

| | |
|---|---|
| اصابہا العین فی الاسلام نارتزات | حتیٰ خلت منہ اقطار و بلدان |
| تبکی الحنیفۃ البیضاء من اسف | کما بکی لفراق الالف ھیمان |
| علی دیار من الاسلام خالیۃ | قد اقفرت ولھا بالکفر عمران |
| حیث المساجد قد صارت کنائسما | فیھن الا نواقیس و صلبان |
| حتی المحاریب تبکی وھی جامدۃ | حتی المنابر ترثی وھی عیدان |
| یا غافلا ولہ فی الدھر موعظۃ | ان کنت فی سنۃ فالدھر یقظان |
| اعندکم نبأ من اھل اندلس | فقد سری بحدیث القوم رکبان |
| کم یستغیث بنا المستضعفون وھم | قتلی و اسری فما یھتز انسان |

ہو گئے۔ ہندستان میں سر سید احمد خاں[81] مرحوم اور ان کے متبعین و مقلدین، ٹرکی میں سلطان محمود خاں[82] اور اس کے عہد کے وزرا، مثلاً فواد پاشا[83] ۔ مصر میں محمد علی پاشا[84] ۔ ٹیونس میں خیر الدین[85] صاحب "المسالک الاقوام" اور بیرم تونسی[86] صاحب "صفوۃ الاعتبار" وغیرہم اسی گروہ میں محسوب ہیں۔ انھوں نے اصلاح و تغیر کے لیے صرف یورپ کی تقلید، علومِ حدیثہ کی ترویج، عادات و خصائلِ فرنگ کے تخلق و تشبہ اور ان کے ذہنی و عملی تعبد و اطاعت کو اساسِ کار و اعتقادِ اصلاح و قرار دیا

دوسرا مذہب "اصلاحِ سیاسی" کا مذہب ہے۔ یہ وہ جماعت ہے جس کو اسلامی ممالک کے پولیٹکل زوال اور سیاسی اختلال کا حد درجہ استغراق ہوا۔ اس لیے اس کی نظر اس طرف گئی کہ سب سے مقدم سیاسی اصلاح ہے۔ جب تک یہ ظہور پذیر نہ ہو، کوئی سعی سود مند نہیں ہو سکتی۔ ممالکِ اسلامیہ میں اسی مذہبِ اصلاح کے سب سے بڑے داعی مرحوم سید جمال الدین اسد آبادی[87] تھے اور ٹرکی میں مدحت پاشا[88] ابو الاحرار کی دعوت بھی اسی مسلک میں محسوب ہے۔

تیسرا مذہبِ اصلاح، "اصلاحِ دینی و اسلامی" کا ہے، اور اگرچہ اس مذہب کے دعاۃ بمقابلۂ مذہبِ سابقہ قلیل رہے، مگر فی الحقیقت مسئلۂ اصلاح میں یہی گروہ اصحابِ رشد و ہدایت اور سالکینِ جادۂ اقتصاد و حق کا رہا ہے۔ بحکمِ حدیثِ غربت[89] "قلیل فی ناس سوء کثیر" گو ان کی تعداد قلیل اور ان کی صدائیں ضعیف رہیں، لیکن زمانہ روز بروز ان کی دعوت سے قریب تر ہوتا گیا اور مذاہبِ سابقہ کی نامرادیوں نے بہت جلد اس مسلک کی صحت و حفاظت دنیائے اسلام پر آشکارا کر دی۔

## اصلاحِ دینی کے مبادیات

اس آخری مسلکِ اصلاح کی بنیاد حسبِ ذیل مبادی و مقدمات پر تھی اور انھی کی دعوت و

وقت تک مسائلِ وقت کے انہماک کی وجہ سے بحث و نظر میں نہ آسکا۔ دوسرا موضوع مسائلِ حاضرہ کا ہے۔ میں کوشش کرونگا کہ آرائشِ بیان و تزئینِ عبارت سے بالکل قطع نظر کر کے نفسِ مطالب بطریقِ اشارات گوش گزار کر دوں۔

# مسئلۂ احیاء و تجدیدِ ملّت

حضرات!

جمعیۃ العلماء کا قیام فی الحقیقت مسئلۂ احیاء و تجدیدِ ملّت کی ایک فرع ہے، جو گزشتہ ایک صدی سے تمام عالمِ اسلامی میں دعاۃ اصلاح و ترقی کے لیے مبحثِ افکار و معرکۂ آراء و نظارہ رہ چکا ہے۔ مسئلۂ احیاءِ ملّت کا مقصود واضح ہے، یعنی مسلمانوں کو موجودہ پستی و ادبار سے نکالنے اور ان کے عزّ و اقبالِ رفتہ کو واپس لانے کے لیے کیا اسباب و وسائل اختیار کرنے چاہییں؟ اور راہِ عمل و فوز کیا ہو سکتی ہے؟ اس بارے میں ابتداء سے تین مختلف مذاہبِ اصلاح ہیں۔ جو ہندستان، مصر، ٹرکی، ایران، ٹیونس اور بلادِ ترکستان و قفقاز کے داعیانِ اصلاح نے اختیار کیے ہیں۔

پہلا مذہب وہ ہے جسے "اصلاحِ افرنجی" سے موسوم کرتا ہوں۔ گزشتہ صدی یورپ کے تمدن و صنائع کے ظہور و اعلان کا عہد تھا۔ یورپ کی پستی نہایت تیزی کے ساتھ گزر رہی تھی۔ جب یورپ کے تمدّن کا ہوشربا جلوہ اسلامی ممالک کے سامنے بے نقاب ہوا، تو دو مختلف اثرات دو مختلف جماعتوں پر مترتّب ہوئے۔ غالب جماعت نے تو اپنی غفلت و جمود کی وجہ سے اس انقلاب و تغیّر کی طرف نظر ہی نہ اٹھائی۔ لیکن ایک جماعت اربابِ بنیش و خبر کی بھی تھی جس نے فوراً تغیرِ احوال محسوس کیا۔ لیکن جیسا کہ طبیعتِ بشری کا خاصا ہے، اپنی پستی و کمزوری اور جلوہ کی نظر فریبی و ہوشربائی کی وجہ سے بہ اوّل نظر مرعوب و مسحور ہوگئی، اور مقابلہ و مقاومت کی جگہ تقلید و اطاعت کے جذبات اس میں پیدا

علی الھدی المستقیم۔ (قالہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ) اور تنزل و فساد کا عہد اسی وقت سے شروع ہوا جب کہ اقوام ماضیہ مغضوبہ کے علوم و اعمال بشکل علوم دخیلہ و اعمالِ بدعیہ ان میں رائج ہوئے۔ ایک ہی علت کے دو مختلف نتائج نہیں نکل سکتے۔ پس اگر اب بھی مسلمان اپنے عروجِ رفتہ کو دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں، تو اس کی صرف ایک ہی راہ ہے۔ اس کے علاوہ اور جس قدر راہیں بھی کھلی ہونگی، گمرہی و فساد کی ہونگی۔ یعنی علم و عملِ شریعت کا احیاء، اور ترک و ہجرِ شریعت کا انسداد۔

۳ اس مسلک کی بنیاد اس ایمانی اور اعتقادی حقیقت پر بھی تھی کہ شریعتِ اسلامیہ آخری و اکمل شریعت ہے اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ [97] اور اس کا وعدہ ہے لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ [98] یقیناً اس وعدہ کا ابھی ظہور نہیں ہوا۔ پس ضرور ہے کہ وعدۂ الٰہی ظاہر ہو اور اس لیے مستقبل کے لیے اگر کوئی راہِ فوز و فتح ہو سکتی ہے، تو وہ صرف دعوتِ شریعت اور احیائے عمل بالقرآن ہی ہے۔

۴ مسلمانوں سے ابتداء واتّباع شریعتِ مہجور نہیں ہوا۔ مگر علمائے اسلام کی غفلت و اعراض سے۔ شریعت کے علم و عمل کے وہی حامل و مبلّغ تھے۔ اور امت کی حیاتِ شرعیہ کا تمام دار و مدار ان کی حیاتِ علمی و عملی پر تھا۔ جب کتاب و سنت کا ترک و ہجر، تفرقہ و تشتّت، وحدت اور سُبُلِ متفرقہ کا شیوع، اختلاف و تحزّب کی عصبیت، علوم محدثہ کا استغراق، حبِ جاہ و ریاست کا استیلاء، فریضۂ دعوت الی الخیر و امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے تغافل، اہوائے سلاطین و امراء کا اتباع، اجتہادِ فکر و نظر کا فقدان، غرضکہ منصبِ نیابتِ نبوت کا ضیاع اور احبار و رہبانِ اہلِ کتاب کے متذکرۂ قرآن مفاسد کا بحکم یاتی علی امتی ما اتی علی بنی اسرائیل حذو النعل بالنعل [99] اوکما قال۔ ظہور و احاطہ خود طبقۂ علماء میں بحدِ کمال پہنچ گیا، تو اس کا لازمی نتیجہ امت کی ہلاکت تھا اور وہ ظہور میں آیا وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا۔ [100]

تبلیغ کے لیے ۱۹۱۲ء میں میں نے الہلال[9] جاری کیا تھا۔

۱ اسلام کے نظمِ شریعت میں دین و دنیا کی تقسیم نہیں ہے۔ اسلام نے شریعتِ الٰہی کو نوعِ انسانی کی تمام سعادت و ہدایت کا کفیل و سرچشمہ قرار دیا ہے اور مسلمانوں کی سیاسی، علمی، اخلاقی، قومی و مدنی زندگی کی بنیاد صرف ایک ہی حقیقتِ جامعہ پر ہے یعنی شریعتِ اسلامیہ اور کتاب و سنّت پر۔

۲ مسلمانوں کی قومیتِ صادقہ کی بنیاد صرف شریعت کا علم و عمل ہے۔ شریعت نے انھیں بتلایا تھا کہ دنیا میں سب سے بڑی قوم وہی ہیں، وہی خیر الامم ہیں[91] وہی خَيْرُ الْبَرِيَّةِ[92] ہیں، وہی شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ[93] ہیں، وہی شہداء اللہ فی الارض ہیں[94]۔ ان کے عروج و سعادت کی علّت صرف یہ تھی کہ قرآنِ حکیم اور سنّتِ رسول کو انھوں نے اپنا دستورالعمل و حیات قرار دیا تھا۔ قرآنِ حکیم کی نسبت صاحبِ قرآن کا اعلان تھا: انّ اللہ یرفع بھذا الکتاب اقوامًا ویضع بہ آخرین[95] (رواہ مسلم) اللہ تعالیٰ اس کتاب کی ہدایت سے قوموں کو اٹھائیگا اور یہی ہے جس کو ترک کر کے قومیں گرینگی اور ہلاک ہونگی۔ اور روایت حضرت علی عند ترمذی و ابونعیم والطبرانی فی الکبیر میں فرمایا: وھو الفصل لیس بالھزل من ترکہ من جبار قصمہ اللہ ومن ابتغی الھدی فی غیرہ اضلہ اللہ الی ان قال من قال بہ صدق ومن عمل بہ اجر، ومن حکم بہ عدل، ومن دعا الیہ ھدی الی صراط المستقیم۔[96] پس جب مسلمانوں نے قرآن وسنت کا علم و عمل ترک کر دیا، تو اقبال و عروج نے بھی ان سے کنارہ کشی کر لی۔ یہ مسلّم اور حقائقِ تاریخی میں سے ہے کہ مسلمانوں کے عروج و اقبال کا سب سے بہتر وارفع زمانہ وہی تھا، جب بجز کتاب و سنّت کے علم و عمل کے اور کوئی تعلیم ان کی رہنما نہ تھی، یعنی عہدِ صحابۂ کرام و خلفائے راشدین اولٰئک اصحاب محمد ابرّ ھذہ الامۃ قلوبًا واعمقھا علمًا واقلھا تکلفًا، قوم اختارھم اللہ لصحبۃ نبیہ واقامۃ دینہ فاعرفوا لھم حقھم تمسّکوا بھدیھم، فانھم کانوا

نہضت کے لیے کی گئیں۔ شیخ محمد عبدہ نے اپنے تمام آخری ایامِ حیات علمائے ازہر کے انتباہ و بیداری میں صرف کر دیے۔ شیخ محمد جزائری نے علمائے جامعۂ زیتونیہ، تیونس کی ایک جمعیۃ اصلاح قائم کرنے کے لیے مدت العمر آہ و فغاں کی۔ شیخ عبدالرحمٰن کواکبی نے سجل جمعیۃ ام القریٰ لکھ کر علمائے اسلام کی ایک بین الملی جمعیۃ کی تحریک کی۔ ہندستان میں پہلے ندوۃ العلما اور پھر جمعیۃ الانصار دیوبند قائم ہوئی۔ لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک کوئی سعی و تدبیر بھی سود مند اور کامیاب نہ ہوئی۔ اس ناکامی کے بھی واضح و بیّن اسباب ہیں۔ لیکن میں بخیالِ اختصار ان کی تشریح نہیں کروں گا۔ بعض مساعی کے لیے استبدادِ حکومت مانع ہوا، بعض مساعی باہمدگر اختلافات و نزاعات کی وجہ سے ناکام رہیں۔ بعض تدابیر میں علمائے سوء کی مقاومت نے خلل ڈالا۔ اور اکثر کا یہ حال رہا کہ خود نفسِ دعوت و تدبیر کے اندرونی نقائص کامیابی میں حائل ہو گئے۔ ازآنجملہ سب سے بڑا نقص ان تمام دعوتوں میں یہ رہا کہ گو اصلاً اصلاحِ دینی کی قسم میں داخل تھیں، لیکن بمصداق خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَّآخَرَ سَيِّئًا[۱۲] جو طریقِ عمل اختیار کیا گیا تھا وہ ٹھیک ٹھیک نہجِ قویم و مستقیم پر نہ تھا، یعنی منہاج و اسوۂ نبوت کے علوم و اعمال کو ان میں غلبہ و احاطہ حاصل نہ تھا۔ اور کتاب و سنّت کی دعوتِ خالص و بے آمیزش کی جگہ موجودہ عہد کے طرقِ محدثہ نے ان میں راہ پالی تھی؛ اور ازآنجملہ ایک بڑا سبب ان کی ناکامی کا یہ بھی ہوا کہ اصول کی جگہ فروع کا استغراق داعیوں پر چھا گیا۔ اور یہ حقیقت ان پر منکشف نہ ہوئی کہ راہ کی ہدایت و نہایت کا تعیّن کیونکر کرنا چاہیے۔ پس ایسا ہوا کہ جو طاقت اصل پر خرچ کرنی تھی، وہ بعض شاخوں پر صرف ہو گئی۔ مثلاً مسئلہ اصلاحِ نصابِ تعلیم وغیرہ۔ اور اس طرح تمام کارخانۂ دعوت درہم برہم ہو گیا۔ معہٰذا اس کارخانۂ حیات اور کارگاہِ مکافات و مجازات کا کوئی عمل بھی بکلّی ضائع نہیں جاتا، جس کی بنیاد اعتقاد

پس اب اگر اصلاحِ حال کی کوئی راہِ صحیح ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ علمائے امت کے طبقہ میں احساسِ حال کی تبدیلی پیدا ہو اور وہ اپنے منصبِ عظیم کو ازسرِ نو سنبھال لینے کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ اور اس طرح علم و عملِ شریعت کا احیاء صورت پذیر ہو۔

ترکستان و بلادِ روسیہ میں شیخ صدرالدین، مصر میں شیخ محمد عبدہٗ، شام میں شیخ عبدالرحمٰن کواکبی اور شیخ کمال الدین قاسمی وغیرہم، اسی مسلکِ اصلاح کے داعی تھے۔ مگر سلطان عبدالحمید مرحوم کے استبداد نے مہلتِ عمل نہ دی اور ان کے افکار نفاذ و عمل تک نہ پہنچ سکے۔

## ایک چوتھا مذہب

ان تین جماعتوں کے علاوہ ایک چوتھی جماعت بھی ہمیشہ رہی ہے۔ اور اب بھی موجود ہے لیکن اس جماعت کا کوئی ایجابی مسلک نہیں ہے؛ محض سلبی وجود ہے یعنی اربابِ جمود و غفلت کا طبقہ۔ اس جماعت کو اصلاح سے انکار ہے اور ضرورتِ سعی و انقلاب سے گریز۔ اور پھر انہی میں وہ دعاتِ فتن، علماءِ سوء و مشائخِ دنیا و دجاجلۂ فساد بھی ہیں، جو ہر صدائے حق کے جحود اور ہر سعیِ اصلاح و عمل کے انکار و مقاومت کو اپنا فریضۂ علم و عمل سمجھتے ہیں۔ میں نے ان کا ذکر نہیں کیا کیونکہ الحمد للہ ان کی کوئی مقاوم ہستی باقی نہیں رہی ہے۔ اَسْتَحْوَذَ عَلَیْہِمُ الشَّیْطَانُ فَاَنْسٰھُمْ ذِکْرَ اللّٰہِ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّیْطَانِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّیْطَانِ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔[101]

## اصلاحِ دینی کے گزشتہ ایّام

حضرات!

اس مسلکِ اصلاح کے مطابق اگرچہ ممالکِ اسلامیہ میں متعدد کوششیں علماء کے اجتماع و

کے چار سال بھی اسی کے فراق میں کاٹے۔[104]

یدذکرنی طلوع الشمس صخرا　　　واذکرہ لکل غروب شمس[105]

پس اے بزرگانِ ملّت!

اگر آج علمائے امّت کی یہ نہضتِ مبارکہ جمعیۃ العلماء کی شکل میں طالع و نظر افروز ہوئی ہے، تو مجھے کہنے دیجیے کہ یہ میرے دہ سالہ سوالوں کا جواب ہے، میری تمنّاؤں اور آرزوؤں کا ظہور ہے، میری فریادوں اور التجاؤں کی قبولیت ہے۔ میرے لیے مَاتَشْتَهِيهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ۔ اور یقیناً میری امیدوں کے قدیم خواب کی تعبیر ہے۔ هٰذَا تَاْوِيلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّي حَقًّا:[107]

کارِ زلفِ تست مشک افشانی امّا عاشقاں
مصلحت را تہمتے برآہوئے چیں بستہ اند[108]

# جمعیۃ العلماء کا قاعدۂ اساسی

حضرات!

جمعیۃ العلماء کا قیام دراصل اسی آخری مذہبِ اصلاح و احیاء کا ظہور ہے۔ اور اس کی تاسیس حضرت امام مالک کے اس اعتقادی قاعدہ پر ہوئی ہے کہ لا یصلح اٰخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولھا۔ اس امّت کے آخری دور کی اصلاح بھی اسی چیز سے ہوگی، جس سے ابتدائی عہد کی ہوئی تھی، اور یہ قاعدہ ٹھیک حضرت صادق مصدّق کی اس خبر کے مطابق ہے جو مشہور حدیثِ غربت میں دی گئی۔ بدء الاسلام غریبا وسیعود کما بدأ[109] (رواہ مسلم) کہ اسلام کے لیے دو عہدِ غربت ہیں: ایک غربتِ اولیٰ اور ایک ثانیہ۔ پس ضرور ہے کہ جو کچھ غربتِ اولیٰ میں ہوا، غربتِ ثانیہ میں بھی ہو۔ اور جس چیز نے غربتِ اولیٰ کو فتح و اقبالِ اوّل سے بدل دیا ہے، وہی چیز اس غربتِ ثانیہ کو بھی

صحیح پر ہو۔ یہ کوششیں اگرچہ خود راہ نہ پا سکیں، لیکن انھوں نے آنے والے عہد کے لیے بہت کچھ راہ صاف کر دی اور کم از کم ان میں سے ہر سعی کا یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ دعوتِ اصلاحِ دینی اور حرکت و نہضتِ علمائے ملّت کے لیے وقت کی استعداد روز بروز بڑھتی گئی۔

## دعوتِ الہلال

حضرات!

مجھے امید ہے کہ آپ مجھے خود ستائی اور خود فروشی کا الزام نہ دیں گے، اگر میں بطور تحدیثِ نعمت اس موقع پر دعوتِ الہلال کا بھی ذکر کروں۔ عالمِ اسلامی کے ماضیٔ قریب میں اصلاحِ دینی اور انتباہ و انبعاثِ علمائے ملّت اور احیاء و تجدیدِ اُمّت کی جو دعوت ان تمام پچھلی دعوتوں کے طریقوں اور اسلوبوں سے بالکل مختلف اسلوب پر بلند ہوئی ہے، وہ دعوتِ الہلال ہے۔

آج آپ کی یہ مقدس و مبارک جمعیۃ العلماء جس مقصد کی جستجو میں منعقد ہوئی ہے میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ یہ وہی یوسفِ مقصود ہے، جس کے فراق میں ۱۹۱۱ء سے متصل وا اسفا علیٰ یوسف[۱۰۳] کی فغاں سنجی کر رہا ہوں اور جس کے لیے میں نے الہلال مرحوم کے صفحوں کو کبھی اپنے چشمِ خونیں کے آنسوؤں سے رنگا ہے، اور کبھی اس کے سواد و حروف کے اوپر اپنے دل و جگر کے ٹکڑے بچھا دیے ہیں۔ ۱۹۱۱ء سے لے کر آج تک یہ مقصد میرے دل کی تمناؤں اور آرزوؤں کا مطلوب اور میری روح کی عشق و شیفتگی کا محبوب رہا ہے۔ خدا کی کوئی صبح مجھ پر ایسی طلوع نہیں ہوئی، اس مقصد کی طلب سے میرا دل خالی ہوا ہو، اور کوئی شام مجھ پر ایسی نہیں گزری، جب میں نے اس کی تمنا میں اپنے بسترِ غم و اندوہ پر بیقراری کی کروٹیں نہ بدلی ہوں۔ میں نے اپنی آزادی کی تمام فرصت اسی کے عشق میں بسر کی اور نظر بندی و قید

هٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللَّهُ[114] ٱلْحَمْدُ لِلَّهِ ٱلَّذِى هَدَىٰنَا لِهَـٰذَا

# وظیفۂ علم اور شہادۃ اولوالعلم

حضرات!

اس اصل کی تقریر کے بعد ضرورت تھی کہ جماعتِ علمار کے منصب و وظائف کی بھی پورے شرح و بسط کے ساتھ تفصیل کردی جاتی اور یہ حقیقت بھی واضح ہوجاتی کہ طلبِ صلاح اور ادائے فرض کے سلسلے میں آج جو مقصدِ اصلی و قدیم ہے، وہی ہے جو روزِ اول سے وحیِ الٰہی نے جماعتِ علمار کے قرار دیا ہے۔

اس مقام پر سب سے پہلے زیادہ اہم مشہدِ علم حق کی شہادت و دعوت کا تھا، جہاں پہنچ کر ہم معلوم کرتے کہ حکمتِ الٰہی نے کائناتِ ہستی اور نوعِ انسانی کے قیام و سعادت کے لیے کونسا نظام ہدایت مقرر کیا ہے۔ اور قرآن حکیم کے بیانات اس بارے میں کیا ہیں۔

قرآن حکیم نے بتلایا ہے کہ دنیا کی قوام سعادت کی بنیاد تین حقیقتوں پر ہے، جن کو اصطلاحِ قرآنی میں شہادت سے تعبیر کیا ہے شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ[115] (آل عمران) اس آیۃ کریمہ میں بالترتیب تین شہادتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ اللہ کی شہادت، ملائکہ کی شہادت، اولوالعلم یعنی علم والوں کی شہادت۔

قرآن حکیم جب کبھی لفظ شہادت کو اس سیاق و سباق کے ساتھ استعمال کرتا ہے، جیسا کہ یہاں ہے، تو شہادت کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اللہ کے کلمۂ حق کی اس کی زمین پر گواہی دینا، یعنی اس کا اعلان و اظہار کرنا، ہدایتِ الٰہی کی دعوت کو قائم کر دینا، اور حق و صداقت کی تعلیم و بیان سے دنیا کی غفلت و ضلالت کا استیصال کرنا۔ پس

اقبالِ ثانی سے بدل دے؛ اور وہ نہیں ہے مگر دعوتِ صادقہ و صالحہ کتاب و سنّت اور احیائے علم و عملِ شریعت عضّوا علیھا بالنواجذ[110] اور لن تضلوا ما تمسکتم بھما کتاب اللہ و سنۃ رسولہ[111]:

مصلحت دیدِ من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگزارند و خمِ طرّۂ یارے گیرند[112]

چنانچہ اسی حدیثِ غربت میں بھی اس کی تصریح موجود ہے فطوبیٰ للغرباء وھم الذین یصلحون ما افسد الناس من سنتی (رواہ ترمذی) سبحان اللہ غرباء دورِ آخر کی خوش نصیبی اور مصلحینِ غربتِ ثانیہ کی بلند طالعی! کہ زبانِ حق ترجمانِ نبوت سے ان کے لیے مبارکی نکلی:

گدایاں را ازیں معنی خبر نیست
کہ سلطانِ جہاں با ماست امروز[113]

حضرات!

یقیناً میں نے یہ عرض کرنے میں آپ تمام مجمعِ علم و بصیرت کے آرا ر و معتقدات کی ترجمانی کی ہے کہ جمعیۃ علمار کے اعمالِ دعوت کے لیے قاعدۂ اساسی یہی مسلک ہے۔ اسی مقصد کو سامنے رکھ کر وہ موجودہ عہدِ غربتِ اسلام میں منصب نیابت و شہادتِ حق کے فرائض انجام دینے کے لیے مستعدِ کار ہوتی ہے اور بلاخوفِ رد کہا جا سکتا ہے کہ مسلکِ اصلاحِ دینی کی بنا پر عالمِ اسلامی کا یہ سب سے پہلا اجتماعِ علما ہے، جو اس وسعت و اتحاد اور جمعیۃ اقوام کے ساتھ مجتمع ہوا ہے۔ جو کام اس وقت تک تمام بلادِ اسلامیہ کی طلب و سعی سے بروئے کار نہ آسکا اور جس کی توفیق موجودہ عہد کی اسلامی حکومتوں کو بھی نہ ملی اور تمام مصلحینِ عہد اس کی تمنائیں اپنے ساتھ لے گئے، آج وہ آپ کی سعی و ہمت سے فعل و وجود تک پہنچ چکا ہے اور عمل و اقدام کی شاہراہ آپ کے آگے باز ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ

وہ شہادتِ الٰہی کی حامل و مبلغ ہو، اور شہادتِ ملائکہ کے ادراک و معرفت کی راہیں کھولنے والی ہو۔ تیسری شہادت اصحابِ علم و معرفت کی شہادت ہے۔ اصل اور اساسی طبقہ اس جماعت کا انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں اور پھر تبعاً ان کے متبعینِ صادقین یعنی علماء و عرفائے حق ہیں، جو ہمیشہ نوعِ انسانی کی غفلتوں اور ضلالتوں کا مقابلہ کرتے ہیں اور خدا کی زمین کو اس کے کلمۂ صدق و حق کی شہادت سے خالی نہیں ہونے دیتے۔

چنانچہ شاہدینِ حق کی یہ جماعت ابتدائے ظہورِ ہدایت سے برابر رہی اور جب تکمیلِ شریعت کا وقت آگیا اور اتمامِ نعمت کی وجہ سے حضرت خاتم الادیان و مکمل الشرائع و متمم النعم کا ظہور ہوا، تو اس شہادتِ الٰہی کا منصب بھی قیامت تک کے لیے انہی کے سپرد ہوا۔ اور علمائے اسلام ان کے وارث اور نائب ٹھہرے۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔[120] نیز فرمایا اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا۔[121] یعنی حق و ہدایت کی جو شہادت اس شاہدِ صادق نے امتِ مرحومہ کو پہنچائی ہے، امتِ مرحومہ تمام نوعِ انسانی اور کرۂ ارضی میں اس کے اعلان و قیام کی ذمہ دار ٹھہری، تاکہ جو روشنی اس سراجِ منیر سے حاصل کی ہے اس سے تمام ارضِ الٰہی روشن کردے۔

## علمائے اسلام و فرضِ شہادت

پھر اس کے بعد واضح کرنا تھا کہ علمائے اسلام نے گزشتہ تیرہ صدیوں کے اندر کس طرح اس فرضِ شہادت کو انجام دیا ہے، اور دعوت و اعلانِ حق کی راہ میں کیسی کیسی قربانیاں اور سرفروشیاں کی ہیں! دنیا کی کسی قوم کی تاریخ حق پرستی کی ایسی مثال نہیں دکھا سکتی، جن سے علمائے اسلام کی تاریخ کا ہر باب و صفحہ روشن ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت و دہشت

وہ تمام امور جو بیان، اظہار، اعلان، تعلیم، دعوت اور قیام و قوامِ دعوت سے تعلّق رکھتے ہیں، سب کے سب لفظ شہادت کے مفہوم میں داخل ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے فرمایا: کُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ[116] (مُعَلِّمًا وَّدَاعِیًا اِلَی الْحَقِّ) سورۂ نساء میں ہے فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِیْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰی هٰٓؤُلَآءِ شَهِیْدًا[117] بالاتفاق اس آیت میں شہید سے مراد انبیاے کرام ہیں، جو حق کے معلّم و ہادی اور اس کی دعوت کے بلند کرنے والے ہیں۔ اور دعوتِ حق کا اصلی سرچشمہ انہی کا وجود ہے پس آیۂ آل عمران میں شہادت سے مقصود شہادتِ حق و توحید ہے، خواہ زبانِ قال سے ہو خواہ حال سے۔

اللہ کی شہادت سے مقصد صداؤں میں اس کی وحی ہے، اور مشاہدۂ و احوال میں کائناتِ ہستی کا نظام و جمال ہے۔ یہ آخری شہادت دنیا کے گوشے گوشے، چپّے چپّے، ذرّے ذرّے سے ہر آن و ہر لحظہ بلند ہو رہی ہے، ہر سامعۂ معرفت سنتا ہے اور ہر چشمِ عرفان اس کا مشاہدہ کرتی ہے۔ سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ۔[118]

ملائکہ کی شہادت اس اعتبار سے بھی ہے کہ وہ وحیِ الٰہی کے سفیر و وسیط ہیں؛ اور اس اعتبار سے بھی ہے کہ کارگاہِ ہستی کے تمام تغیرات و شئون کی اصلی علّت انہی کے اعمالِ مدبّرہ ہیں، اگرچہ ہمارا علمِ محدود محسوس نہ کر سکے۔ یہ ملائکۂ سماویہ ارضیہ کی شہادت ہے جو تمام تغیّراتِ کونیہ کے اندر سے فاطر السمٰوات والارض کی قدرت و حکمت کا اعلان کر رہی ہے۔ ولکن یَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ۔[119]

تیسری شہادت اولوالعلم یعنی علم والوں کی ہے جب شہادتِ الٰہی کی ابدی و سرمدی نداؤں اور ملک السمٰوات والارض کی غفلت شکن صداؤں سے غافل انسان اپنے کان بند کر لیتا ہے، تو پھر ایک تیسری شہادت کی ضرورت ہوتی ہے، جو خود انسانوں ہی کے اندر سے اٹھے،

کبھی کوئی بازار یا مجمع سامنے آجاتا تو عین ضرب تازیانہ کی حالت میں کھڑے ہوجاتے اور پکار کر کہتے۔ من عرفنی فقد عرفنی ومن لم یعرفنی فانا مالک بن انس اقول ان الطلاق المکرہ لیس بشیئ (حکاہ ابن خلکان)

آپ امام اہل سنت حضرت امام احمد بن حنبل[126] کو دیکھتے کہ معتصم باللہ[127] جیسا قاہر و باجبروت فرمانروا ان کے سامنے کھڑا ہے، نو جلاد یکے بعد دیگرے تازیانے لگا رہے ہیں، پیٹھ زخموں سے چور چور ہوگئی ہے، تمام جسم خون سے رنگین ہوچکا ہے، اور یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا ہے کہ جس مسئلہ کو وہ کتاب و سنت کے خلاف سمجھتے ہیں، اس کا ایک مرتبہ اقرار کرلیں۔ لیکن اس پیکرِ حق، اس مجسمۂ سنت، اس صابرِ اعظم کَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ[128] کی زبانِ صدق ترجمان سے یہی صدا نکل رہی ہے۔ اعطونی شیئاً من کتاب اللہ وسنۃ رسولہ حتی اقول۔

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم

از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس[129]

آپ حضرات امامنا الاعظم امام ابو حنیفہ[130] رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھتے کہ قید خانۂ بغداد میں اسیر ہیں، لیکن اس پر بھی منصور عباسی[131] جیسے قاہر و سفاح بادشاہ کے حکم کے سامنے ان کا سر نہیں جھکتا۔

آپ کو امام شافعی[132] اس حالت میں نظر آتے ہیں کہ یمن سے بغداد تک قید و اسر کی حالت میں بھیجے جا رہے ہیں اور ان کا جرم صرف یہ ہے کہ حق کے داعی ہیں اور صدق و ہدایت پر قائم ہیں۔

آپ شیخ الاسلام احمد بن تیمیہ[133] کو دیکھتے کہ تین تین مرتبہ مصر کے قید خانے میں اسیر کیے گئے اور بالآخر قید خانہ ہی میں وفات پائی؛ مگر اظہارِ حق سے منہ نہ موڑا، اور حکومتِ وقت کے آگے سرِ اطاعت خم نہ کیا۔

اور انسانی تاج و تخت کی کوئی ہیبت و سطوت بھی علمائے اسلام کے جذبۂ اعلانِ حق پر غالب نہ آسکی اور نہ دنیوی خوف و طمع کا کوئی منظر بھی انھیں اس راہ سے باز نہ رکھ سکا۔ دنیا میں راہِ حق سے روکنے والی صرف دو چیزیں ہیں اور ساری آزمائشیں انہی میں مضمر ہیں: ایک خوف ہے، ایک طمع۔ لیکن اُن کے دلوں میں خوف تھا تو صرف اللہ کے جبروت و جلال کا؛ اور طمع تھی، تو صرف اسی کی رضا و رحمت کی۔ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا[122]۔ پس نہ تو خوف کا حربہ ڈرا سکتا تھا، اور نہ طمع کی دلفریبی ان کے دل کو لبھا سکتی تھی۔

تزول الجبال الرّاسیات وقلبهم
علی العهد لایلوی ولا یتغیّر[123]

حضرات!
وقت تھا کہ اسی سلسلہ میں آپ کو علمائے اسلام کے ادائے فرض کے چند مناظر دکھاتا۔

آپ حضرات سیّد التابعین سعید بن المسیّب[124] کو دیکھتے کہ حکّام کے جور کے حکم سے ان کی پیٹھ پر دُرّے لگائے جا رہے ہیں، مگر ان کی زبانِ صدق اعلانِ حق میں پہلے سے بھی زیادہ سرگرمِ عمل ہو گئی ہے۔

آپ مدینہ کی گلیوں میں امامِ دار الہجرت حضرت مالک بن انس[125] کو دیکھتے۔ ان کی مشکیں اس زور سے کس دی گئی ہیں کہ دونوں بازو اکھڑ گئے ہیں اور اوپر سے پیہم تازیانے کی ضربیں پڑ رہی ہیں۔ اس عالم میں بھی جب زبان کھلتی ہے تو اسی مسئلہ کا اعلان کرتے ہیں، جس کو وہ حق پر سمجھتے تھے۔ لیکن وقت کی حکومت اس کے اعلان کو اپنے جبر و طاقت سے روکنا چاہتی تھی یعنی مسئلۂ طلاقِ مکرہ کو۔ جب گورنر مدینہ نے تشہیر و تذلیل کے لیے اونٹ کی برہنہ پیٹھ پر سوار کرا کے گشت کرایا، تو اُن کا یہ حال تھا کہ جب

باعث رہ چکے ہیں۔ اور اس لیے قرآن و سنّت نے اول ہی دن ان سب کی توضیح و تشریح کر دی تھی۔

ازآں جملہ وہ مفاسد ہیں، جن کا حال امم سابقہ علی الخصوص اہلِ کتاب کے اسباب ضلالت کی حکایت کرتے ہوئے قرآن حکیم نے جابجا بیان کیا ہے۔ اور مقصود ان سے امّتِ مرحومہ کا تنبّہ و اعتبار ہے۔ چنانچہ حدیث ابو سعید عند بخاری و مسلم میں فرمایا لتبتعین سنن من کان قبلکم حذو القذۃ، و فی لفظ حذو النعل بالنعل۔[۱۳۶]

اور ازاں جملہ فتنۂ شبہات و شہوات ہے جس کی خبر حدیث عائشہ عند صحیحین وغیرہما میں دی گئی۔[۱۳۷] "شبہات" میں تمام ذہنی و اعتقادی مفاسد آ گئے۔ اور "شہوات" میں تمام عملی مفاسد۔

اور ازآں جملہ فتنۂ تفرقہ و اختلاف ہے۔ جس کے اخبار سے دواوینِ سنّت مملو ہیں۔

اور ازاں جملہ فتنۂ تاویل الجاہلین و تحریف الغالین و انتحال المبطلین ہے، جس کی خبر حدیث ابراہیم بن العذری عند بیہقی میں دی گئی تھی اور جس کے تین جملوں میں سارے فتنے گن دیے۔

اور ازاں جملہ فتنۂ جدل و فتنۂ تعمّق و تنطّع اور فتنۂ اہوا ہے، جن کے اخبارات کو حضرت امام بخاری نے باب اعتصام بالسنہ میں ایک عجیب و دقیق ترتیبِ حکیمانہ و استنباطِ فقیہانہ کے ساتھ جمع کیا ہے۔

اور ازاں جملہ فتنۂ مولدین و دخلاء ہے۔ جس کی خبر حدیثِ ابن ماجہ میں دی گئی تھی کہ لم یزل امر بنی اسرائیل معتدلا حتیٰ نشاء فیھم المولدون۔[۱۳۸]

اور ازاں جملہ فتنۂ تولیدِ وھن اور ترکِ جہاد فی سبیل اللہ ہے اور وھن کے معنی بتلا دیے تھے کہ حب الدنیا و کراھۃ الموت (رواہ ابو داؤد)[۱۳۹]

آپ خود اسی ہندستان میں حضرت شیخ احمد سرہندی[۱۳۴] مجدّد الف ثانی کو دیکھتے کہ قلعۂ گوالیار میں قید ہیں، مگر جہانگیر[۱۳۵] کے آگے اس سر کو جھکانے کے لیے تیار نہیں، جس کو اللہ نے صرف اپنے ہی آگے جھکنے کے لیے بنایا ہے۔

آج ہندستان میں صرف قید و بندہی کی منزل ہمارے سامنے آئی ہے، اس لیے صرف انہی کا ذکر کر رہا ہوں، جنھوں نے راہِ دعوتِ حق میں اس منزل کو مردانہ وار طے کیا۔ ورنہ علماے حق اور اداے فرضِ نیابتِ نبوت کا سب سے بڑا مشہد و منظر تو میدانِ شہادت ہے۔ جہاں انھوں نے صرف اپنی زبان ہی سے نہیں، بلکہ اپنے خونِ شہادت کی سرخی سے حق و صداقت کے نقوش ہمیشہ کے لیے صفحۂ عالم پر ثبت کر دیے ہیں۔

## سدِّ بابِ شہادت اور تنزّلِ علمِ علما

پھر اس کے بعد مجھے بالتفصیل عرض کرنا تھا کہ وہ کیا اسباب و بواعث ہیں، جن کی وجہ سے اس شہادت کے قیام و اجرا میں خلل پڑا! یعنی مسلمانوں کے تنزّلِ علم و عمل کے مبادی و اساسات کیا کیا ہیں؟ کیونکہ جب تک امراض کی صحیح تشخیص نہ ہوگی، علاج صحیح کی راہ نہیں کھل سکتی۔

## اصولِ مفاسد

اس سلسلہ میں مفاسد و مہالک کے اصول تھے اور فروع تھے۔ مبانی و مبادیات تھے۔ اور ان کا شیوع و انشعاب تھا۔ مجھے ایک ایک کر کے سب کو شمار کرنا تھا۔

اصل اس بارے میں وہ مفاسد و فتن ہیں جو ہمیشہ اقوام و شرائع کی ضلالت و فساد کا

# طُرقِ اصلاح

ان تمام تفصیلات کے بعد ان طُرقِ اصلاح پر نظر ڈالنی تھی، جو گزشتہ صدی میں عالمِ اسلامی کے تمام داعیانِ اصلاح نے اختیار کی ہیں۔ اور پھر خاص ہندستان کی سابق اور موجودہ حالت اور اس کی مقتضیات و داعیات پر بحث کرنی تھی۔ اس طرح واضح ہوتا کہ ہمارے لیے آیندہ مسلکِ عمل کیا ہونا چاہیے، اور اس کے ارکان و طرق حسبِ ہدایت کتاب و سنّت کیا کیا ہیں؟ لیکن مسائلِ حاضرہ کے استغراق اور وقت کی قلّت کا لحاظ کرتے ہوئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام مباحث کو اس خطبہ کے مطبوعہ نسخہ کے لیے اٹھا رکھوں اور یہاں صرف یہ عرض کر دوں کہ آیندہ کے لیے سب سے زیادہ مقدّم اور بنیادی معاملہ کیا ہے۔

# طُرقِ تاسیس و تجدید

حضرات!

اس موقع پر میں آپ کی توجہ اس خطبے کے ابتدائی حصے کی طرف مبذول کراؤنگا۔ میں نے ابھی ابھی عرض کیا ہے کہ اس راہ میں شرطِ کامیابی یہ ہے کہ ہمارا عمل خالصًا لوجہ اللہ ہو، اور نیز طریقِ صواب پر ہو، اور طریقِ صواب نہیں ہے مگر طریقِ سنّت و منہاجِ نبوت۔

اس کے لیے میں دو لفظ بولونگا: ایک لفظ "تاسیس" اور ایک "تجدید"۔ ان کے معانی آپ پر روشن ہیں۔ تاسیس، اساس سے ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ از سرِ نو کسی چیز کو بنانا۔ تجدید، جدّت سے ہے، اور اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی پیشتر کی بنی ہوئی چیز کو تازہ کر دینا، اور اس طرح سنوار دینا گویا وہ بالکل نئی ہوگئی۔ آج ہمارے قومی کاموں کی ہر شاخ میں

# فروعِ مفاسد

پھر ان مفاسدِ اصلیہ کے فروع اور برگ و بار ہیں؛ ضرور تھا کہ ان کی بھی تشریح کی جاتی :
مثلاً نظام و قوامِ خلافت کی برہمی، تفرقۂ قوی و مناصب، حکومتِ شوریٰ کی جگہ حکومتِ شخصیہ و مستبدہ کا قیام۔
وحدتِ کلمۂ اسلام کی جگہ تفرقۂ مذاہب و احزاب کہ فی الحقیقت راس الفتن اور علۃ العللِ انقراضِ ملّت یہی ہے۔
اسی طرح ترکِ اہتدا بہ کتاب و سنّت اور علومِ اصلیۂ کتاب و سنّت کی جگہ علومِ محدثہ و دخیلہ کا استغراق اور شیوع، فتنۂ یونانیہ و عجمیہ کا ظہور کہ فتنۂ شبہات اور فتنۂ مولدین میں انہی دو سبب سے بڑے فتنوں کی خبر دی گئی تھی۔
اور ازاں جملہ علماء میں اصحابِ مناصب و ریاست کی کثرت کہ بقول امام غزالی سب سے بڑا سبب علمائے دنیا کی کثرت اور علمائے آخرت کی قلّت کا یہی ہوا۔ قالہ فی الاحیاء۔
اور ازاں جملہ خلافتِ عربیہ کا انقراض، عجمی حکومتوں کا قیام اور مرکزیت و وحدتِ خلافت کا فقدان، بالآخر تمام اسلامی حکومتوں کا زوال، علماء کا محکومیت و غلامی پر اقتناع، فریضۂ جہاد و دفاع فی سبیل اللہ سے اعراض، ادائے فرائض و وظائفِ شرعیہ میں طرح طرح کے حیل و احتیال اور اسی طرح کے بشمار فروعی مفاسد تھے، جن کا افسانۂ درد آپ کے آگے دہرانا تھا۔
اور ازاں جملہ اقوامِ مغضوبہ و مسفلہ کی موالات کا شیوع و استیلاء، جس سے کتاب و سنّت میں بار بار روکا گیا تھا۔ اور صحابہ کرام اس فتنہ سے تعوذ کیا کرتے تھے۔

ہے کہ راہِ اصلاح میں ضرورت صرف تجدید کی ہے، تاسیس کی نہیں ہے۔ خود شارع علیہ السّلام نے بھی ہمیں تجدید ہی کی خبر دی، نہ کہ تاسیس کی ان اللہ یبعث لھذہ الامۃ علی راس کل مأۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا (رواہ ابوداؤد عن ابی ہریرہ) [141] لیکن میں عرض کرونگا کہ اگر یہ سچ ہے تو عملاً نتیجہ اس اعتقاد کا یہ ہونا چاہیے کہ ہمارا قدم طلبِ اصلاح میں تاسیس کی طرف نہ جائے، اور وقت کے نظر فریب اسلوب کار علی الخصوص یورپ کے مجلسی واجتماعی طریقے، ہمیں نظمِ شرعی سے روگرداں نہ کردیں۔ افسوس ہے اس وقت تک تمام داعیانِ اصلاح کا طرزِ عمل اس کے مخالف رہا ہے اور یقین کیجیے کہ یہی علت ہے کہ اس وقت تک ہماری کوئی سعیِ اصلاح و ترقی فوز و فلاح نہ پا سکی۔

اسلام اگر ایک دینِ کامل ہے، تو ضرور ہے کہ اس نے اپنے پیرؤں کی تمام انفرادی واجتماعی اور مدنی ضروریات کے لیے کامل واتم تعلیم دے دی ہو؛ اور اگر وہ دینِ آخری ہے تو ضروری ہے کہ اس کی تعلیم اور شارع کی عملی سنّت ہر عہد، ہر زمانے، ہر حالت اور ہر مشکل وضیق کے لیے رہنما وکفیل ہو۔ ہمارا ایمان ہے کہ حقیقت ایسی ہی ہے اور اسلام نے ہماری تمام اجتماعی وقومی برکات کا سامان کردیا ہے۔ لیکن پھر یہ کیا مصیبت ہے کہ ہم ان کھوئی ہوئی برکتوں کو واپس لینا نہیں چاہتے، مگر نئی نئی راہوں کی جستجو میں حیران وسرگرداں ہیں۔ مثلاً چند امور عرض کروں گا۔

قوم افراد سے مرکب ہے اور افراد کی قومی ہستی کے قیام وظہور کے لیے ضروری ہے کہ ایک جماعتی سلک میں تمام افراد منسلک ہوجائیں، اور تفرقہ وتشتّت کی جگہ وحدت واتحادِ افراد قوم کی شیرازہ بندی کی جائے۔ ہم اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور یورپ کے اجتماعی طریقوں کی نقالی کرنا چاہتے ہیں، لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ آخر اسلام نے بھی حیاتِ اجتماعی کے لیے کوئی نظم ہمیں دیا تھا یا نہیں؟ اگر دیا تھا اور ہم نے ضائع کردیا ہے تو یورپ کی دریوزہ گری سے پہلے خود اپنی کھوئی ہوئی چیز کیوں نہ واپس لے لیں! اور سب سے پہلے

ایک بنیادی غلطی یہی ہے کہ ہم نے اصولی طور پر طریقِ اصلاح کا فیصلہ نہیں کیا مسلمانوں کی اصلاحِ حال کے لیے ضرورت طریقِ تاسیس کی ہے، یا تجدید کی! یعنی اس کی ضرورت ہے کہ از سرِ نو نئی باتیں، نئے طریقے، نئے ڈھنگ، نئے نظام اور نئی چالیں اختیار کی جائیں: یا صورتِ حال یہ ہے کہ پہلے سے ایک مکمل کارخانۂ ملت موجود ہے جس کو اپنے بقا و ترقی کے لیے کسی نئی بات کی احتیاج نہیں، مگر طرح طرح کی خرابیاں عارض ہو گئی ہیں، اور بہت سی باتیں بڑھا دی گئی ہیں۔ پس ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ خرابیاں دور کر دی جائیں، کھوئی ہوئی چیزیں واپس لے لی جائیں، اور اس کو ویسا ہی بنا دیا جائے، جیسا کہ اصل میں وہ تھا۔

تاسیس کے معنی تو یہ ہوئے کہ آپ نے ایک نئی عمارت تعمیر کی۔ تجدید یہ ہوئی کہ مکان پہلے سے موجود ہے، صرف شکست و ریخت کی درستگی مطلوب تھی۔ پس اپنے نقائص دور کر کے درست کر دیا۔ ہم کو غور کر لینا چاہیے کہ بنائے ملت کی درستگی کے لیے تعمیرات اساسیہ مطلوب ہیں یا صرف اصلاحاتِ تجدیدیہ؟

اگر تاسیس مطلوب ہے تو بلاشبہ ہمارا پہلا کام یہ ہو گا کہ نئے نئے ڈھنگ اختیار کریں۔ لیکن اگر تجدید کی ضرورت ہے تو ہمیں نئی نئی چیزوں کی ضرورت نہ ہو گی۔ صرف یہ دیکھنا ہو گا کہ پہلے سے جو چیزیں موجود ہیں، ان کا کیا حال ہے! اور ان میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں، وہ کیونکر دور کی جائیں!

حضرات!

دین کامل ہو چکا اور اتمامِ نعمت کا اعلان کر دیا گیا۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ[۱۴] اور مجھے یقین ہے کہ ہم میں ایک فردِ واحد بھی ایسا نہ ہو گا جو یہ کہے کہ اصلاحِ ملتِ اسلامیہ کے لیے قرآن و شریعت کی تعلیمات و نظامات کافی نہیں ہیں، اور ہمیں غیروں کی تقلید اور دریوزہ گری کی ضرورت ہے۔ پس یہ اصل تو متفق و مسلّم

حضرات!

میں مثالوں میں آپ کا زیادہ وقت نہ لونگا۔ مقصود یہ ہے کہ ہمارے لیے راہِ عمل، تجدید و احیاء ہے نہ کہ تاسیس و اختراع۔ پس کسی طرح بھی یہ طریق صواب نہ ہوگا کہ علمائے امّت کی جمعیت بھی اپنے نظام و قوام کے لیے محض آج کل کی مجلسوں کے قاعدوں اور طریقوں کی نقل و محاکات پر اکتفا کرلے۔ حاملینِ شریعت کا مقام اس سے بہت بلند ہے کہ وہ اپنے عمل کے لیے ان مجلسوں کے ڈھنگوں اور طریقوں کے محتاج ہوں۔ ان کی راہ اتباعِ شریعت اور اہتدایہ مشکوٰۃ نبوت کی ہے۔ اور اسوۂ حسنۂ نبوت اور حکمتِ رسالت نے انھیں تمام انسانی طریقوں سے مستغنی و بے نیاز کر دیا ہے۔ ہمارا طریقِ عمل یہ ہونا چاہیے کہ ہم ہر طرف سے آنکھیں بند کرکے حکمتِ اجتماعیۂ نبویہ کو اپنا دستور العمل بنالیں، شریعت کے کھوئے ہوئے نظام کو از سرِ قائم و استوار کر دیں، اور اس طرح اسلام کی مٹی ہوئی سنتیں زندہ ہو جائیں محض مجلس آرائی و ہنگامہ سازی ہمارے لیے کچھ سودمند نہیں ہوسکتی۔

# مسئلۂ نظمِ جماعت

حضرات!

اب آپ مجھے اجازت دیں کہ میں مختصراً اس مسئلہ کی نسبت بھی کچھ عرض کر دوں، جس کو میں علیٰ وجہ البصیرت آج تمام اعمالِ اصلاحیہ کے لیے بمنزلۂ اصل و اساس کے یقین کرتا ہوں اور کامل بارہ سال کے متصل غور و فکر کے بعد اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ بغیر اس کے کبھی عقدۂ کار حل نہیں ہوسکتا۔ میرا اشارہ مسئلۂ نظامِ جماعت اور قیامِ امارتِ شرعیہ کی جانب ہے۔

مسئلۂ نظامِ جماعت سے مقصود یہ ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کی اصلاحِ حال اور ادائے فرضِ شرعیہ کی استطاعت کبھی ظہور پذیر نہیں ہوسکتی، جب تک وہ اپنی موجودہ

اسلام کا قرار دادہ جماعتی نظام کیوں نہ قائم کریں!

ہم دیکھتے ہیں کہ جب تک مجالس نہ ہوں، اجتماعیات نہ ہوں، انجمنیں نہ ہوں، کانفرنسیں نہ ہوں، کوئی قومی عمل انجام نہیں پا سکتا، نہ اتحاد و تعاون کی برکت حاصل ہو سکتی ہے پس، ہم آج کل کے مجلسی طریقوں کے مطابق انجمنیں بناتے ہیں، کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں۔ مگر ہم میں سے کسی کو بھی اس کا خیال نہیں آتا کہ اسی مقصدِ اجتماع و تعاون کے لیے اسلام نے پانچ وقت کی نماز با جماعت، جمعہ و عیدین، اجتماعِ حج کا حکم دیا ہے؛ اور اس کا نظام و قوام درہم برہم ہو گیا ہے۔ سب سے پہلے اسے کیوں نہ درست کر لیں!

ہم دیکھتے ہیں کہ جب تک کوئی قومی فنڈ نہ ہو، اس وقت تک قومی اعمال انجام نہیں پا سکتے۔ پس، ہم نئے نئے فنڈ قائم کرتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے مگر کاش کوئی یہ بھی سوچے کہ خود شریعت نے اسی ضرورت کو رفع کرنے کے لیے زکوٰۃ و صدقات کا حکم دیا ہے۔ اس کا نظم ٹھیک قائم ہے یا نہیں؛ اگر وہ قائم ہو جائے، تو پھر کبھی کسی چندہ یا فنڈ کی ضرورت نہ ہو گی!

ہم دیکھتے ہیں کہ قوم کی تعلیمِ عام کے لیے مجامع و محافل کی ضرورت ہے۔ ہم اس کے لیے نئی نئی تدبیریں کرنے لگتے ہیں۔ مگر کبھی یہ حقیقت ہمارے دلوں کو بیقرار نہیں کرتی کہ عین اسی مقصد سے شریعت نے خطبۂ جمعہ کا حکم دیا تھا، اور ہم نے اس کی برکتوں کا دروازہ اپنے اوپر بند کر لیا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی قومی و اجتماعی کام انجام نہیں پا سکتا جب تک اس میں نظم و انضباط نہ ہو، اور یہ ہو نہیں سکتا، جب تک اس کا کوئی رئیس و قائد مقرر نہ کیا جائے۔ پس ہم تیار ہو جاتے ہیں کہ جلسوں کے لیے صدر تلاش کریں۔ لیکن اگر یہی حقیقت شریعت کی ایک اصطلاحِ امامت کے لفظ میں ہمارے سامنے آتی ہے، تو ہمیں تعجب و حیرانی ہوتی ہے، اور اس کے لیے ہم تیار نہیں ہوتے۔

کرچکا ہوں، اور زیادہ شرح و تفصیل تفسیر القرآن میں ملیگی۔

میں اس بارے میں کچھ عرض نہیں کرونگا، کیونکہ گزشتہ آخری صدیوں میں مسلمانوں کا شیرازۂ اجتماع پراگندہ ہوا اور تقریباً پانچویں صدی ہجری کے بعد سے اس پراگندگی کے اسباب یکے بعد دیگرے ظہور میں آتے رہے۔ مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ بااین ہمہ تفریق و پراگندگی ہندستان میں اسلامی حکومت قائم تھی اور جب تک وہ قائم رہی نظامِ جماعت بھی قائم رہا۔ لیکن اسلامی حکومت کے انقراض کے بعد مسلمانانِ ہند کا نظمِ جماعت بالکل درہم برہم ہوگیا۔ اور سرتاسر جاہلیت کی سی بے نظمی و بے قیدی ہم پر چھا گئی۔ بلاشبہہ مرکزی خلافت آلِ عثمان کی موجود تھی اور مسلمانانِ ہند کے لیے بھی تمام مسلمانانِ عالم کی طرح وہی خلیفہ و مطاع تھے لیکن مسلمانانِ ہند کا فرض تھا کہ یا تو اپنے علائق فعلاً و عملاً بارگاہِ خلافت سے قائم کرتے اور اس کے ایک موجود و عامل نائب کی نیابت حاصل کر کے اپنا فرضِ اسلامی انجام دیتے، اور اگر ایسا ہونا دشوار تھا، اور واقعی بات یہی ہے کہ دشوار تھا، اعادۂ حال اور تہیۂ کار ادرادائے فرضِ اسلامیہ میں کوشاں ہوتے لیکن بدبختانہ ایسا نہیں ہوا۔ اور جہاں غیر مسلم غلبہ و استیلاء پر محکومانہ قناعت کر لی گئی، وہیں اس اولین فریضۂ ملّت کی طرف سے بھی ہمتوں کے قصور اور عزائم کے فقدان نے کوتاہی کی۔ بہرحال ایک زمانۂ دراز اس پر گزر گیا اور اب حالت یہ ہے کہ دس کروڑ مسلمان جو تمام کرۂ ارض میں سب سے بڑی یکجا اسلامی جماعت ہے، ہندستان میں اس طرح زندگی بسر کر رہی ہے کہ نہ تو ان میں کوئی رشتۂ انسلاک ہے، نہ وحدتِ ملّت کا کوئی رابطہ؛ نہ کوئی قائد و امیر ہے اور نہ کوئی آمر و ناقدِ شرع؛ محض ایک بھیڑ ہے، ایک انبوہ ہے، ایک گلّہ ہے، جو ہندستان کی آبادیوں میں بکھرا ہوا ہے۔ اور یقیناً ایک حیاتِ غیر شرعی و جاہلی ہے جس میں یہ پوری اقلیم مبتلا ہوگئی ہے۔

اس حالت کے مفاسد و شرور میں ایک بہت بڑا مفسدہ یہ بھی ہے کہ برسوں سے ہندستان میں شریعت کا بابِ قضاء گویا بالکل معدوم ہوگیا ہے، کیونکہ قضا کا وجود بلا قاضی کے نہیں

حیاتِ انفرادی کو ترک کر کے حیاتِ اجتماعی و شرعی اختیار نہ کرلیں۔ یعنی احکامِ نظامِ شرع کے مطابق سب ایک امیر و قائدِ شرع کی اطاعت پر مجتمع نہ ہو جائیں اور بکھرے ہوئے متفرق قومی مرکزوں کی جگہ ایک ہی مرکزِ قومی پیدا نہ ہو جائے۔ یہی اصل اساسِ کار ہے، اور تمام مقاصدِ اصلاح اور مصالحِ انقلاب کا نفاذ و ظہور اسی کے قیام و وجود پر موقوف ہے۔

حضرات!

اسلام کے نظامِ اجتماعی کی نسبت کسی شرح و تفصیل کی ضرورت نہیں، علی الخصوص ایک ایسے مجمع میں جیسا کہ فضل و توفیقِ الٰہی سے اس وقت میرے گرد و پیش موجود ہے۔ اسلام نے مسلمانوں کے تمام اعمالِ حیات کے لیے بنیادی حقیقت یہ قرار دی ہے کہ کسی حال میں بھی فرادیٰ، متفرق، الگ الگ اور تشتّت نہ ہوں، ہمیشہ مجتمع، مؤتلف، متحد اور نفسِ واحدہ ہو کر رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن و سنّت میں جابجا اجتماع و وحدت پر زور دیا گیا اور کفر و شرک کے بعد کسی بدعملی سے بھی اس قدر اصرار و تاکید کے ساتھ نہیں روکا جیسا کہ تفرقہ و تشتّت سے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اسلام کے تمام احکام و اعمال میں یہ حقیقتِ اجتماعیہ بمنزلۂ محور و مرکز کے قرار پائی۔ اور تمام دائرۂ عمل اسی کے گرد قائم کیا گیا۔ عقیدۂ توحید سے لے کر تمام عبادات و اعمال تک یہی حقیقت مرکزیہ جلوہ طرازی کر رہی ہے اور اسی بنا پر بار بار نظمِ جماعت پر زور دیا گیا۔ علیکم بالجماعۃ والسمع والطاعۃ۔[۱۴۲] (رواہ ترمذی) اور علیکم بالجماعۃ فان الشیطان مع الفذ وھو من الاثنین بعد[۱۴۳] (رواہ البیہقی) اور اذا کان ثلاثۃ فی سفر فلیوم احدکم۔[۱۴۴] (رواہ اصحاب السنن) اور اسی لیے نظم و قوامِ ملّت کے لیے منصبِ خلافت کو اطاعت قرار دیا گیا کہ تمام متفرق کڑیاں ایک زنجیر میں منسلک ہو جائیں۔ شرح اس مقام کی بہت طولانی ہے اور معارفِ کتاب و سنّت اس بارے میں بے شمار اور حدِ احصار و استقصاء سے باہر ہیں۔ رسالۂ خلافت میں اس پر بحث

آگئی ہے۔ ہندستان میں دس کروڑ مسلمان ہیں، جو اس وقت تک سرشارِ غفلت تھے اور اب آمادہ ہوئے ہیں کہ اطاعت واعانتِ خلیفۂ عہد، حفظ وصیانتِ بلادِ اسلامیہ اور آزادیِ ہندستان کی راہ میں اپنا اولین فرضِ اسلام انجام دیں۔ خدارا بتلائیے، اس صورتِ حال میں بھی طریقِ کار کیا ہونا چاہیے؟ اور ایسے وقتوں کے لیے آخر اسلام نے بھی کوئی نظامِ کار بتلایا ہے یا نہیں؟ یا وہ باوجود دعویِ تکمیلِ شرع اس قدر نامراد ہوگیا ہے کہ آج اس کے پاس وقت کی مشکل و مصیبت کا کوئی حل نہیں؟ اگر بتلایا ہے تو وہ کیا ہے؟ یا محض انجمن سازی اور ہنگامۂ مجالس آرائی؟ کیا محض اتباعِ آرائے رجال اور تقلیدِ اربابِ فنِ تخمین؟ میں اعلان کرتا ہوں کہ اس بارے میں راہِ شرعی صرف وہی ایک ہے اور جب تک وہ ظہور میں نہ آئیگی، ہماری کوئی سعی مشکور نہیں ہو سکتی۔

جو فتنہ آج یورپ سے اٹھا ہے، چھٹی صدی ہجری میں بھی اس کے سیلاب بلادِ تاتار و چین سے اٹھے تھے اور تاتاریوں کے استیلا سے تمام عالمِ اسلامی تہ و بالا ہوگیا تھا۔ اس وقت بھی تمام بلادِ شرقیۂ اسلامیہ کا یہی حال تھا، جو آج نظر آرہا ہے۔ لیکن اس عہد کے علما نے پہلا کام یہ کیا کہ جن بلاد پر تاتاریوں کا قبضہ و استیلا ہوگیا تھا، وہاں تنظیمِ جماعت اور قیامِ شرع کے لیے وُلاۃِ مسلمین کے نصب و تقرر کا حکم دیا۔ اسی بنا پر فقہائے متاخرین کے یہاں اس کی تصریح پاتے ہو کہ بلادِ محکومۂ کفار میں طلبِ والیِ مسلم امارت واجب ہے۔ شیخ اسلام احمد ابن تیمیہ نے انھیں بلادِ محکومۂ تاتار کے لیے فتویٰ دیا تھا کہ وہاں کے مسلمانوں کو ابداً اس تغیر پر قانع نہیں ہونا چاہیے، اور ایک لمحہ بھی بغیر کسی امام کے بسر نہیں کرنا چاہیے۔ یا تو وہاں سے ہجرت کر جائیں اور یا ایک امیر نصب کر کے اپنے فرائضِ شرعیہ انجام دیں۔

فی الحقیقت احکامِ شرع کی رو سے مسلمانانِ ہند کے لیے صرف دو ہی راہیں تھیں اور اب بھی دو ہی راہیں ہیں۔ یا تو ہجرت کر جائیں۔ یا نظامِ جماعت قائم کر کے ادائے فرضِ ملت میں کوشاں ہوں۔

ہو سکتا اور قاضی کا وجود امارت و امامت کے قیام پر موقوف ہے۔

حضرات:

ایک منصب قضا ہے اور ایک منصب امارت ہے۔ دونوں میں عام و خاص کی نسبت ہے۔ قضاءِ امارت کے مقاصد میں داخل اور اس کے ماتحت ہے، مگر مقاصدِ امارت قضاء سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ پس یہ مقاصدِ امارت کے فقدان کا ذکر کر رہا ہوں، صرف قضاء کا ذکر نہیں کرتا جس کے لیے محض نام نہاد قاضیوں کا تقرر یا فرضی عدالتوں کا اجراء کافی ہو۔

حضرات:

اب سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ حالت میں ہم کوئی قدم مقاصدِ اعمالِ ملّیہ کا اٹھا سکتے ہیں؟ کیا احیاے تجدیدِ ملت اور قیامِ شرع و اداے فرائضِ اسلامیہ کی کوئی صحیح راہ پیدا ہو سکتی ہے؟ کیا محض ایک بھیڑ اور انبوہ لے کر ہم وہ فرائض انجام دے سکتے ہیں، جن کے لیے اولین شرط عقلاً و شرعاً وجودِ جماعتِ منظم اور امارتِ صحیحۂ شرعیہ ہے۔ چھوڑ دیجیے مصطلحاتِ شرعیہ کو۔ اگر ان سے ہمیں اس قدر بُعد ہو گیا ہے کہ ساری باتوں کے لیے تیار ہیں مگر بحکم اَشْمَأَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ[145] طریقِ شرعی اور اس کے نظام و قوام کے الفاظ سن کر یکایک متوحش و مضطرب الحال ہو جاتے ہیں تو صرف انہی قواعد و اصول کو سامنے لائیے، جن پر آج تمام اقوامِ عالم عامل ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا بغیر ایک قائد اور لیڈر کے کوئی جماعت اپنی ہستی قائم رکھ سکتی ہے؟ پھر وہی حقیقت تو شریعت نے بھی لفظ امیر یا امام میں مضمر رکھی ہے۔ یہ کیا مصیبت ہے کہ اگر لیڈر کا لفظ کہا جاتا ہے، تو آپ اس کا استقبال کریں، اور امیر و امام کا لفظ آجائے، تو نفرت و استکراہ سے بھر جائیں! کیا یہ وہی غلطی نہیں ہے، جس کو راہِ تاسیس اور راہِ تجدید کی اصطلاح میں ابھی ابھی عرض کر چکا ہوں۔

اس کو بھی چھوڑیے، آج وقت کی سب سے بڑی مہم اور اداے فرضِ اسلامی کی سب سے بڑی نازک اور فیصلہ کن گھڑی ہے، جو آزادیِ ہند اور مسئلۂ خلافت کی شکل میں ہمارے سامنے

کے فرش پر لوٹیے اور اس راہ کی زخم و کاوش انہی لوگوں کے لیے چھوڑ دیجیے، جو اس ذوق کے لذت شناس ہیں:

کسے کو تشنۂ وصل ست، با کوثر نمی سازد

بہ آبِ خضر اگر عاشق رود، لب تر نمی سازد

رہِ الفت خطرناک ست پنہانش نظر در کن

مدا اِیں وادیٔ کہ عشق اوست، تن با سر نمی سازد[146]

اور حضرات! حق تو یہ ہے کہ جس راہ کو آپ مشکل کہہ رہے ہیں، ساری آسانیاں اسی میں پنہاں ہیں؛ اور جس کو آپ نے سہل سمجھ رکھا ہے، مشکلوں اور دشواریوں کا وہی سرچشمہ ہے۔ مشکلیں انسان کے بنائے ہوئے طریقوں میں ہو سکتی ہیں، مگر اللہ کی کھولی ہوئی فطری راہوں میں نہیں ہو سکتیں؛ نہ وہاں دشواری ہے، نہ اعوجاج، اور نہ کسی قسم کا ضیق و حرج۔ ملۃ السمحۃ الحنیفیہ لیلھا کنھارھا۔ البتہ ساری دشواری خود ہمارے نفس و غفلت ہی کی پیدا کی ہوئی ہے۔ اور بلاشبہہ جب تک اس سے ہمارا چھٹکارا نہ ہوگا، کوئی عملِ حق ہم پر آسان نہیں ہو سکتا۔

فیا دارھا بالخیف اِنّ مزارھا      قریب ولکن دون ذالک اھوال[147]

حضرات!

بعض حضرات کا بیان ہے کہ اس سے ممکن ہے کوئی نیا فساد اٹھ کھڑا ہو، میں عرض کروں گا کہ یہ طریقہ احکامِ شریعت سے ماخوذ ہے، تو ہمارے لیے یقین و برہان آگیا۔ اب کیا آپ یقین کو شک کی خاطر چھوڑ دینگے؟ آپ کہتے ہیں کہ ممکن ہے کوئی نیا فساد پیدا ہو جائے۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ اور اس کے رسول نے ہمیں یقین دلایا ہے کہ فوز و فلاح حاصل ہوگی۔ پھر کیا شک لے کر آپ یقین کے مقابلے کے لیے اٹھے ہیں؟ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا یُغۡنِیۡ مِنَ الۡحَقِّ شَیۡئًا۔[148]

حضرات!

بعض اصحاب نے اس واضح و بیّن مسئلہ کی نسبت بھی شکوک و شبہات ظاہر کیے ہیں، لیکن وہ سب کے سب اہلِ نظر و بصیرت کے نزدیک مالایعبا بہ میں داخل ہیں۔ اور اس لیے ان کے رد و نقد میں آپ کا وقت ضائع نہ کرونگا۔ بعض حضرات مسئلہ کی صحت و شرعیت تو تسلیم کرتے ہیں، مگر اس لیے آمادۂ عمل نہیں کہ اس کے نفاذ میں مشکلات اور دشواریاں پیش آئینگی۔ میں عرض کرونگا کہ بلاشبہہ دنیا کے ہر عمل عظیم کی طرح اس عمل کی راہ میں بھی مشکلات پیش آسکتی ہیں، لیکن یہ آپ سے کس نے کہا ہے کہ آپ کی راہِ عمل آسانیوں کا باغ اور راحتوں کا عیش کدہ ہے؟ آپ نے تو مشکلوں ہی کی طرف قدم اٹھایا ہے اور دشواریوں ہی کی طلب کی ہے۔ آپ قوموں کی قسمت پلٹنے کے لیے اٹھے ہیں، اور تمام کرۂ ارضی کی ظلم و ضلالت سے آپ کو مقابلہ درپیش ہے۔ اگر آپ مشکلوں سے گھبراتے ہیں، تو صرف اس مسئلہ پر کیا موقوف ہے، عمل و عزم ہی سے کنارہ کش ہو جائیے:

ناز پروردِ تنعّم نہ برد راہ بدوست　　عاشقی شیوۂ رندانِ بلاکش باشد

آپ نے خلافتِ اسلامیہ و جزیرۃ العرب کی حفاظت و دفاع کا اعلان کیا ہے۔ آپ ہندستان کی آزادی کے لیے بیقرار ہیں۔ یہ کونسی آسانیوں کی راہ ہے؟ کونسی پھولوں کی سیج یہاں آپ کے لیے تیار کی گئی ہے! آپ کرۂ ارضی کی سب سے بڑی قاہر و جابر طاقت کے دہنِ آز سے اس کا نگلا ہوا لقمہ واپس لینا چاہتے ہیں۔ یقیناً تنظیمِ جماعت کی راہ اس سے زیادہ دشوار نہیں ہے!

حضرات!

یاد رکھیے، آج آپ نے جس راہ میں قدم اٹھایا ہے وہ سرتاسر مشکلوں اور آزمائشوں ہی کی راہ ہے، وہ پھولوں کی روش نہیں ہے، کانٹوں کا دشتِ بیکنار ہے۔ اگر آپ کے تلوے لذتِ غم سے آشنا نہیں ہیں، تو مشکلاتِ راہ کی شکایت نہ کیجیے۔ بہتر یہ ہے کہ دریا دخل

حقیقت اس عاجز پر منکشف کی، اور مجھے یقین ہوگیا کہ جب تک یہ عقدہ حل نہ ہوگا، ہماری کوئی سعی و جستجو بھی کامیاب نہ ہوگی۔ چنانچہ اسی وقت سے میں سرگرمِ سعی و تدبیر ہوگیا۔ حضرت مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ سے میری ملاقات بھی دراصل اسی طلب وسعی کا نتیجہ تھی۔ انھوں نے پہلی ہی صحبت میں کامل اتفاق ظاہر فرمایا تھا اور یہ معاملہ بالکل صاف ہوگیا تھا کہ وہ اس منصب کو قبول کرلیں گے۔ اور ہندستان میں نظمِ جماعت کے قیام کا اعلان کردیا جائیگا۔ مگر افسوس ہے کہ بعض زُود رائے اشخاص کے مشورہ سے مولانا نے اچانک سفرِ حجاز کا ارادہ کردیا؛ اور میری کوئی منّت وسماجت بھی انھیں سفر سے باز نہ رکھ سکی۔ اس کے بعد میں نظر بند کردیا گیا۔ لیکن ایامِ نظربندی میں بھی اس کی فکر و تبلیغ سے غافل نہ تھا۔ چنانچہ صوبۂ بہار کے بعض احبابِ مخلصین کو اسی زمانے میں اس طرف توجہ دلائی گئی اور وہاں ابتدائی بنیاد اس کی ڈال دی گئی۔ اسی زمانے میں میرے عزیز و رفیق مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد[15] صاحب رانچی میں مجھ سے ملے تھے اور اسی وقت سعی و تدبیر میں مشغول ہوگئے تھے۔ جنوری ۱۹۲۰ء میں جب میں رہا ہوا اور موجودہ تحریکِ خلافت کی تنظیم شروع ہوئی، تو اس وقت بھی میں نے بار بار کوششیں کیں اور تمام کارکن طبقہ کو اس طرف توجہ دلائی، مگر حالات موافق و مساعد نہ ہوئے، اور مجھے مجبوراً انھی اصلاحات پر قناعت کرلینی پڑی، جو اس تحریک کے اندر رہ کر انجام دے سکتا تھا۔

گزشتہ موسمِ گرما میں جب اس طرف سے مایوسی ہوگئی کہ تمام ملک کے لیے کوئی متفقہ و متحدہ نظم قائم ہو، تو پھر یہ ارادہ کیا کہ اوّلاً صوبہ وار تنظیم کا کام شروع کردیا جائے۔ چونکہ صوبۂ بہار میں تین چار سال سے ابتدائی بنیاد کام کررہی تھی، اس لیے سب سے پہلے اسی کی طرف توجہ کی گئی، اور میں نہیں جانتا کہ کن لفظوں میں حضرات علماے بہار کو مبارکباد دوں کہ انھوں نے سبقت بالخیرات کا مقامِ اعلیٰ حاصل کیا اور جمعیۃ العلماء بہار کے جلسہ میں تین سو کے مجمعِ علماء نے بالاتفاق اپنا امیرِ شریعت منتخب کرلیا۔

حضرات!

سچ یہ ہے کہ یہ تمام مظاہر اس حقیقت کے ہیں کہ مدّتوں کی غفلت اور ترک و بُعدِ کتاب و سنّت کی وجہ سے ہمتیں مفقود ہوگئی ہیں، عزائم معدوم ہو گئے ہیں اور عزائم امور کی راہ سے ہم سب یک قلم ناآشنا ہو گئے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سنّتِ الٰہی وقت کی مہم کو سر کرنے کے لیے اپنی عاداتِ جاریہ کے مطابق سرگرمِ انبعاث و ظہور ہو اور توفیقِ الٰہی قیامِ حق اور مقامِ عزیمتِ دعوت کے لیے کسی مردِ غیب کے قلب کا انشراح فرما دے۔ یہ راہ اصحابِ عزم کی ہے اور فاتحینِ عہد کی۔ ضعفائے طریق اور درماندگانِ راہ کا یہاں گزار نہیں ہو سکتا۔ آج ایک ایسے عازم امر کی ضرورت ہے جو وقت اور وقت کے سر و سامان کو نہ دیکھے، بلکہ وقت اپنے سارے سامانوں کے ساتھ اس کی راہ تک رہا ہو۔ مشکلیں اس کی راہ میں غبارِ خاکستر بن کر اُڑ جائیں اور دشواریاں اس کے جولانِ قدم کے نیچے خس و خاشاک بن کر پس جائیں۔ وہ وقت کا مخلوق نہ ہو کہ وقت کے حاکموں کی چاکری کرے۔ وہ وقت کا خالق و مالک ہو اور زمانہ اس کی جنبشِ لب پہ حرکت کرے۔ اگر انسان اس کی طرف سے گردن موڑ لیں، تو وہ خدا کے فرشتوں کو بلا لے۔ اگر دنیا اس کا ساتھ نہ دے، تو وہ آسمان کو اپنی رفاقت کے لیے نیچے اُتار لے۔ اس کا علم مشکوٰۃِ نبوت سے ماخوذ ہو۔ اس کا قدم منہاجِ نبوت پر استوار ہو۔ اس کے قلب پر اللہ تعالیٰ حکمتِ رسالت کے تمام اسرار و غوامض اور معالجۂ اقوام اور طبابتِ عہد و ایّام کے تمام سرائر و خفایا، اس طرح کھول دے کہ وہ صرف ایک صحیفۂ کتاب و سنّت اپنے ہاتھوں میں لے کر دنیا کی ساری مشکلوں کا مقابلہ اور ارواح و قلوب کی ساری بیماریوں کی شفا کا اعلان کر دے۔ وَمَا ذَالِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ۔[149]

حضرات!

۱۹۱۴ء کے لیل و نہار قریب الاختتام تھے، جب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے یہ

## ۶

# خطبۂ صدارت

## جمعیۃ العلماء ہند

لاہور، ۱۸ نومبر ۱۹۲۱ء

حضرات!

مجھے اس موقع پر جو معروضات آپ کی خدمت میں پیش کرنا تھیں، خاص طور پر اصرار کیا گیا کہ میں اپنی عادت کے خلاف انھیں قلمبند کروں۔ یہ جس قدر بھی حصّہ خطبہ کا تھا، اگرچہ ایک حد تک بیصبری اور بدذوقی سے سنا گیا، لیکن بہرحال میں آپ کا مشکور ہوں کہ آپ نے یہ تمام حصہ سن لیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان متفرق داستانوں کے سننے کے بعد جو مختلف طُرق رہ چکے ہیں، اس کا ایک سرسری خاکہ آگیا ہوگا۔

اب اس کے بعد اس امر کی ضرورت تھی کہ دوسرے ٹکڑوں کی جانب توجہ ہوتی جو اگرچہ جمعیۃ العلماء کے عظیم مقصد میں داخل نہیں ہے۔ لیکن فی الحقیقت وقت کا یہ عظیم الشان مسئلہ ہے، جو نہ صرف جمعیۃ العلماء بلکہ عالمِ اسلامی کے ہر قائلِ لاالٰہ الاّ اللہ محمد رسول اللہ کے لیے بلکہ ہر انسانیت دوست اور انسانیت پسند انسان کے لیے جو مسئلہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا، وقت کا مسئلہ تھا اور ضرورت تھی کہ اس کی جانب میں متوجہ ہوتا، اور اس بارے میں بھی جمعیۃ العلماء کے مقاصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے آپ کے سامنے پیش کرتا لیکن اب

اس کے بعد ارادہ تھا کہ فوراً دوسرے صوبوں میں بھی کام شروع کر دیا جائے، لیکن بعض حضرات نے اس مسئلے کی نسبت اخبارات میں قیل و قال شروع کر دی اور بلا ضرورت علمائے ملت کا ایک عملی کام انتظارِ عوام میں بصورتِ اختلاف و جدل نمایاں کر دیا گیا۔ یہ چیز مجھ کو اس کام سے ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں روک سکتی تھی۔ مگر جب میں نے دیکھا کہ اب یہ مسئلہ منظرِ عام پر آچکا ہے اور جمعیۃ العلماء اس کا آخری اور قطعی فیصلہ کر سکتی ہے تو یہی مناسب معلوم ہوا کہ اسے جمعیۃ کے حوالے کر کے بالفعل سبکدوش ہو جاؤں۔ چنانچہ ارکانِ جمعیۃ کی ایک خاص مجلسِ شوریٰ منعقدۂ دہلی میں یہ مسئلہ پیش ہو کر بالاتفاق منظور ہوا، اور اب اس کا آخری فیصلہ اس اجلاس کے ہاتھ میں ہے۔

حضرات ارکانِ جمعیۃ و علمائے کرام! آپ کی جمعیۃ کے لیے شریعت کا مقررہ نظامِ عمل یہ ہے اور صرف یہی ایک راہ فوز و فلاح کی ہے۔

مسئلۂ خلافت کے سلسلے میں اس صحبت میں مجھے جو کچھ عرض کرنا ہے، وہ یہ ہے کہ مسئلۂ خلافت کے متعلق جو ہمارے مطالبات تھے، ان میں نہ تو کچھ گھٹا سکتے ہیں نہ بڑھا سکتے ہیں، نہ کوئی قدم پیچھے لے جا سکتے ہیں، نہ داہنے لے جا سکتے ہیں نہ بائیں؛ اس میں کسی طرح کے سمجھوتہ یا مفاہمت کا سوال نہیں ہو سکتا۔

اس بارے میں مسلمانوں کے مطالبات یہ تھے کہ جزیرۃ العرب کو غیر مسلم اثر سے بالکل پاک کر دینا چاہیے۔ جزیرۃ العرب کے متعلق ہمارا یہ اعلان تھا کہ جزیرۃ العرب صرف حرمین کا نام نہیں ہے۔ بلکہ عراق کا دو تہائی حصہ بھی حسب جغرافیہ اس میں داخل ہے؛ اس لیے عراق کی سرزمین، بصرہ کا علاقہ اور بغداد کا علاقہ جزیرۃ العرب میں داخل ہے۔ جس وقت تک انگریزوں کا اثر جزیرۃ العرب کی ایک چپہ زمین پر بھی باقی رہیگا، مسلمانانِ عالم کے لیے ناممکن ہے کہ وہ ایک لمحے کے لیے صلح و سمجھوتہ کا ہاتھ برٹش گورنمنٹ کی طرف بڑھا سکیں، جب تک ایک چپہ زمین پر، ایک انچ زمین پر، اتنے حصّہ پر کہ جتنے حصّہ پر عراق کے اڑنے والے گرد و غبار کا ایک ذرّہ آ سکتا ہے، اگر انگریز حکومت کا بلا واسطہ یا بالواسطہ اثر باقی رہے، یہ مسلمانوں کے لیے آسان ہے کہ بچھوؤں کے ساتھ، سانپوں کے ساتھ صلح کر لیں، پہاڑوں کے غاروں اور بھٹوں میں چلے جائیں، وہاں درندوں کے ساتھ صلح کر لیں، مگر یہ ممکن نہیں کہ انگریزوں کے سامنے صلح کا ہاتھ بڑھائیں۔

جزیرۃ العرب کے بعد مسئلۂ خلافت کے مطالبات کیا ہیں؟ وہ بھی آپ کو یاد ہیں۔ وقت کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے میں اس امر کی ضرورت سمجھتا ہوں کہ وہ بھی آپ کو یاد دلاؤں۔

دوسری اہم چیز ہمارے سامنے فلسطین کی وہ سرزمین ہے، جس کی تحریم ہمارے لیے ویسی ہی ضروری ہے۔ جب تک کہ اس کا ایک چپہ بھی غیر مسلم اثر میں باقی ہے، اس وقت تک محال ہے کہ ہمارے واسطے کسی صلح یا مفاہمت کا دروازہ کھل سکے۔ میں اس وقت ان دفعات کی تشریح نہ کرونگا، جو خلیفۃ المسلمین پر بصورتِ شرائط عائد کیے گئے، یا خلافت کے ان حقوق پر، جس وقت تک

اس وقت جلسے کا زیادہ بہتر، زیادہ مستعد حصہ اس خطبے میں صرف ہوچکا ہے اور جلسے کی موجودہ حالت اس کے لیے متحمل نہیں ہے کہ اب میں اس ٹکڑے کو زیادہ صراحت و تفصیل کے ساتھ عرض کردوں لیکن چند ضروری ٹکڑے ہیں جن کو اختصار کے ساتھ میں چاہتا ہوں گوش گزار کردوں۔

اس وقت میری آپ کے اس مجمع میں حیثیت کیا ہے؟ میں اس وقت آپ کے سامنے ایک واعظ، ایک داعی، ایک مقرر نہیں ہوں۔ میں اس لیے یہاں نہیں کھڑا ہوں کہ آپ کے کانوں اور آنکھوں کے لیے تماشا بنوں۔ میرا کام ایک خاص فرض کا ادا کرنا ہے؛ لوگوں کے حسن ظن نے مجھے اس جگہ پر کھڑا کیا ہے۔ میرا فرض یہ ہے کہ جمعیۃ العلماء کے تعلق کو ملحوظ رکھتے ہوئے جن خیالات کا اعلان ہونا چاہیے، وہ عرض کردوں۔ اس وقت اگر آپ واعظانہ صحبتوں کا وقت لے کر آئے ہوئے ہیں، تو اس کا بہترین وقت آپ کے سامنے آنے والا ہے۔ اس وقت جو بیان آئے گا، وہ ادائے فرض ہے۔ سب سے پہلے جو مسئلہ اس سلسلے میں ہمارے سامنے آتا ہے، وہ وہی مسئلہ ہے جو تمھاری زبانوں پر نہیں، بلکہ تمھارے دلوں کے صفحوں پر نقش ہے یعنی مسئلۂ خلافت۔ مسئلۂ خلافت کا تعلق، اس کی اہمیت، اس کے متعلق عمل میں مسلمانوں کے اوپر وجوب، مسلمانوں کے لیے ان کی ضرورت، نہ صرف ضرورت بلکہ ایمان وکفر کے امتحان گاہ کا ان کے لیے پیدا ہوجانا؛ ان تمام پہلوؤں کو نہایت تشریح کے ساتھ گزشتہ دو سال کے اندر میں بیان کرچکا ہوں۔ اور میں نہیں چاہونگا کہ وہ دُہرائی ہوئی داستان پھر آپ کے سامنے دہراؤں۔

وقت کے حالات اس امر کا ضرور داعیہ رکھتے ہیں کہ اس امر کو ظاہر کردوں کہ خلافت کے متعلق مسلمانانِ عالم اور علی الخصوص مسلمانانِ ہند کے مطالبات شرعی کیا تھے، تاکہ ایک مرتبہ ان مطالبات کا اعادہ موجودہ حالت کے اعتبار سے اس امر کا فیصلہ کردے کہ ہمارے مطالبات کیا ہیں! اور ان مطالبات کی نوعیت اور صورت کیا ہے اور وہ دنیا کے ہر طرح کے خیالات سے، ہر طرح کی مفاہمت سے، سمجھوتوں سے بالکل بالاتر ہے، کسی طرح کی گنجائش باقی نہیں ہے۔

میرا مقصد وہ حادثہ ہے جس حادثہ کو آپ میں سے تقریبًا تمام اخبار بین اور باخبر حضرات مختلف اخبارات میں پڑھ چکے ہونگے۔ میرا مقصد جنوبی ہند یعنی مدراس و مالابار کے اس حادثے سے ہے، جس کے متعلق طرح طرح کے نتائج و حالات آپ کے سامنے آ چکے ہیں۔ اس موقع پر جمعیۃ العلمار کے اس مجمع میں یقینًا اپنا فرض محسوس کرتا ہوں کہ پوری ذمہ داری کے ساتھ اس واقعے کی نسبت احکامِ شرع کی رُو سے جو ہمارا اعلان ہو سکتا ہے، اس اعلان کو اختصار کے ساتھ بیان کر دوں، تاکہ اس کے متعلق نہ کسی طرح کا اخفا رہے، نہ غلط فہمی، اور نہ پیچیدگی باقی رہے۔ اس واسطے آپ مجھے اجازت دینگے کہ موپلاؤں کے متعلق کچھ عرض کر دوں۔

میں اس وقت اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ جو واقعات ہوئے، ان کے علل کیا ہیں؛ اور جو داستانیں اس وقت تک ہمارے کانوں سے ٹکرا چکی ہیں، ان کی صداقت کیا ہے! اب تک وہاں کے حالات تاریکی میں ہیں، ان کی روشنی ہم تک نہیں آئی۔ ایک واقعہ ہمارے سامنے آتا ہے اور ایک پہلو کو نمایاں کرتا ہے۔ مدراس میل کا نامہ نگار ایک واقعہ لکھتا ہے، اس سے دوسری صورت ہمارے سامنے نمایاں ہوتی ہے۔ حقیقت میں اور صداقت میں اور ان واقعات میں ایسی صورت حائل ہے کہ وہاں کے اصلی حالات کو ہمارے سامنے آنے نہیں دیتی۔ آپ اس امر کا فیصلہ کر لیں کہ اس حادثے کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے۔ میں جو کچھ عرض کرونگا، وہ اس قدر صاف اور واضح ہے کہ آپ میں سے کسی کو اس سے متفق ہوتے تامّل نہ ہوگا۔

دو چیزوں کے متعلق میرا فرض ہے کہ میں صاف صاف اعلان کر دوں۔ پہلی چیز وہ واقعہ ہے کہ جو وہاں رُونما ہوا یعنی وہ لڑائی، وہ جنگ، وہ فساد، وہ تشدّد جو وہاں واقع ہوا ہے اور اس وقت تک اصلیّت ہمارے سامنے موجود نہیں ہے۔ یہ خبر بھی بار بار بیان کی گئی ہے کہ موپلاؤں نے وہاں انگریزی حکومت سے لڑائی کی، تلوار اٹھائی، اس کی عدالتوں اور اس کی حکومتوں سے لڑائی کی۔ اور یہ جو انھوں نے شمشیر زنی کی، یہ واقعی انھوں نے خلافت کا

ان شرائط میں سے کوئی ایک شرط بھی باقی ہے، اس وقت تک مسلمانانِ ہند کے لیے محالِ قطعی ہے کہ وہ صلح کا، اتفاق کا کوئی ہاتھ بھی اس گورنمنٹ کی طرف بڑھا سکیں۔ میں یہ بھی کہے دیتا ہوں کہ اب جب کہ حالات نے پلٹا کھایا، واقعات نے اپنا ورق الٹا اور حضرت غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی فوجوں نے یقیناً موجودہ جنگ کے میدان ہی کو نہیں، بلکہ وسطِ ایشیا کے میدان کو ہمیشہ کے لیے فتح کر لیا، تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے سامنے بار بار اس طرح کی چیزیں لائی جاتی ہیں۔ اور ظاہر کیا جاتا ہے کہ آج مسلمانوں کے مطالباتِ خلافت کے لیے سب سے زیادہ اہم چیز سمرنا ہے۔

لیکن میں اس وقت اس امر کا اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ سمرنا اور تھریس کا میدان؛ فی الحقیقت وہ دونوں ایسے میدان تھے کہ اس کا فیصلہ ہو سکتا تھا، تو ہندستان کے مسلمانوں کی آہ و فغاں سے نہیں، بلکہ زندہ انسانوں کے ذریعہ ہو سکتا تھا۔ اس کی بنیاد یہ تھی کہ فی الحقیقت تمام مسئلۂ خلافت میں یہ ظلم اتنا نمایاں اور ابھرا ہوا تھا کہ بار بار مقررینِ خلافت اپنی تقریروں میں اس کا ذکر کیا کرتے تھے، یہ دونوں علاقے یونان کو دلائے گئے۔ حالانکہ یونان فریقِ جنگ نہ تھا، جنگ سے ان کا تعلق نہ تھا۔ اس کو بار بار نمایاں کر کے پیش کیا جاتا تھا، لیکن اس سے یہ مقصد نہ تھا کہ مطالباتِ خلافت میں اس کی اہمیت بمقابلہ دیگر معاملات کے ہے۔ میں اس امر کا اعلان کر دینے کے لیے تیار ہوں کہ سمرنا اور تھریس کو غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی تلوار کی نوک کی قسمت پر چھوڑ دیجیے۔ ہمارا مطالبہ جزیرۃ العرب، فلسطین اور شام کے لیے ہے، بیت المقدس کے لیے ہے؛ اور ان شرائط کے لیے ہے، جو پایگاہ خلافت کے لیے عائد کی گئیں۔

مسئلۂ خلافت کے متعلق جو عرض کرنا تھا، وہ چند اشارات تھے جو آپ کے گوش گزار کر دیے۔ میرے فرائض میں سے ایک نہایت اہم فرض یہ بھی ہے کہ ایک دوسری جانب بھی کچھ نہ کچھ اشارہ کروں۔

تمام حقیقتیں آپ کے سامنے منکشف ہوگئیں۔ پھر جب مسلمانوں کی بڑی سے بڑی ذمہ دار جماعت جو ہوسکتی تھی، احکام شرع کی رُو سے وہ یہی جمعیۃ العلماء ہے۔ اس نے یہ راہِ عمل قرار دی کہ مطالباتِ خلافت پورا کرنے کے لیے مسلمانوں کو جو طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے وہ طرزِ عمل لڑائی کا نہیں ہے، قتال کا نہیں ہے، جنگ کا نہیں ہے، خونریزی کا نہیں ہے، بلکہ اس راہ کو امن وسکون کے ساتھ طے کرنا چاہیے۔

پھر جمعیۃ العلماء کا یہ فیصلہ تھا، اس نے جو بڑی سے بڑی جماعت ملک میں ہوسکتی ہے، جس وقت اس امر کا اعلان کر دیا، تو میں ان کو احکام شرعی کی رُو سے بتلانا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کی کسی جماعت، کسی گوشۂ ملک کو خواہ وہ مالابار ہو یا ہندستان کا کوئی گوشہ، جہاں مسلمان بستے ہوں، بشرطیکہ ان کی جماعت کو اس فیصلہ کی اطلاع ہوچکی ہو، احکام شرعیہ کی رُو سے ان احکام کے بعد جائز نہیں ہے کہ اس جماعتی فیصلہ سے اپنے قدم کو باہر نکالے اور اس طرزِ عمل کو اختیار کرے جس طرزِ عمل کو مسلمانوں نے بحیثیتِ جماعت رَد کر دیا ہے۔ میں اس امر کا اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر موپلاؤں نے خلافت کے مقصد کو لے کر تلوار اٹھائی اور جنگ کی، تو ان کا یہ عمل اس جماعتی فیصلہ کے خلاف تھا، جو ہندستان کے علماء نے کیا ہے؛ اس لیے یقیناً ان کو ملامت کی جاسکتی ہے۔ انھیں کسی حالت میں یہ حق نہ تھا کہ وہ ہندستان کے جماعتی فیصلہ سے قدم باہر نکالیں، اور ہندستان کے کسی گوشے کو اس امر کا اختیار نہ ہوگا کہ مسلمانوں کی جماعت نے جو فیصلہ کر دیا ہے اس سے رُوگردانی کریں۔ انفراداً اس کا اصول تم کو معلوم ہے، اس کا معیار تم کو معلوم ہے۔ بحیثیت جماعت کے جو عمل انھوں نے اختیار کیا، بلا کسی تاویل کے یہ کھلی ہوئی چیز ہے کہ جب جمعیۃ العلماء نے فیصلہ کر لیا، خواہ استطاعت نہ ہونے کی وجہ سے، خواہ سروسامان نہ ہونے کی وجہ سے، جب انھوں نے فیصلہ کیا کہ جو راہ تمھیں اس وقت اختیار کرنا ہے، وہ تلوار کی نہیں ہے؛ بلکہ اور حقیقتیں ہیں، جن کے ذریعے سے اس مقصد کو ڈھونڈھنا چاہیے۔

نام لے کر کیا۔ اور اس اعلان کے ساتھ کیا کہ خلافت کے مسئلے سے جو فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں ان کی وجہ سے ہم نے تلوار اٹھائی۔ میں نہیں جانتا کہ وہاں کے اصل واقعات کیا ہیں۔ اگر بالفرض یہ واقعہ صحیح ہو، اور وہاں کے موپلاؤں نے یہ کیا ہو، تو ہمارے واسطے یہ بالکل صاف اور ہر طرح کے شبہہ سے پاک ہے۔

فی الحقیقت اسلام کا نظامِ شرعی یہ ہے کہ جب مسلمانوں کے تمام علمار، مسلمانوں کے عام اہل الرائے، مسلمانوں کے عام اہلِ حل و عقد مجتمع ہو کر ایک فیصلہ کر دیں اور اس فیصلے کا اعلان کر دیں تو بلا شبہہ تمام مسلمانوں کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اس فیصلے کو جمعیۃ کا فیصلہ سمجھیں، جمعیۃ کے ساتھ رہیں، اور اس سے قدم نہ ہٹائیں۔ ہندستان میں بدبختی سے کوئی نظامِ شرعی، جماعت اور قوم کے لیے نہیں ہے۔ ایسی حالت میں فی الحقیقت اگر منصبِ امامت کے فرض کو ادا کرنے کا کسی جماعت کو حق حاصل ہے، تو وہ علما کی جماعت ہے، اہلِ بصیرت کی جماعت ہے، اور ان تمام لوگوں کی جماعت ہے جن کو اسلام اپنے یہاں اربابِ حل و عقد کے نام سے موسوم کرتا ہے، خواہ خلافت کی جماعت ہو یا جمعیۃ العلمائ کی مقدس جماعت۔ اس جماعت نے کامل غور و فکر کے بعد، تمام حالات کے دیکھنے کے بعد، اس امر کا فیصلہ کیا اور اعلان کر دیا کہ اس وقت ہم نے اپنے فرائضِ شرعی کے انجام دینے کے لیے مطالباتِ خلافت کے پورا کر دینے کے لیے جو راہ اختیار کی ہے، یہ راہ بلا قتل کیے اور بلا جنگ کیے ہے۔

میں نے وہ لفظ نہیں کہا، جو تمھاری زبان پر جاری ہوتا ہے، یعنی تشدّد یا عدمِ تشدّد۔ اس امر کا انھوں نے قطعی فیصلہ کر دیا کہ مسلمانوں نے اپنے فرائضِ شرعی کی انجام دہی کے لیے جو طریقہ اختیار کیا ہے، وہ یہ ہے جس کو سکون کے ساتھ، بلا کسی قتل کے، بلا کسی ایسی حرکت کے جو لڑائی کی ہو، سکون اور امن کے ساتھ اس راہ کو طے کرنا چاہیے۔ میں اس کے دلائل پر بحث نہ کروں گا۔ اگر وقت نے موقع دیا، تو سن لوگے کہ اس کی تشریح کیا ہے۔ اب

ہیں، وہ مخفی نہ ہوں۔ ہمارا کھلا ہوا آشکارا مذہب ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم بیان کردیں کہ ہمارا مقصد کیا ہے، جیساکہ ہمارے بہت سے علمار نے شائع کیا ہے۔ ہر شخص متفق ہوگا کہ اگر وہاں کے مسلمانوں نے محض اپنے دل کا غبار نکالنے کے لیے یا ان سے انتقام لینے کے لیے ظلم و جبر کرکے مسلمان بنانا چاہا ہے، تو ہم میں سے ہر شخص جس کو شریعت کا علم ہے، اس کا اعلان کریگا، کہ اگر انھوں نے ایسا کیا ہے تو ان کا ایسا کرنا شریعت کا عمل نہیں ہے، بلکہ شریعت کی توہین ہے شریعت نے کبھی حکم نہیں دیا ہے کہ جبراً مسلمان بنایا جائے۔ جن پر شریعت نے جبر کیا تھا ان کے لیے بھی جزیہ کی راہ رکھی تھی۔ جن حالات میں یہ کیا گیا ہے، اس بے قاعدگی کو دیکھتے ہوئے کسی طرح کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ ایک لمحہ کے لیے ان کا یہ فعل اسلامی فعل تھا۔ مسلمان اس اعلان کے لیے تیار ہیں کہ ان کے اس جبر سے، اس ظلم سے، بشرطیکہ جبر ہوا ہو، ہندستان کے کسی مسلمان کو دلی ہمدردی نہ ہوگی۔ ہماری ہمدردیاں انہی اسباب پر ہیں جو حق ہیں۔

اس کے بعد اگرچہ مطالبات بیشمار ہیں، لیکن ابھی میں نے ضمناً ایک چیز کہہ دی ہے۔ قبل اس کے کہ میں اپنے مختصر بیان کو ختم کروں۔ چاہتا ہوں کہ ایک غلط فہمی جو عام طور پر پھیلی ہوئی ہے، الحمد للہ عمل میں نہیں، فعل میں نہیں، لیکن لفظوں میں اختصار کے ساتھ اس غلط فہمی کا ازالہ کردوں۔

تشدد و عدمِ تشدد، یہ دو چیزیں ہیں، جو اس وقت ہمارے سامنے آئی ہیں؛ اور جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ہم نے عدمِ تشدد کی راہ اختیار کی ہے۔ نیز یہ بھی بار بار کہا جاتا ہے، بطور ایک مسلم عقیدہ کے کہ اگرچہ بحیثیت مسلمان ہونے کے مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ وہ تشدد کریں لیکن وقت کی ضرورتوں کو دیکھ کر انھوں نے اس عقیدے کو ملتوی کردیا ہے۔ اس بارے میں چند الفاظ عرض کرونگا، اگرچہ وقت کوتاہ ہے اور جتنی تفصیل کی ضرورت ہے، اتنی گنجایش نہیں ہے۔

سب سے پہلے یہ چیز لونگا کہ فی الحقیقت تشدد اور عدمِ تشدد کی لفظی ترکیب جو اختیار کی

جب مسلمانوں کا متفقہ فیصلہ یہ ہوا تو مسلمانوں کے لیے یہ جائز نہ تھا کہ اس سے قدم باہر نکالیں اگر انھوں نے قدم باہر نکالا، تو انھوں نے ترکِ اجماع کیا۔ اس کے لیے ہم انھیں ملامت کر سکتے ہیں، سرزنش کر سکتے ہیں۔ ان کے اس ترکِ اجماع سے ہماری اس جماعت کو نقصان پہنچا ہے، تو احکامِ شرع کی رُو سے ان کی تعزیر کی جا سکتی ہے۔ بلاشبہہ اس اعتبار سے یہ کھلی ہوئی چیز ہے، یہ حقیقت ہر شخص کو معلوم ہے کہ خلافت کے مطالبات کی رُو سے اور خلافت کے مقاصد کو اگر ترک کر دیجیے جب بھی، ہندستان کے مقتضیات کی رُو سے، ہندستان کے مسلمانوں کا فرض تھا کہ وہ اللہ کی راہ میں قتال کے لیے اٹھتے اور اپنی لاشوں کو تڑپاتے۔ موپلاؤں نے یا کسی مسلمان نے اگر یہ سمجھ کر کہ ہم اس کو احکامِ شرع کی رُو سے جہاد فی سبیل اللہ کر رہے ہیں، تو یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہم اس کو گناہ نہیں کہہ سکتے۔ اس وقت نفسِ عمل سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ لیکن بحث یہ ہے کہ جن حالات میں وہ عمل کیا گیا، جن وقتوں میں وہ عمل کیا گیا، اس کے اعتبار سے اس کے احکام کیا ہیں؟ بلاشبہہ شریعت نے جو روشنی ہمارے سامنے پھیلائی ہے، ہم دیکھ سکتے ہیں کہ علماء کا فیصلہ اس کے خلاف تھا۔ اس وقت جو راہ ہم نے اختیار کی ہے، یہ تلواروں کی نہیں ہے۔ جب انھوں نے یہ فیصلہ کر لیا، تو مالابار کے مسلمانوں کو یہ حق نہ تھا کہ وہ جمعیۃ کے التزام کو ترک کر دیں۔ اگر انھوں نے ایسا کیا تھا، تو انھیں سرزنش کی جا سکتی ہے۔ لیکن حقیقتاً وہاں واقعات کیا رونما ہوئے ہیں، اس کے متعلق میں صحیح حالات نہیں بتا سکتا۔

بعض لوگوں نے بیان کیا کہ موپلا مسلمانوں نے جو کچھ کیا منجملہ ان کے ایک بات یہ بھی بیان کی گئی کہ انھوں نے اس بستی والے ہندوؤں پر جبر کیا، اور جبراً ان کو مسلمان بنانا چاہا۔ صحیح واقعات ہمارے سامنے نہیں؛ یہ چیز جو ہمارے سامنے پیش کی گئی، بیسیوں افسانے ہیں، جو اس کے خلاف ہمارے پاس پہنچ چکے ہیں۔ خود میرے پاس متعدد خطوط مالابار سے آچکے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے مان لیا جائے کہ یہ واقعات صحیح ہیں، تو ہمیں چاہیے کہ جو ہمارے اعتقادات

جو انسانوں کے خون سے تلوار پر جمتی ہے۔

ہم کو اس سے انکار نہیں کہ اسلام نے جنگ کی اجازت دی ہے، لیکن خاص شرائط کے ماتحت۔ جس طرح دنیا کی تمام قوموں نے، دنیا کے کل مذاہب نے قولاً و فعلاً تقریباً دنیا کی تمام قوموں اور تمام جمعیتِ بشری نے، اس چیز کا اعتراف کیا ہے۔ اس بنا پر تشدّد اور عدم تشدّد کا جو استعمال کیا جا رہا ہے، ان معنوں میں کسی طرح یہ استعمال صحیح نہیں ہے۔ تشدّد تو اسلام کے نقطۂ فکر سے کسی حالت میں جائز نہیں ہو سکتا۔ تشدّد کا حکم اسلام نے کسی حالت میں نہیں دیا ہے۔ جنگ کا حکم دیا ہے جب کہ جنگ عدل قائم رکھنے کے لیے ہو۔ تم کو معلوم ہے کہ جج بھی قتل کرتا ہے اور ایک ڈاکو بھی۔ جج قتل کرتا ہے پھانسی کے تختہ پر؛ ڈاکو قتل کرتا ہے مظلوم انسانوں کے بستروں پر۔ لیکن دنیا جج کی تعریف کرتی ہے اور ڈاکو پر لعنت کرتی ہے۔ حال آنکہ دونوں نے قتل انسان کا کیا ہے۔ لیکن ایک نے جو قتل کیا ہے، زیادتی کے لیے اور دوسرے نے جو قتل کیا ہے وہ دفعِ تشدّد کے لیے۔ خدا نے عدل کے قیام کے لیے، انسانی حقوق کی حفاظت کے لیے، جنگ کو جائز رکھا ہے، اس کے لیے تشدّد کا اطلاق کرنا صحیح نہیں ہے۔

اب یہ دیکھو کہ مان لیا جائے کہ تشدّد سے مقصود واقعی جنگ ہے، لڑائی ہے۔ لیکن اب اس بارے میں ہمارا موجودہ طرزِ عمل کیا ہے؟ اس بارے میں یہ حقیقت واضح کرنا چاہتا ہوں کہ آپ میں سے کوئی عزیز جو یہ سمجھتا ہو کہ اس جمعیۃ العلماء کے اعضا و اراکین نے اس امر کا اعلان محض کسی شخصی رائے کی بنا پر کیا ہے، کسی وقتی مصلحت کی بنا پر کیا ہے، اگر ایک لمحہ کے لیے بھی آپ میں سے کسی کا یہ خیال ہو، تو آپ پر واضح ہو جائے کہ آپ کا خیال ایک لمحہ کے لیے بھی درست ہو، تو مسلمانوں کے لیے کسی ایسے عمل کے ترک کا مستحسن ہونا تو درکنار، اس سے بڑھ کر کوئی اور ملحدانہ عمل نہیں ہو سکتا۔ اگر مسلمان شریعت کی کسی تعلیم کو محض چند انسانوں کی خوشنودی کی خاطر ایک لمحے کے لیے بھی چھوڑ دیں، ترک کر دیں، کوئی اس طرح کا سمجھوتہ کر لیں، مفاہمت

گئی، یہ ترکیب ہی غلط ہے۔ اگر تشدّد سے مقصود ہے تشدّدِ لغوی، تو میں آپ سے کہتا ہوں کہ اسلام نے کسی حالت میں ایک لمحے کے لیے مسلمانوں کی کسی جماعت کو، کسی فرد کو، تشدّد کا حکم نہیں دیا ہے۔

تشدّد کے معنی ہیں ظلم کے، اسراف و اتلافِ حق کے۔ پھر کیا ایک لمحہ کے لیے بھی اسلام نے ظلم کا حکم دیا ہے، اسراف کا حکم دیا ہے، بیجا زیادتی کا حکم دیا ہے؟ اسلام نے ان میں سے کسی ایک چیز کا حکم نہیں دیا۔ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر تشدّد سے مقصود یہی ہے کہ جو معنی اس کے ہیں، زیادتی کرنا، سختی کرنا، تو میں آپ کو بتلانا چاہتا ہوں کہ ایک منٹ کے لیے بھی اسلام نے کسی حالت میں زیادتی و سختی کی اجازت نہیں دی۔ ایک اور چیز ہے جس کی اسلام نے اجازت دی ہے۔ وہ تشدّد نہیں ہے، زیادتی نہیں ہے، ظلم نہیں ہے، مار پیٹ نہیں ہے، بلکہ وہ دوسری چیز ہے۔ اس کا نام ہے: جنگ و قتال، لڑائی۔ یہ ایک منظّم عمل ہے۔ جس کے شرائط ہیں، حالات ہیں، جو اس لیے نہیں ہیں کہ ظلم کو قائم کرے، زیادتی کرے، سختی کرے، بلکہ اس لیے ہے کہ حقوق و عدل کو دنیا میں قائم کرے۔ بلاشبہہ اسلام نے، شریعت نے جنگ کا حکم دیا ہے، جس طرح انسان کی فطرت اور نیچر جائز رکھتی ہے۔ میں ایک منٹ کے لیے بھی تسلیم نہ کرونگا کہ اس نے تشدّد کا حکم دیا ہے۔ جنگ دوسری چیز ہے؛ خونریزی، مار پیٹ، قتل و غارت دوسری چیز ہے۔ اسلام نے اس چیز کا حکم کبھی نہیں دیا ہے، جس کو خونریزی سے تعبیر کرتے ہو، اس واسطے کہ وہ یہ حقیقت پیش کرتا ہے کہ دنیا میں خدا عالمگیر برادری کو قائم کرتا ہے لیکن دنیا میں ایک لمحہ کے لیے خدا کی محبّت قائم نہیں رہ سکتی، جب تک محبّت مٹانے والے دنیا میں باقی ہیں۔ اس واسطے عدل کے قیام کے لیے، محبت کے قیام کے لیے نوعِ انسانی کی عالمگیر اخوت کے قیام کے لیے ضرورت ہے کہ جنگ کا وجود ہو، لڑائی کا وجود ہو۔ جو خدا کی زمین کو پامال کرنا چاہیں، جن کا وجود دنیا میں ظلم کے لیے ہے؛ بلاشبہہ ان کے وجود کی گندگی سے زمین کو پاک کرنے کے لیے ضرورت ہے کہ تلوار بھی ہو اور وہ سرخی بھی ہو،

شخصی رائے پر نہیں ہے، بلکہ فی الحقیقت اس کی بنیاد شریعت کے نظام پر ہے؛ اس روشنی پر ہے، جو شریعت کی رُو سے ہمارے سامنے آتی ہے اور بتاتی ہے کہ ہمارے لیے وہی صحیح راہ ہوسکتی ہے، جو ہم نے اختیار کی ہے؛ اور جسے ہمیں آخر تک پہنچانا ہے۔

میرے دوست مولوی حسرت موہانی[۲] نے فرمایا کہ اس امر کا اعلان کر دیا جائے کہ کیا دفاعی جنگ بھی ممنوع ہے؛ دفاعی جنگ: ڈیفنس میں لڑنا۔ دفاع کا کیا سوال ہے! میرا اعتقاد ہے کہ قرآن نے جن حالتوں میں مسلمانوں کو جنگ کا حکم دیا ہے، وہ دفاعی ہی نہیں ہے بلکہ ہجوم کی جنگ بھی ہے۔ موپلاؤں اور مسلمانوں کی جماعت کے لیے بعد اس کے کہ مسلمانوں کے اہل الرائے نے، صاحب بصیرت نے، ان سب نے جو متفق ہوکر، متحد ہوکر، اس امر کا اعلان کیا کہ ہندستان کے مسلمانوں کے لیے یہ راہِ عمل ہے۔ تو ہندستان کے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس سے علیحدہ قدم نہ لے جائے۔ مقصد اس وقت یہ ہے اور بلاشبہہ یہ کھلی حقیقت ہے۔ اگر موپلاؤں نے ان ایّام میں تلوار اٹھائی، تو ان کا یہ فعل ہماری اس جماعت کے فیصلے کے خلاف ہے۔ اور اب ان کے اس فعل سے ہمارے تمام مقاصد پر جو اثرات پڑینگے، ان کی بنا پر ہم ہمیشہ حکم لگائینگے۔ اگر ان سے ہم کو مشکلات پیش آئیں، جن کی مصالحت کی ہمیں ضرورت ہے، تو ہم اس سے زیادہ سخت رائے ظاہر کریں گے، اور احکام لگائینگے کیونکہ ان کا یہ فعل ایسا فعل ہے کہ انھوں نے جمعیۃ کے فیصلہ کو ترک کر کے کیا، بشرطیکہ انھیں جمعیت کے فیصلے کا علم ہو۔

کالی کٹ تک میں خود جا چکا ہوں اور ان لوگوں سے مل چکا ہوں۔ یہ چیز کہ خلافت کمیٹی کا اعلان کیا ہے، ہندستان کے علمار کا اعلان کیا ہے، یہ چیز پہلے ان کی نظروں سے پوشیدہ تھی۔ اگرچہ یہ سچ ہے کہ جس درجہ اعلان ہونا چاہیے تھا ویسا اعلان نہیں ہوا، لیکن اگر ان کو علم تھا اور انھوں نے باوجود علم کے قدم اٹھایا، تو ان کا قدم جمعیۃ کے قدم، جمعیۃ کے عمل، جمعیۃ کے فیصلے کے خلاف ہے، اس سبیل کے خلاف ہے، جو ہندستان کے علمار کی جماعت نے اپنے لیے نکالا۔

کرلیں، تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ عمل اسلامی عمل نہیں ہے، یہ ایک سخت سے سخت ملحدانہ عمل ہے، جس سے بڑھ کر ملحدانہ عمل مسلمانوں کے لیے نہیں ہوسکتا کسی حالت میں مسلمانوں کے لیے جائز نہیں ہے کہ اسلام کی چھوٹی سے چھوٹی فرع کو ایک لمحہ کے لیے بھی ترک کردیں۔

اگر مسلمانوں نے تمھاری بولی میں ترکِ تشدّد کی پالیسی اس لیے اختیار کی ہے کہ چند انسانوں کی مصلحتیں اور چند انسانوں کی آرا ان کے سامنے آگئی ہیں تو اول تو یہ حقیقت کے خلاف ہے اور یہ اتنا بڑا سوءِ ظن ہے کہ اس سے بڑھ کر سوءِ ظن مسلمانوں کے لیے نہیں ہوسکتا کہ اس بڑی جماعت نے وہ عمل کیا ہے، جس کے معنی ہیں خدا کی شریعت سے منہ موڑ لینے کے۔ اس نے گردن نہیں موڑی ہے۔ اس نے جو اعلان کیا ہے اس کی بنا احکامِ شریعت پر ہے۔ بلاشبہہ موجودہ حالت میں احکامِ شرع کی رُو سے ہندستان کے مسلمانوں کے لیے جو شرعی عمل ہوسکتا تھا، وہ وہی تھا جو انھوں نے کیا؛ اور مسلمانوں کے علما کا اس پر مستقل ہوجانا کہ مسئلۂ خلافت کے لیے جن کاموں کو انجام دینگے بلا لڑائی لڑے ہوئے ہمیں انجام دینا چاہیے اس کی بنیاد بھی نظامِ شرعی پر ہے، محض ایک فرد یا ایک جماعت کی رائے نہیں ہے۔ اگر ایسا ہو تو اس آسمان کے نیچے کسی بڑے سے بڑے امام و خلیفہ کو بڑے سے بڑے عالم کو ایک منٹ کے لیے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اللہ کی شریعت کے خلاف کسی چھوٹی سے چھوٹی فرع کے خلاف، خدا کے چند بندوں سے سمجھوتہ کرلیں۔ اگر ایسا کیا گیا تو اس سے بڑھ کر کوئی ضلالت نہیں ہوسکتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر سوءِ ظن ایک لمحہ کے لیے بھی ممکن ہوتا تو ہم کو اپنی بدبختی پر شہادت دینی پڑتی۔

جمعیۃ العلما نے اور ذمہ دار جماعتوں نے جو راستہ اختیار کیا ہے، وہ راستہ لڑائی کا نہیں ہے، جنگ کا نہیں ہے، حرب کا نہیں ہے، قتال کا نہیں ہے، خونریزی کا نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو جو راہ اختیار کرنا ہے وہ امنِ شرعی کی اور پُرسکون راہ ہے۔ ان کا یہ فیصلہ کسی

اب ہندستان کے مسلمان جن کی تعداد دس کروڑ تک پہنچتی ہے اور جو دو سو برس سے اس زندگی کو گوارا کیے ہوئے ہیں، اب ہندستان کے مسلمان کیونکر اپنے فرائضِ شرعی کو انجام دیں۔ تو اگر ہندستان کے علما نے، اہل الرائے نے اس امر کا فیصلہ کر لیا کہ بلا شبہہ ایسی منزل عمل میں آگئی ہے، ایسے نتائج موجود ہیں، اس طرح کی بے استطاعتی، اس طرح کی غفلت و بے سرو سامانی آج تمھاری کمر میں نہیں ہے، بلکہ تمھارے دلوں میں پیدا ہو گئی ہے۔ تلوار ایک لوہار کے یہاں نہیں، تو دوسری جگہ مل جائیگی۔ ہندستان کے علما نے اگر یہ فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کے لیے یہ حکم ہے کہ تمام مصائب کو جھیل جائیں؛ حملہ ہو، تو اس کو بھی جھیل جائیں؛ قید خانے کے دروازے کھولے جائیں، تو اس کو بھی جھیل جائیں؛ اگر انھوں نے یہ فیصلہ احکامِ شرع کے خلاف نہیں کیا ہے، تو مسلمانوں کو چاہیے کہ اس پر عمل پیرا ہوں۔ مقصد یہ تھا کہ موجودہ حالت میں جب ہندستان کے مسلمانوں نے بحیثیت جماعت کے یہ فیصلہ کر لیا تو ہندستان کے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کی پیروی کرے؛ اس سے منحرف نہ ہو۔

موپلا اور مالابار کے مسلمانوں نے اگر یہ سوچا ہے، تو اس کے کہہ دینے میں ہم کوئی باک نہیں رکھتے کہ انھوں نے ایسا کیا، تو مسلمانانِ ہند کے متفقہ طرزِ عمل سے انحراف کیا۔ یقیناً ان کو ملامت کی جا سکتی ہے اور ان کو سرزنش کی جا سکتی ہے؛ اس عمل کے وہ ذمہ دار ہیں، ہم شریک نہیں ہیں۔

اس امر کے متعلق جو کچھ مجھے عرض کرنا تھا کر چکا۔ تشدد کے متعلق جس چیز کو ظاہر کرنا چاہتا تھا، یہ تھا کہ ہم نے یہ طرزِ عمل اختیار کیا ہے۔ تو محض اس لیے کہ چونکہ علمائے دین کا فیصلہ ہے۔ اس طرح کسی انسان کا پیشرو ہونا، کسی قائل لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے لیے جائز نہیں ہے۔ پس ہمارا یہ بھی فرض ہے کہ معلوم کریں کہ تمھاری زبان کے مطابق مسلمان عدم تشدد پر عامل رہینگے، تو اس کی کیا وجہ ہے؟ امید ہے کہ آنے والے دو دنوں کے اندر وہ بھی آپ کے سامنے آجائے۔

یقیناً ہم اس کا بھی اعلان کرسکتے ہیں کہ آج کے بعد بھی ہندستان کے علمار کے خاص جماعتی فیصلے کے خلاف ہندستان کے مسلمانوں کا کوئی فرد، کوئی جماعت جو کام کریگی، اگر وہ اس جماعتی فیصلے کے خلاف ہے، تو یقیناً اس کو ملامت کی جائیگی؛ سرزنش کی جائیگی؛ شریعت کے احکام ہم کو مجبور کرینگے کہ ہم انگلیاں اٹھائیں۔

موپلاؤں کی حرکات کے متعلق جو رائے میں دے سکتا ہوں، یہ رائے تھی۔ اس وقت بحث یہ ہے کہ جو چیز ہمارے سامنے لائی گئی، جو صورت ہمارے سامنے پیش کی گئی ہے، کہا جاتا ہے کہ بلا حملہ کے انھوں نے مطالباتِ خلافت کا نام لے کر تلوار اٹھائی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ واقعات کیا ہیں! ہمارے پاس بہت سے ایسے خطوط ہیں، جن سے اس واقعے کی تکذیب ہوتی ہے۔ میرے پاس اس قسم کا مواد موجود ہے، صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ جھوٹے تھے۔ وہاں بھی وہ واقعات کیے گئے جو آج ہندستان کے گوشے گوشے میں کیے گئے۔ ایک حد تک انھوں نے صبر کیا۔ جب پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا تو اس کا قدرتی نتیجہ تھا کہ پیمانہ چھلکے۔ اگر ان پر حملہ کیا گیا، اگر ان پر کسی فوج اور کسی حکومت نے کسی جماعت نے حملہ کیا ہو؛ یا مثلاً ہم پر اس وقت حملہ ہو، تو اس کی کئی صورتیں ہیں۔ ایک صورت تو متعلق ہے عام حالات حملہ آور کے۔ اس کے جواب میں قرآن بتلا چکا کہ یقیناً مسلمانوں کو حفاظت کرنا چاہیے، تلوار اٹھانا چاہیے، اور مقابلہ کرنا چاہیے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہندستان میں جو ایک خاص طرح کی بدبختانہ زندگی ڈیڑھ سو برس سے ہندستان کے مسلمان برداشت کر رہے ہیں اور جس طرح انھوں نے اپنی غفلت کی وجہ سے، نامرادی کی وجہ سے، سرکشی کی وجہ سے، تعلیمِ الٰہی سے اعراض کی وجہ سے، جو طریقہ اختیار کر لیا کہ وہ اس درجہ اس حالت میں غرق ہوگئے ہیں کہ اس حالت سے ان کو نکالنا یہ معنی رکھتا ہے کہ ایک پوری تعلیم کو الٹ دیا جائے اور ایک انقلاب پیدا کر دیا جائے۔ ہندستان کے اندر بھی خاص طور پر مظالم کیے گئے، خاص طور پر مسلمانوں کے ساتھ بسنے والی حلیف قوموں کا خون بہایا گیا۔ اسلامی حکومت کے مقابلے میں، اسی حکومت کی فوجیں صف آرا ہوئیں۔ ایسی حالت میں

یہ ضروری مسئلہ تھا، اب اس کا اجمالی ذکر بھی آج کی صحبت میں ملتوی رکھتا ہوں۔ انشاء اللہ بشرطِ زندگی و توفیقِ الٰہی کل اور پرسوں کی صحبتوں میں بیان میں آجائیگا۔

اگر حقیقتاً آپ کے قلب کے اندر وہ شوقِ معانی، وہ ذوقِ عرفانی پیدا ہو گیا کہ آپ حق کی صدائیں سننے کے لیے اپنے سینوں کے اندر ایسی لازوال آشفتگی رکھتے ہیں کہ بستر کی آرام دِہ کروٹیں قربان کر دیں، رات بھر کی تکلیف اور اختر شماری کے لیے، تب بھی آپ اس صدا کے سننے کے لیے تیار ہیں؟ تو میں بتلانا چاہتا ہوں کہ اس کے خرچ کرنے کے لیے یہ موقع نہیں ہے کہ بہت زیادہ دیر تک میری تقریر سنیں، بلکہ اس کے خرچ کرنے کا اصلی محل یہ ہے کہ اللہ کے عشق میں، اس کے اتباع میں، اس کی پیروی میں، اس کی راہ میں، سب چیز قربان کرنے کے لیے اپنے شوق دکھلاؤ، اپنے دل کے جذبات دکھلاؤ۔ تاہم میں آپ کے ذوق و شوق کا معترف ہوں۔

اور ساتھ ہی اس امر کی بھی معافی چاہونگا کہ ابھی تھوڑی دیر ہوئی، خطبۂ صدارت کے اوراق سنائے جا رہے تھے، تو موضوع روکھا پھیکا تھا، اور کچھ طرزِ بیان رُوکھا پھیکا۔ اگرچہ میرے عزیز سرسری طور پر اسے دیکھ چکے تھے؛ تاہم پڑھنے میں کچھ رکاوٹ ہوئی اور پبلک میں شور ہوا۔ مجھے مجبور ہو کر اس لب و لہجہ میں کہنا پڑا اور علی الخصوص جب کہ ایسے بزرگوں کا مجمع موجود ہے۔ میں اس لب و لہجہ کا عادی نہیں ہوں، مگر میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ایک حقیقی صورت کے احساس نے مجھ کو مجبور کیا کہ اس لب و لہجہ کو اختیار کروں۔

ہماری مجلسوں میں سب سے بڑا جو جائز مطالبہ ہے، قولاً و شرعاً ایک نظام ہے، انضباط ہے، صبر ہے۔ ہم میں اس وقت تک اتنا صبر نہیں پیدا ہوا ہے۔ یہاں ہمارے چند ہزار نفوس موجود ہیں۔ اگر وہ چیز ان کے سامنے آتی ہے اور ان کو بتلایا گیا ہے کہ وہ سکون کے ساتھ سنیں، تو یقیناً ہمارے اندر اتنا صبر اور قاعدہ ہونا چاہیے اور ان لوگوں کی اطاعت کا جذبہ ہونا چاہیے جن کو ہم مستحقِ اطاعت سمجھتے ہیں۔ مان لو کہ یہ چیز تمہارے لیے کڑوی کسیلی تھی، لیکن اگر آدھ گھنٹہ

حضرات!

اب اس کے بعد جو ضروری ٹکڑے ہیں، جن کو میں اس وقت نظر انداز کرتا ہوں، مثلاً ہندو مسلمانوں کا اتحاد ہے۔ اس اتحاد کے متعلق احکامِ شرعی کیا ہیں؟ اس امر کا قطعی فیصلہ کہ اس بارے میں احکامِ شریعت کیا ہیں، حالاتِ گزشتہ کی بنا پر، موجودہ حالات کی بنا پر، اور آیندہ آنے والے حالات کی بنا پر، ایک نہایت ضروری موضوع یہ تھا۔ لیکن میں اس کو اس وقت نظر انداز کرتا ہوں، شاید کل یا پرسوں عرض کرونگا۔ اس لیے کہ وقت کی صورت مساعدت نہیں کرتی۔

ایک اور مسئلہ ہے جو ایک ہندی لفظ کے بھیس میں سوراج کے لفظ میں آیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ محض لباس کا تغیر آپ کو حقیقت و معانی سے ناآشنا نہ کریگا۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ حقیقت آپ کے لیے کوئی نئی حقیقت نہیں ہے، نیا پیغام نہیں ہے، نہ عمل کا کوئی نیا دروازہ کھلنا چاہتا ہے۔ مسلمانوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کرۂ ارضی کے نیچے، دنیا کی کوئی جماعت، قوم، فرد نہیں ہے جس کو اس کے خدا اور رسول نے اس حقیقتِ محبوبہ کو، اس کے دل کے ایک ایک گوشہ میں نہ رچا دیا ہو اور اس کے تمام جسم میں نہ پھیلا دیا ہو۔ یہ حقیقت ہے جو تیرہ سو برس سے آپ کے سامنے موجود ہے۔

[اس موقع پر یکایک بجلی کی روشنی گل ہوگئی اور تمام ہال میں تاریکی چھا گئی۔ رضا کاروں نے گیس لیمپ اور لالٹینیں ہال میں منگائیں۔ لیکن چند منٹوں کے بعد ہی بجلی کی روشنی پھر ہوگئی، جس پر حاضرین نے نعرۂ اللہ اکبر بلند کیا]

عزیزانِ من!

آج کی صحبت صرف دس منٹوں کی اور باقی رہ گئی ہے۔ عزیزانِ من! یہ روشنی ایسی قیمتی نہ تھی جس کے ملنے پر نعرۂ تکبیر بلند کرو۔ ہاں اگر ایمان کی روشنی مل گئی ہو، تو اس کے لیے جس قدر چاہو، نعرۂ تکبیر بلند کرو۔ اگر آپ خاموشی سے کام لیں، تو آج کی صحبت چند منٹوں میں ختم ہو جائیگی۔ بہرحال

۷

# اجلاسِ خصوصی

# انڈین نیشنل کانگریس

دلّی ، ۱۵ دسمبر ۱۹۲۳ء

نمائندگانِ قوم، خواتین اور حضرات!

قومی جدوجہد کے ایسے نازک اور فیصلہ کن وقت میں جیسا کہ آج درپیش ہے، آپ حضرات حالات کے تقاضا سے مجبور ہوئے کہ سال کے اختتام سے پہلے اس ایوانِ قومی میں جمع ہوں، اور وقت کی مشکلات کے لیے حل اور رہنمائی حاصل کریں۔ اگر میں کہوں، یہ وقت کام اور مقصد کی مشکلات کا ایسا اجتماع ہے جس کی اس ایوان کی تاریخ میں کوئی نظیر موجود نہیں، تو میں سمجھتا ہوں، یہ ایسی بات ہوگی، جو آپ میں سے ہر شخص محسوس کر رہا ہے۔ تین سال ہوئے جب آپ ایک ایسے ہی خاص اجلاس میں بمقام کلکتہ جمع ہوئے تھے، تو وہ بھی آپ کی تاریخ کا ایک عظیم الشّان دن تھا۔ لیکن اُس دن کی عظمت قوموں کے اُن دنوں کی مانند تھی، جن میں آزادی کی جنگ کا اعلان کیا گیا ہے، اور آج کے دن کی اہمیت میں تاریخ کے ان ایّام کی جھلک پائی جاتی ہے جن میں قوموں کو جنگ کی فیصلہ کن دشواریوں میں سے گزرنا پڑا ہے! اس دن آپ جنگ کے آغاز کے لیے فکرمند تھے، آج اُس کے انجام کے لیے مضطرب ہیں۔ اُس وقت آپ کو سفر کی جستجو تھی، آج گمرہی کا خطرہ پیش آگیا ہے۔ اس وقت آپ ساحل پر کشتی کے لیے

کے لیے تم اتنی تلخی گوارا نہیں کر سکتے، تو اللہ کے راستہ میں قربانی کی تلخی کیسے گوارا کرو گے؟ وہ ہنگامہ جو بار بار گزرتا تھا، میری طبیعت کو ناگوار گزرا اور اس لب و لہجہ میں آپ کو مخاطب کیا، جس کا میں عادی نہیں ہوں۔ اگر کسی عزیز کو ناگوار گزرا ہو تو معافی چاہتا ہوں۔ وقت بھی زیادہ ہو چکا ہے اس لیے آج کا جلسہ ختم کیا جاتا ہے۔

میں علمائے کرام کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ان کا حسنِ ظن میرے لیے توشۂ آخرت ہوگا۔

میں آج اپنے بحث و نظر کے محدود دائرے سے بے خبر نہیں ہوں۔ خیالات کا ہجوم اور مطالب کی وسعت کتنی ہی میرے لیے ضبط آزما ہو، لیکن میں اُن حدود کی طرف بڑھنے سے اپنی نگہبانی کرونگا، جو آپ کے سالانہ اجلاس کے صدر کے لیے محفوظ رہنا چاہییں۔ علی الخصوص ایسی حالت میں جب کہ آپ اس کی صدارت کے لیے ایک بہتر انتخاب کر چکے ہیں۔ میں اس سے آگاہ ہوں کہ یہ ایک انقلابی دور ہے اور منجملہ انقلابات کے ایک انقلاب اس خیال میں بھی ہو چکا ہے، جو کبھی اس ایوان کی ادبی روایات میں بمنزلۂ رسم و قاعدہ کے تھا۔ اب آپ صدرِ مجلس سے متمنی نہیں ہیں کہ وہ آپ کے سیاسی لٹریچر میں کوئی ضخیم اضافہ کرے، یا اپنی تھکا دینے والی فصاحت سے آپ کے حوصلۂ سماع کا امتحان لے برخلاف اس کے آپ کی خواہش یہ ہے کہ وہ جلد سے جلد آپ سے کہہ دے کہ کام شروع کیجیے۔ آپ کے جذبات کا یہ تغیر فی الحقیقت اُس بنیادی انقلاب کا نتیجہ ہے کہ ہندستان کی قومیت بحث و نظر کا ابتدائی دور طے کر کے عمل کی زندگی میں گامزن ہو چکی ہے اور اس لیے قدرتی بات ہے کہ آپ کے ذوقِ عمل پر بحث و نظر کی طوالت گراں گزرتی ہے۔ اور اب آپ کی پسندیدہ چیز فصاحت نہیں رہی، بلکہ عمل کی سادگی ہے۔

پس اگر آج میں اس اجلاس کے اصلی مقصد کے سوا اور تمام ضمنی اور نواحی افکار سے چشم پوشی کرلوں، اور جو کچھ عرض کروں اس میں سادگی و اختصار ملحوظ رکھوں، تو میں امید کرتا ہوں، یہ ایسی بات ہوگی جس میں اپنی خواہش سے زیادہ آپ کی خواہش کی تعمیل کرونگا۔

## وقت کے مسائل

لیکن اگر میں وقت کے حالات و مسائل پر نظر بھی ڈالتا، جب بھی میرے لیے گویائی پر خاموشی ہی کو ترجیح تھی۔ ہمارے لیے اب وقت کی کونسی بات ہے جو نئی ہو سکتی ہے؟ اور جس کا ہم اس لیے ذکر کر سکتے ہیں کہ اس سے ہماری معلومات یا محسوسات کے لیے کوئی نئی صورت

مضطرب تھے، لیکن آج زندۂ جاوید حافظ کے لفظوں میں "کشتی ایک کنارہ سے چل چکی ہے مگر دوسرا کنارہ ابھی دُور ہے اور موجیں گھیرا ڈال رہی ہیں"۔ حضرات! جب میں دیکھتا ہوں کہ ایسے نازک موقع کی صدارت کے لیے آپ کی نظرِ انتخاب مجھ پر پڑی، تو مجھے آپ کی جانب سے عزّت اور اعتماد کا ایک ایسا عظیم پیام ملتا ہے، جس کو میں اپنے استحقاق کا نہیں، بلکہ صرف آپ کے فیّاضانہ حسنِ ظن ہی کا نتیجہ سمجھ سکتا ہوں۔ اگر میں اپنی ناچیز خدمات کے ذریعہ آپ کا ایسا اعتماد حاصل کرسکا ہوں، تو مجھے یقین کرنا چاہیے کہ یہ میرے وطن و قوم کی جانب سے قبولیت کی ایک بہت ہی بڑی سند ہے۔ میں اس عزّت کے لیے آپ کا شکرگزار ہوں، مگر اُس ذمہ داری کے لیے جو آپ کے اعتماد کی مقدّس امانت ہے، آپ ہی سے ہمرہی و اعانت کی التجا کرتا ہوں۔ بلاشبہہ آج ہمیں ایک نہایت مشکل وقت میں، نہایت مشکل کام درپیش ہے۔ لیکن ہمارا یقین متزلزل نہیں ہے؛ اور گو ہمیں اپنی تدبیروں کی طرف سے شبہات رہے ہوں، لیکن ہمیں اپنے مقصد کی سچائی میں کوئی شبہہ نہیں ہے۔ ہماری عاجزانہ کوششیں حق اور انصاف کے لیے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ خدا کی زمین میں اُس کا سب سے زیادہ پسندیدہ کام ہے اور اس کی مرضی یہی ہے کہ ایسا ہو۔ بس، یہ تو ضرور ہے کہ ہمیں اپنی درماندگیوں اور کمزوریوں کا اقرار ہو؛ ہم وقت کی آزمائشوں اور راستے کے کھٹکوں کی طرف سے فکرمند ہوں۔ ہمیں مشکلوں اور رکاوٹوں کی سختیوں سے پورا پورا اندیشہ رہے، لیکن ہمیں نتیجہ کی طرف سے کبھی ہراساں نہ ہونا چاہیے۔ ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ خدا کی جس رحمت نے ابتدا کی بے سروسامانیوں میں ہمارا ساتھ دیا تھا، وہ درمیان کی اس آزمائش میں بھی ہماری دستگیری کرے گی اور بالآخر انجام کی فتحمندی بھی ہمارے ہی لیے ہے۔

## ایک وقفۂ نظر

حضرات!

سرِ وِس کمیشن اور مختلف محکموں کے ہندستانی بنانے کے معاملات میں ہمارے لیے کوئی نئی بات نہیں ہوئی ہے۔ کینیا کے فیصلہ میں بھی ہم کوئی نئی ناانصافی نہیں پاتے، بلکہ یہ ایک قدیم اور متوقع ناانصافی کا صرف تازہ اعادہ ہے۔ اس میں نسلی اور قومی تعصّب کا جذبہ ہے اور وہ اب سے پہلے کب نہ تھا؟ اس میں برطانی مواعید کی شکست ہے اور گزشتہ پانچ سال کے واقعات کے بعد کم از کم برطانیہ کے "وعدوں" کی شکست میں کوئی نُدرت باقی نہیں رہی ہے۔ اس میں ہندستان کی عزّت سے انکار ہے لیکن ہماری معلومات میں کوئی نظیر اس کے عزت واحترام کے اقرار کی بھی موجود نہیں۔ تاہم ان حضرات کے لیے ان معاملات میں ایسے انکشافات ہوئے ہیں، جن کی تجربہ کی تکمیل اور حقیقت کے اعتقاد کے لیے ضرورت تھی۔ اب ان میں سے اکثر معترف ہیں کہ "نام نہاد اصلاحات محض دھوکے کی ٹٹی ہیں"۔ اور "ہندستان کی خودداری کی حفاظت موجودہ حالات میں ناممکن ہے"۔ نیز "برطانیہ کے ٹوٹے ہوئے وعدوں پر اب کوئی بھروسہ نہیں کیا جاسکتا"۔ وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ بائیکاٹ کے سوا چارۂ کار نہیں ہے اور یہ کہ امپریل نمایش کا ہندستان کو پوری قوت کے ساتھ بائیکاٹ کرنا چاہیے —

حضرات! ہم اس موقعہ پر ہرگز اس بات کی شکایت نہیں کرینگے کہ انھوں نے حقیقت کے اعتراف میں دیر کی۔ ہم یہ بھلا دینگے کہ حقیقت اس تین سال سے پہلے بھی اتنی ہی بے نقاب تھی، جس قدر فیصلۂ کینیا کے بعد آج نظر آرہی ہے کیونکہ حقیقت کا اعتراف جلد کیا یا بدیر، لیکن بہرحال اعتراف ہے۔ اور اس تحسین کا مستحق ہے جو اعترافِ حقیقت کے لیے ہونی چاہیے۔ ہم اُن سے صرف یہ کہینگے کہ آپ کے وطن کو اب بھی آپ کی اسی طرح ضرورت ہے، جس طرح تین سال پہلے تھی۔ اگر واقعی ہم سب کا اعتقاد ہے کہ ہندستان کی عزّت کی حفاظت کا وقت آگیا، تو کیوں نہ ہم اپنے اختلافات کے باوجود بھی اس ایک مقصد میں متحد ہوجائیں کہ ہندستان کی عزّت بچائی جائے۔

حال پیدا ہوگئی ہے؟ ایک زمانہ تھا جب ہندستان کی قومیت کا احساس صرف اس حد تک پہنچا تھا کہ دفتری اقتدار کی ناانصافیوں پر نکتہ چینی کرے۔ پھر نکتہ چینی شکایت میں مبدّل ہوئی اور شکایت نے احتجاج اور سوال کی صورت اختیار کرلی۔ ایک مدت تک ہمارا طرزِ عمل یہ رہا کہ ہر نئی ناانصافی پر ایک نئی چیخ ہمارے منہ سے نکل جاتی تھی، لیکن اب معاملہ اس حد سے گزر چکا ہے کہ کام اور فیصلہ کے سوا کسی بات کی بھی گنجایش رہی ہو۔ ہم ناانصافی دیکھتے دیکھتے اس کے عادی ہوگئے ہیں، گویا یہ ہماری روزانہ زندگی کا ایک معمولی واقعہ ہے۔ اب ناانصافیوں کا ذکر نہ صرف غیر ضروری ہے، بلکہ اپنے عمل ویقین میں شک کرنا ہے۔ ہمارے سامنے حقیقت اپنے آخری درجۂ یقین تک آچکی ہے؛ اس میں نہ تو مزید اضافہ ہوسکتا ہے، نہ کسی نئے پردے کے ہٹنے کا انتظار باقی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے ساتھ جو کچھ ہورہا ہے، وہ برابر ہوتا رہیگا، جب تک ہم اسے خود نہ بدل دینگے۔ ہمارا سابقہ افراد اور اوقات سے نہیں ہے، جن کی تبدیلی حالات پر مؤثر ہو؛ ہمارا سابقہ ایک نظام سے ہے جس کی نسبت ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنی خلقت ہی میں نامنصفانہ ہے، اور اگر اِس وقت تک قائم رہا ہے، تو اس لیے نہیں کہ اس کے اندر اس کی ذاتی مضبوطی موجود ہے؛ بلکہ صرف اس لیے کہ ہماری غفلت نے اس کے لیے ستون بہم پہنچادیے ہیں۔ پس ناانصافی جب کہ اس کا عمل نہیں ہے، بلکہ خاصہ ہے، تو ہمیں نہ تو متعجب ہونا چاہیے اور نہ شاکی، بلکہ صرف یہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ قائم نہ رہے۔

## قدیم حقیقت اور نیا اعتراف

البتہ میں حقیقتِ کہنہ کے ان تازہ اعترافات کا پوری کشادہ دلی کے ساتھ خیر مقدم بجالاتا ہوں، جو ہمارے اُن بھائیوں کی زبانوں پر بھی جاری ہوگئے ہیں، جنھیں ہمارے طریقِ عمل سے مایوسی کی شکایت تھی۔ بلاشبہہ نام نہاد اصلاحی کونسلوں کے ۱۰ سالہ تجارب، محصولِ نمک، پبلک

یہ گویا دنیا کے نام ایک اعلان تھا کہ قوموں کی صفیں ایک نئی فتحمند قوم کے استقبال میں چشم براہ ہو جائیں۔ یہ فتح و ظفر کا ایک بے روک کُوچ تھا، جس کی راہ میں اگرچہ کرۂ ارضی کی سب سے بڑی طاقتیں اپنے بے پناہ منصوبوں اور اٹل رکاوٹوں کے ساتھ حائل تھیں، لیکن وہ اپنے جذبۂ حب الوطنی کے اچنبھوں اور ہوشربائیوں سے تاریخ کے لیے ایک پیامِ اعجاز لیے ہوئے بے خوف بڑھتا رہا۔ بالآخر وہ وقت آگیا، جب کُوچ نے منزل پہ دم لیا۔ اور تاریخ نے بڑھ کر اپنے دروازے کھول دیے۔ تاکہ ایک نئی فتحمند قوم کا خیر مقدم بجا لائے۔ گزشتہ جولائی کی چوبیسویں تاریخ کو جب لوزان میں ترکی صلحنامہ پر دستخط ہوئے تو فی الحقیقت یہ ایک نئی قومی عظمت کی پیدائش کا دن تھا۔ یہ ان تمام فتحمندیوں کی تکمیل تھی، جن کی ایک قوم کو زندگی اور عزت کے لیے ضرورت ہوسکتی ہے۔ اس میں فوجی فتحمندی سے زیادہ سیاسی فتح تھی۔ اور دونوں سے بڑھ کر وہ فکری اور معنوی فتح، جن کے بغیر جنگ اور سیاست کی فتحمندیاں بھی ہیچ ہیں۔

## ایک عالمگیر مبارکباد

حضرات!

اس فتحِ عظیم پر ہندستان اپنی گرمجوشی اور مخلصانہ مبارکباد پیش کرتے ہوئے جس قدر بھی نازاں ہو، کم ہے۔ ہندستان اس واقعہ کی صورت سے زیادہ اس کے معانی کی وسعت کا راز شناس ہے۔ وہ ترکی کی فتح میں نہ صرف اپنے مطالب کی فتح، بلکہ تمام سرزمینِ مشرق کی فتح کا نظارہ کر رہا ہے۔ میں سب سے پہلے حضرت خلیفۃ المسلمین کی خدمت میں ہندستان کا یہ ہدیۂ ارادت پیش کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں؛ پھر انگورہ کی قومی مجلس کو اس کے نئے جمہوری دور کی فتحمندیوں پر مبارکباد دیتا ہوں؛ اور بالآخر ہم سب کی نگاہیں بے اختیار موجودہ عہد کی اس عظیم ترین شخصیت کی طرف اٹھ جاتی ہیں جس کا وجود فی الحقیقت ان تمام مبارکبادیوں

# ترکی کی فتحِ عظیم

حضرات!

مجھے یقین ہے کہ آج آپ سب سے پہلے جس بات کے متوقع ہونگے، وہ یہ ہے کہ میں آپ کے ایک پُر جوش جذبۂ تہنیت کی ترجمانی کی عزّت حاصل کروں، جو آپ کی قومی جد و جہد کی تاریخ سے ایک عجیب مگر پُر فخر وابستگی رکھتا ہے اور جس میں آپ کی تاریخ کی ایک شاندار داستانِ عمل پنہاں ہے۔ خدا کی مرضی یہی تھی کہ مشرق کے دو دُور دراز ملکوں کو انصاف اور آزادی کے نام پر ایک دوسرے سے اس طرح جوڑ دے کہ ایک کی مصیبت پر دوسرے کی زبان سے آہ نکلے، اور ایک کی فتحمندی میں دوسرے کے لیے فتح و مراد ہو۔ یہ مشرق کے دو بعید گوشے جنھیں انصاف اور آزادی کی یگانگت نے اس قدر قریب کر دیا ہے، کون ہیں؟ یہ ہندستان ہے، جس نے عین اُس وقت جب کہ اُسے خود اپنی آزادی کا دشوار گزار مرحلہ درپیش تھا، خلافتِ اسلامی اور حکومتِ ترکی کی آزادی و خود مختاری کو بھی اپنی آزادی کی طرح اپنا قومی مطالبہ قرار دیا؛ اور یہ ترکی ہے اور اس کی جدید قومیت کا ظہور ہے جس کی انقلاب انگیز فتحمندیوں کا دنیا نے ایک زندۂ جاوید معجزہ کی صورت میں مشاہدہ کیا ہے، اور جس کی فتحمند حب الوطنی کی روح تمام سرزمینِ مشرق کے لیے زندگی اور عمل کا ایک نیا پیغام لے کر نمودار ہوئی ہے۔

حضرات!

ساڑھے آٹھ مہینے ہوئے، جب آپ نے اسی ایوان میں انگورہ کے محب الوطنوں کو ان فتوحات پر مبارکباد دی تھی، جو ترکی فوجوں نے میدانِ جنگ میں حاصل کی تھیں۔ فی الحقیقت یہ فتوحات ایک آنے والی فتحِ عظیم کا پیش خیمہ تھیں، لیکن ان میں میدانِ سیاست کی ذہنی اور معنوی فتوحات کا پیغام مضمر تھا۔ یہ اُس بے نقص اور بے داغ فتح کی ابتدائی قسط تھی، جس کی تکمیل میں دنیا ایک گری ہوئی عظمت کے سنبھالے کی جگہ ایک نئی عظمت کی تعمیر دیکھنے والی تھی۔

اور ہندستان نے انصاف اور حق کے نام پر مطالبہ کیا تھا۔ اس میں ڈاکٹر ولسن[31] کی ان فراموش شدہ شرطوں اور برطانیہ کے ان مشہور مگر شکستہ وعدوں کا بھی مفاد موجود ہے جو ۱۹۱۸ء میں کیے گئے تھے۔ ڈاکٹر ولسن کی بارھویں شرط یہ تھی کہ ترکی کی سلطنت محفوظ رکھی جائیگی۔ چنانچہ آج ترکی کی سلطنت موجود ہے۔ برطانی وزیر اعظم نے کہا تھا کہ ترکی کو تھریس اور ایشیائے کوچک کے زرخیز اور شہرۂ آفاق علاقوں سے محروم نہیں کیا جائیگا۔ اب ترکی ان علاقوں سے محروم نہیں ہے۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ اس میں نہ صرف ان "وعدوں" کا مفاد ہی موجود ہے، بلکہ وہ باتیں بھی موجود ہیں، جو ان میں نہ تھیں۔ ان میں ترکی کی خود مختارانہ عظمت کا کوئی ذکر نہ تھا لیکن اسے یہ بھی حاصل ہو گئی ہے۔ ان میں اجنبی امتیازات (کیپی چولیشنز[4]) اور غیر ترکی ڈاکخانوں کے اٹھا دینے کے لیے کوئی ذمہ داری نہیں لی گئی تھی، جو قبل از جنگ بھی عثمانی شہنشاہی کی کامل خود مختاری کی نفی کرتے تھے؛ اب وہ بھی اٹھا دیے گئے ہیں۔ ان میں ہم کہیں اس کا اشارہ نہیں پاتے کہ ترکی سے ایک ہارے ہوئے حریف کی طرح نہیں، بلکہ ایک مساوی طاقت کی طرح معاملہ کیا گیا۔ برخلاف اس کے ہم ان "وعدوں" کو درۂ دانیال کے بین الاقوامی کر دینے کا ذکر موجود پاتے ہیں۔ لیکن صلحنامہ نے وہاں بھی ترکی کا اقتدار تسلیم کر لیا ہے۔ بلاشبہہ یہ جو کچھ ہوا، وعدوں کا مفاد ہے اور انصاف کی تعمیل ہے؛ لیکن واقعات کی تکمیل کے لیے مجھے اتنا اضافہ اور کرنے دیجیے کہ یہ سب کچھ اس لیے نہیں ہوا کہ وعدے پورے کیے گئے بلکہ اس لیے ہوا کہ وعدے فتح کیے گئے؛ اور طاقت کے وعدے اگر بزورِ شمشیر فتح کر لیے جائیں، تو وہ وعدوں سے بھی زیادہ دے دینے میں فیّاض ہے۔ وہ فاتح کو سب کچھ دے دیتی ہے، لیکن انصاف کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔

حضرات!

یہ صلح فی الحقیقت ایک سوال ہے جس کے جواب میں عنقریب تاریخ عبرت کی داستانیں ترتیب دیگی۔ بلاشبہہ انصاف پورا ہوا، اور حق حقدار کو مل گیا۔ لیکن ان طاقتوں کو کیا ملا، جنھوں

کا اوّلین مخاطب ہے۔ میں غازی مصطفیٰ کمال پاشا کو ہندستان کی طرف سے مبارکباد دیتا ہوں۔

حضرات!

میں نے ہندستان اور ترکی کا ذکر کیا، مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ اس مبارکباد کے اصلی مطالبہ سے ابھی عہدہ برآ نہیں ہوا ہوں۔ یہ فی الحقیقت اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے کہ کسی سرزمین یا قوم کی نسبت محدود کی جائے۔ یہ کشمکش جو پانچ برس سے دنیا کی صلح عام کو ملتوی کر رہی تھی محض قوموں اور حکومتوں کی جنگ نہ تھی۔ عصمت پاشا کے فتمند تدبر اور لارڈ کرزن کی دھمکیوں میں صرف ترکی اور برطانیہ یا مغرب و مشرق ہی کی نمایندگی نہ تھی، بلکہ اس سے بھی زیادہ کوئی چیز مضمر تھی۔ یہ دراصل اصولوں کی جنگ تھی اور متقابل عقیدوں کا معرکہ تھا۔ ایک طرف طاقت کا گھمنڈ تھا، دوسری طرف حق اور انصاف کی بے سروسامانی تھی۔ طاقت کا دعویٰ تھا کہ کمزور قوتوں کو زندگی کا کوئی حق نہیں۔ انصاف کا عاجزانہ اعلان تھا کہ زندگی کا حق ہر اس قوم کو ہے، جو زندہ رہنے کا ارادہ کرلے۔ جیسا کہ قاعدہ ہے، عرصہ تک کشمکش جاری رہی۔ بالآخر خدا کی مرضی نے فیصلہ کا اعلان کردیا۔ طاقت کو باوجود اپنے تمام سروسامان کے شکست ہوئی اور انصاف نے اپنی ساری بے سروسامانیوں اور مایوسیوں کے ہوتے ہوئے فتح پائی۔ پس فی الحقیقت ترکی کی فتح اس سے زیادہ تر ہے کہ اسے ایشیا یا مشرق کی فتح سے تعبیر کیا جائے۔ وہ انصاف کی جیت ہے اور انصاف مغرب و مشرق کے امتیاز سے بالاتر ہے۔ انصاف کا نہ تو کوئی وطن ہے، نہ کوئی قومیت؛ اس کی قومیت اگر ہوسکتی ہے، تو وہ صرف بالاتر اور عالمگیر انسانیت ہے۔ پس مجھے اجازت دیجیے کہ میں عالم انسانیت کی اس فتح پر تمام عالم انسانیت کو مبارکباد دوں، میں مغرب اور مشرق کے ہر اس انسان کو مبارکباد دوں، جو انصاف اور انسانی آزادی کا احترام ہے۔

## ناکام ناانصافی

لوزان کے صلح نامہ سے وہ تمام مقاصد بہ استثنائے آزادیِ عرب حاصل کرلیے گئے، جن کا ترکی

حدود اور خطوط بھی ہل رہے ہیں۔ کتنی ہی بلندیاں ہیں جو گر گر کر پست ہو رہی ہیں اور کتنی ہی پستیاں ہیں جو اٹھ اٹھ کر بلند ہو رہی ہیں۔ عروج اپنے انتہا سے زوال کی ابتدا کر رہا ہے اور مایوسیوں کی تاریکی بڑھتے بڑھتے وہاں تک پہنچ چکی ہے، جس کے بعد سے صبح شروع ہو جاتی ہے۔ کون دیکھ سکتا ہے کہ مستقبلِ قریب کے دامن میں کیا ہے! تاہم جو کچھ ہو رہا ہے، اس میں ایک نئے مشرق کے انقلاب کا منظر تو بالکل ہی صاف ہے جس کے لیے کسی کی کہانت کی ضرورت نہیں۔ مشرق کی وہ بیداری جو چوتھائی صدی سے صرف بیداری ہی تھی، اب بیداری کے بعد کی منزلیں طے کر رہی ہے اور جنگِ عظیم کی پھیلائی ہوئی ہلاکتوں نے زندگی اور حرکت کی ایک نئی روح مہیا کر دی ہے۔ غازی مصطفیٰ کمال پاشا کے سحر کار ہاتھوں نے صرف ترکی کے بختِ خفتہ ہی کو بیدار نہیں کیا، بلکہ مشرق کے دروازہ پر بھی دستک دے دی۔ اب اُس کی گونج ایک طرف وسطِ ایشیا کے میدانوں میں پھیل رہی ہے، دوسری طرف افریقہ کے صحراؤں اور ساحلوں پر سے گزر کر بحرِ ہند کی لہروں کو عبور کر رہی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی بازگشت عنقریب مشرق کے ایک ایک گوشے سے بلند نہ ہوگی!

حضرات!

ہندستان مشرق کی اس عام جدوجہد سے اپنی قدرتی اور جغرافیائی وابستگی فراموش نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی جدوجہد کو اس سے منسلک کرتا ہوا ربط و یگانگت کے وہ تمام جذبات محسوس کر رہا ہے، جو ایک سرزمین کی مختلف جماعتوں میں وقت، حالات اور مقصد کی یکسانی قدرتی طور پر پیدا کر دیتی ہے۔ پس وہ مشرق کی ہر اس قوم کا خیر مقدم کرتا ہے جو انصاف اور آزادی کے لیے جدوجہد کر رہی ہے، اور ہر اس قوم پر افسوس کرتا ہے، جو اس راہ میں اپنے ساتھیوں سے پیچھے ہے۔ وہ مصر، شام، فلسطین، عراق، مراکش اور دیگر اقطاعِ مشرق کے تمام محب الوطنوں کو یقین دلاتا ہے کہ ہندستان کے کروڑوں دل ان کی کامیابی کے لیے مضطرب ہیں۔ وہ اُن کی آزادی کو بھی اُس سے کم محبوب نہیں رکھتے، جس قدر خود اپنے وطن

نے انصاف کی پامالی کے لیے اپنی اٹل اور بے روک سرکشی کی قسمیں کھالی تھیں؟ برطانیہ کو کیا ملا، جو کامل چار سال تک اپنے ٹوٹے ہوئے وعدے کے ٹکڑے روندتی رہی اور ایک ایسے مضبوط ارادہ کے ساتھ جو اس نے انصاف کے لیے کبھی نہیں کیا ظلم و جبر کی تکمیل کے لیے وقف ہو گئی۔ اس نے ترکی کو پامال کرنا چاہا، مگر وہ اس کے سارے منصوبوں اور فیصلوں کے خلاف طاقتور ہو گئی۔ اس نے انصاف کے آگے جھکنے سے انکار کیا، لیکن وہ تلوار کے آگے سربسجود ہو گئی۔ اس نے بار بار قلم سے فیصلے لکھے، لیکن وہ سب تلوار سے پارہ پارہ کر دیے گئے۔ اس نے قوموں کے حاکم اور قسمتوں کے مالک کی طرح جب صلحنامے ترتیب دیے، تو ہندستان نے حق اور انصاف کے نام پر فریاد کی، مگر اس نے حقارت کے ساتھ انکار کر دیا۔ لیکن جب مصطفےٰ کمال[5] نے تلوار کی نوک سے خود اپنا صلحنامہ لکھ دیا، تو وہ ایک مفتوح کی طرح جھکی اور اس کے استقبال سے انکار نہ کر سکی۔ ہمیں مؤرخ کے جواب کا انتظار نہیں ہے کیونکہ دنیا نے جواب دے دیا ہے۔ فی الحقیقت اس نے ترکی کو سب کچھ دے کر خود جو کچھ حاصل کیا ہے، وہ ناکام ناانصافی کا داغ ہے جو پہلے اس کی پشت پر تھا مگر اب اس کی پسند کے مطابق اس کی پیشانی پر نمودار ہو گیا ہے۔

## جدید مشرق

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ حوادثِ عالم کی جو عظمت ہمیشہ تاریخ کے صفحات پر نمایاں ہوتی ہے، وہ کبھی ان کے تماشائیوں کو نظر نہیں آئی ہے۔ ہم دراصل ایک ایسے عہدِ انقلاب سے گزر رہے ہیں، جو ٹھیک ٹھیک ان وقتوں کے مانند ہے، جن میں مؤرخینِ عالم نے کرۂ ارضی کے بڑے بڑے انقلابات کی بنیادیں تلاش کی ہیں۔ دنیا تیزی کے ساتھ ایک نئے پلٹے کے لیے جھک رہی ہے۔ اس کی ساری باتیں جو کل تک غیر متزلزل حقیقت سمجھی جاتی تھیں، اب جنبش میں آیا ہوا تزلزل ہے۔ اس کے اصولوں اور عقیدوں کی طرح اس کے نقشے کے

# قسطنطنیہ اور یروداجیل

حضرات!

جب کہ ہم ترکی کی فتحِ عظیم کی مبارکباد پیش کرتے ہوئے قسطنطنیہ کے عالیشان ایوانِ خلافت کی طرف دیکھ رہے ہیں، تو بے اختیار ہمارا خیال ہندستان کے ایک قید خانہ کی طرف بھی رجوع ہو جاتا ہے جس کی ایک کوٹھڑی کے اندر ہندستان کی سب سے بڑی شخصیت محبوس ہے میں یقین کرتا ہوں کہ اگر ترکی سے باہر کوئی انسان اس کا مستحق ہے کہ ترکی کی فتح پر اسے مبارکباد دی جائے، تو وہ ہندستان کے قائدِ اعظم مہاتما گاندھی ہیں۔ مہاتما گاندھی نے اس مقصد کی حمایت میں اس وقت آواز اٹھائی جب کہ خود ترکی کے اندر قومی دفاع کی کوئی صدا بلند نہیں ہوئی تھی۔ یہ ان ہی کی حقیقت شناس نگاہیں تھیں، جنھوں نے اوّل نظر ہی میں اس مسئلہ کی ساری وسعتوں اور گہرائیوں کا اندازہ کرلیا اور تمام ہندستان کو دعوت دی کہ یہ صرف مسلمانوں ہی کا نہیں، بلکہ تمام ملک کا قومی مطالبہ ہے۔ حضرات! ہندستان نے مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں مطالباتِ خلافت کے لیے جو جدوجہد کی، وہ فی الحقیقت موجودہ عہد کا ایک خاص اور اہم واقعہ ہے، جس کے نتائج پر تاریخ بحث کریگی۔ شاید یہ ابھی قبل از وقت ہے کہ ہم اس کے تمام نتائج کا اندازہ کرنا چاہیں۔ تاہم بعض نتائج تو ایسے ہیں، جو بلا کسی بحث و نظر کے ہم سب محسوس کر رہے ہیں۔ اور جن میں سے ہر نتیجہ اس درجہ عظیم ہے کہ صرف اسی کے لیے یہ جدوجہد ظہور میں آسکتی تھی۔

ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ جس کے بغیر ہندستان کی آزادی ایک خوابِ پریشاں سے زیادہ نہیں، اسی کی بدولت ان مشکلات پر غالب آگیا جو عرصہ سے اُس کی راہ میں حائل تھیں۔

ہندستان کا تمام مشرق میں وہ بین القومی وقار جس نے مشرق کے جدید بیدار حلقہ میں اسے ایک وقیع جگہ دے دی، اسی کا نتیجہ ہے۔ اگر یہ جدوجہد وقوع میں نہ آتی، تو آج ہندستان

عزیز کی آزادی کو۔

## جزیرۃ العرب

علی الخصوص وہ جزیرۃ العرب کے استقلال و حفاظت کے لیے اپنے عہدِ قدیم کو آج پھر تازہ کرتا ہے۔ یہ مطالباتِ خلافت کی سب سے زیادہ اہم اور غیر مبدّل دفعہ تھی، جس کا ۱۹۲۰ء میں اس ایوان نے اعلان کیا۔ ہندستان کے لیے یہ مطالبہ صرف اسی لیے اہم نہیں ہے کہ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا مذہبی اعتقاد اس سے وابستہ ہے، بلکہ ہندستان خود اپنی آزادی کے لیے بھی اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ہندستان، مصر اور عرب کی جغرافیائی اور طبیعی حالت کچھ اس طرح واقع ہوئی ہے کہ ان کی سیاسی قسمت ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے وابستہ ہو گئی ہے اور ان میں ہندستان کا وجود زنجیر کی پہلی کڑی کی طرح اپنے دونوں ہمسایوں کے لیے ہر چیز کی ابتدا ہے۔ یہ ہندستان ہی کی غلامی ہے جس کو دائمی بنا دینے کے لیے ضروری ہوا کہ نہرِ سویز برطانیہ کے قبضہ سے باہر نہ ہو۔ اور اب عرب کا استقلال بھی صرف ہندستان ہی کی بد قسمتی پر قربان ہو رہا ہے۔ عرب، جس کی آزادی ہندستانی فوجوں ہی کے ذریعہ پامال کی گئی، اگر برطانی اقتدار کا ایک نیا ایشیائی مرکز بن گیا، تو پھر ہندستان کی غلامی کی سرحدیں بحرِ ہند ہی سے شروع نہ ہونگی، بلکہ ایک طرف شام کے ساحلوں پر اس کی دیوار کھڑی ہو جائے گی، دوسری طرف خلیج فارس سے گذر کر موصل اور دیار بکر کے حدود سے اس کا آغاز ہوگا۔ ہندستان عرب کے تمام باشندوں کو یقین دلاتا ہے کہ اُن کا استقلال اور اجنبی اقتدار سے تحفظ اُس کی جد و جہد کا اب بھی ویسا ہی مقصد ہے، جیسا کہ ۱۹۲۰ء کے اعلان میں تھا۔ وہ اُس وقت تک اپنی جد و جہد جاری رکھیگا، جب تک عربی ممالک کا کوئی ایک گوشہ بھی اجنبی اقتدار سے آلودہ رہیگا۔

بھی فارغ ہو گیا، کیونکہ آزادی کا حصول دراصل قوم کی مرضی کے نشو و نما ہی کا نام ہے۔

حضرات!

میں آپ سے یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ گزشتہ چار سال کے اندر مطالباتِ خلافت کے لیے میں نے جو سعی کی، اس کی نسبت میرا ذاتی احساس ہمیشہ یہ رہا ہے کہ نہ صرف بحیثیت مسلمان ہونے کے، بلکہ بحیثیت ہندستانی ہونے کے، یہ میرا قومی فرض ہے۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ ہندستان کی تحریکِ خلافت ہندستان کی بڑی سے بڑی خدمت تھی، جو تاریخِ ہند کی اس عظیم شخصیت یعنی مہاتما گاندھی نے انجام دی ہے۔

## وقت کی مشکلات

حضرات!

میں نے آغازِ تقریر میں آپ سے وقت کی مشکلات کا ذکر کیا تھا۔ ہر جماعتی جدوجہد کی کامیابی کے لیے اتحادِ عمل شرط ہے اور تفرقہ خطرہ۔ اس وقت ہم میں شرط کمزور ہو گئی ہے اور اس لیے ہمیں خطرہ پیش آ گیا ہے لیکن میں سب سے پہلے آپ کو توجہ دلاؤں گا کہ ان مشکلات کی نوعیت اور مقدار کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر لیجیے۔ اگر اس میں ذرا بھی کمی بیشی ہوئی، تو عجب نہیں، ہم ایک دوسرے خطرہ سے دوچار ہو جائیں۔ آج ہم ایک ایسے وسط میں کھڑے ہیں جس کی ایک انتہا غفلت ہے اور دوسری مایوسی۔ اگر ہم نے مشکلات کو اصلیت سے زیادہ سمجھا، تو یہ غفلت کی طرف اقدام ہوگا۔ اور اگر کم کر کے دیکھا، تو اس میں مایوسی کی طرف بڑھ جانے کا اندیشہ ہے۔ ہمیں نہ تو غافل ہونا چاہیے، نہ خائف؛ ہم کو مقابلہ کرنا چاہیے اور غالب آنا چاہیے۔ لیکن یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ ہم مشکلات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر لیں۔ راہ میں ہتھیار سے پہلے ترازو کی ضرورت ہے۔

کی تمام ایشیا اور افریقہ میں کیا حیثیت ہوتی ؟ ترکی اور عرب کی آزادی اسی کی فوجوں کے ذریعہ پامال کی گئی تھی۔ اس لیے ظاہر ہے کہ تمام مشرق کی متفقہ نفرت اور حقارت اس کے حصہ میں آتی۔ جہاں کہیں بھی ایک ہندستانی نظر آجاتا، انگلیاں اٹھتیں کہ یہ ایک بدبخت ملک کا باشندہ ہے۔ یہ صرف اپنی بدبختی پر قانع نہیں ہے، بلکہ مشرق کی آزاد قوموں کے لیے بھی بدبختی کا ذریعہ ہے۔ لیکن آج حالت بالکل پلٹ چکی ہے۔ آج ہندستان سر اٹھا کر یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کے دامن پر اس کی بے بسی نے جو دھبہ لگا دیا تھا، اس کی مرضی اور اختیار نے اسے دھو دیا ہے۔ اگر ایسا ہوا تھا کہ بلا اپنی مرضی اور خواہش کے ہزاروں ہندستانی میدانِ جنگ میں گئے، تاکہ ترکوں اور عربوں کی آزادی کے خلاف تلوار اٹھائیں، تو یہ بھی ہو چکا ہے کہ خود اپنی مرضی اور خواہش سے ہزاروں ہندستانی جیل خانوں میں گئے، تاکہ ترکوں اور عربوں کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ آج مشرق کے ایک ایک گوشہ سے ہندستان کے لیے عزت و احترام کی صدائیں اٹھ رہی ہیں۔ قسطنطنیہ میں اس کا نام اس طرح لیا جاتا ہے، گویا وہ مشرق کی آزادی کا علمبردار ہے۔ قاہرہ کے بازاروں سے صدائیں اٹھ رہی ہیں کہ اللہ ینصرك یاغاندی (اے گاندھی، خدا تجھے فتحمند کرے)۔ یہ فی الحقیقت آزاد قوموں کی سی عزّت ہے، جو محکوم ہندستان نے حاصل کر لی ہے۔ اور یہ بلاشبہ اسی تحریکِ خلافت کا نتیجہ ہے۔

پھر ان دونوں نتائج سے بھی بڑھ کر جو چیز ہمارے سامنے آتی ہے، وہ ہندستان کا وہ حرّیت طلبانہ ذہنی ارتقاء ہے، جو اس جدوجہد کے ذریعہ اس نے حاصل کر لیا۔ کسی قوم کے آزاد ہونے کے لیے پہلی چیز یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو آزادی کا پورا قدر شناس ثابت کر دے۔ جس وقت ہندستان نے یہ مطالبہ کیا کہ ترکی اور عرب آزادی سے محروم نہیں رہ سکتا، اس نے اپنی قدرشناسی کا ثبوت مہیا کر دیا۔ محکوم قوموں کی نہ تو کوئی خواہش ہوتی ہے نہ مرضی۔ اگر ہندستان کی ترکی کے لیے کوئی مرضی ہے جس کے حصول کے لیے وہ جدوجہد کر سکتا ہے، تو پھر وہ اپنی آزادی کے کام سے

ٹھیک ٹھیک اسی طرح اور عصروں کے لیے بھی ہے۔ جس طرح افراد کا جسم ہے، دماغ ہے اور وہ تمام قویٰ اور خواص ہیں جو جسم و دماغ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی طرح جماعتوں اور عصروں کا بھی جسم ہے، دماغ ہے، نفسیاتی (سائیکلوجیکل) کیفیات ہیں، جو ان کے ترکیبی مزاج سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور ضرور ہے کہ ایک طرح کی طبیعت اور ایک طرح کے گرد و پیش میں ایک ہی طرح کے حالات ہمیشہ پیش آئیں اور ایک ہی طرح کے نتائج پیدا ہوں۔ جس طرح افراد کے اعمال و نتائج کا تعلق ان کی شخصیت سے نہیں ہے، بلکہ ان کی دماغی و جسمانی حالات سے ہے۔ ایک طرح کی دماغی و جسمانی حالات میں ہر فرد سے ایک ہی طرح کے افعال کا صدور ہوگا، اسی طرح جماعتوں کے اعمال و احوال میں بھی جماعت کا تشخّص و تعیّن بالکل غیر موثّر ہے۔ حالات و نتائج ایک خاص طرح کی طبیعت اور گرد و پیش سے تعلّق رکھتے ہیں۔ جب کبھی کسی جماعت کی ویسی طبیعت ہوگی اور ویسا ہی گرد و پیش پیش آئیگا، ضرور ہے کہ وہ ظہور میں آئیں۔ قوموں کا آغاز و انجام، عروج و زوال، غفلت و بیداری، آزادی و محکومیت، فتحمندی و ناکامی سب پر یہی قانون نافذ ہے اور جو کچھ ایک قوم پر گزرا ہے اور جس کے لیے ہوا ہے بجنسہٖ وہی ہر قوم پر گزرتا اور ہر قوم کو پیش آتا ہے۔ جماعتی زندگی کا یہی حیرت انگیز توافق ہے، جس کو تیرھویں صدی عیسوی کے ایک فلسفی مورخ عبدالرحمٰن ابن خلدونؒ نے (جس نے سب پہلے فلسفۂ تاریخ کے مبادیات و اصول مدوّن کیے ہیں) ان لفظوں میں تعبیر کیا ہے: اگر ہم زمانوں اور ناموں کی قید نکال دیں، تو ایک قوم اور ایک زمانہ کی تاریخ بجنسہٖ ہر قوم اور ہر زمانہ کے لیے کام دے سکتی ہے کیونکہ ناموں اور صورتوں کے تغیّر کے سوا اقوام کے حالات میں اور کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کو موجودہ زمانہ کے مشہور فرنچ مصنّف ڈاکٹر گستاولی بانؒ نے زیادہ جامع اور علمی پیرایہ میں بیان کیا ہے: جب ہم جماعتی زندگی کی سائیکولوجی اسی طرح مدوّن کر لینگے، جس طرح ہم نے انفرادی زندگی کی کر لی ہے، تو پھر ہمارے لیے ممکن ہو جائیگا کہ ہم ایک قوم اور تمدّن کی تاریخ لکھ کر اسے ہر قوم اور تمدّن کے لیے استعمال کر سکیں۔ ہزار سالہ

# قوانینِ اجتماع کی وحدت

ہمیں چاہیے کہ اس موقع پر دنیا کی اجتماعی زندگی کے وہ قدرتی قوانین یاد کرلیں، جو اگرچہ ہماری معلومات میں موجود ہیں، لیکن بسا اوقات جذبات کا غلبہ دماغ کی معلوم کی ہوئی حقیقتوں کو نظر انداز کردیتا ہے۔

ہم حرکت اور زندگی کے اس حیرت انگیز کرّہ کی ایک ویسی ہی مخلوق ہیں، جیسی اَن گنت اور نامعلوم مخلوقات اس یکساں گردش کے ساتھ ظہور میں آتی رہی ہیں، اور آج بھی اس کی آغوش میں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ خود بھی اس کائناتِ ہستی کا ایک چھوٹا سا جزو ہے، جس کی نسبت ہم نہیں جانتے کہ کتنا ہے اور کہاں تک ہے۔ لیکن ہم نے جان لیا ہے کہ وہ اپنی ساری باتوں میں کامل طور پر یکساں ہے اور اگرچہ اس میں زندگی اور حرکت کے بیشمار مظاہر ہیں لیکن ان سب کے لیے ان کے خالق کی مرضی کی طرح قانونِ حیات بھی ایک ہی ہے۔ اس لیے اُس میں نہ تو کوئی نئی بات ہوتی ہے، نہ اُس کی کوئی ایک چیز دوسری چیز سے الگ اور مختلف ہے۔ جو کچھ ایک مرتبہ ہوچکا ہے، وہی ہمیشہ ہوتا ہے؛ اور جو ایک کے لیے ہوا ہے، وہی سب کو پیش آتا ہے۔ وہ یکساں ہے، ہمہ گیر ہے، باہم مشابہ ہے اور اٹل ہے۔ ایران کے فلسفی شاعر عمر خیام کے لفظوں میں "اس کی زندگی کی کہانی ایک ہی ہے جو ہمیشہ نئے نئے ناموں اور نئی نئی شکلوں میں دہرائی جارہی ہے"۔ اور فرانس کے مشہور شاعر وکٹر ہیوگو کے زیادہ مختصر لفظوں میں "حوادثِ عالم کی داستان اگرچہ مسلسل ہے مگر محض تکرار ہے"۔

حوادثِ عالم کی اس کامل یکسانیت اور قوانینِ حیات کی اس غیر مبدّل یگانگت کی جلوہ طرازی پر جس طرح شاعر کے وجدان نے وجد کیا ہے، اُسی طرح مؤرخ کی نگاہوں نے مطالعہ کیا ہے، اور فلسفی نے اس سے نتائج اخذ کیے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ بحیثیت ایک سیاسی عامل کے اُس کے لیے آنکھیں کھول دیں۔ یہ یکسانیت کا قانون جس طرح افراد و اجسام کے لیے ہے،

جسم کے لیے بھی۔ اس میں اندر کے طوفان بھی اٹھتے ہیں اور باہر کے سیلاب بھی بہتے ہیں اس میں جا بجا ٹھوکریں بھی ہیں اور قدم قدم پر لغزشیں بھی۔ اس کا سفر کبھی یکساں رفتار میں جاری نہیں رہ سکتا۔ وہ ہمیشہ رُک رُک کر چلتا ہے اور تھم تھم کر بڑھتا ہے۔ اس میں گر گر کر اٹھنا پڑتا ہے اور ٹھوکر کھا کھا کر دوڑنا پڑتا ہے۔ اس کی کامیابیاں مسلسل نہیں ہیں، مگر ضروری ہیں۔ اس کی فتحمندی قدم قدم پر نہیں ہے، مگر آخر میں ہے اور اٹل اور یقینی ہے۔

حضرات!

خدا کا یہ قانونِ حیات ہماری تن آسانیوں کی خاطر معطّل نہیں ہوسکتا۔ ہم چلے ہیں، تو ہمارے لیے بھی اس کی تمام منزلیں چشم براہ ہیں؛ اور ناگزیر ہے کہ ہم ان سب میں سے گزریں۔ اگر ہماری تیز رفتاری رُک گئی، تو ہمیشہ رُکا کرتی ہے؛ ہمیں تیزی سے پھر روانہ ہوجانا چاہیے۔ اگر ہماری حرکت میں ایک دفعہ وقفہ سا پڑ گیا تو پڑا ہی کرتا ہے؛ ہمیں از سرِ نو کوچ کردینا چاہیے۔ اگر ہم ایک خاص مسئلہ میں متفق نہ ہوسکے، یا ہمارے اتحاد کے رشتہ میں ایک گرہ پڑ گئی، تو کوئی مضائقہ نہیں، ہم کیوں نہ متفق ہوجائیں۔ بلاشبہہ یہ ایک آزمائش ہے، جو سب کی طرح ہمیں بھی پیش آگئی ہے اور اس پر اسی طرح غالب آنا چاہیے، جس طرح باہمّت قومیں غالب آتی ہیں، لیکن اس سے زیادہ نہ اس میں کوئی ہراس ہے نہ مایوسی۔ یہ کوئی نرالی بجلی نہیں ہے جو ہمیں پر گری ہو، یہ تو اس راہ کا ایک معمولی حادثہ ہے، جو ہماری طرح، نہیں معلوم کتنوں کو پیش آچکا ہے، اور ہمارے بعد کتنوں کو پیش آئیگا۔

## ایک آزمایشی منزل

آئیے! ایک لمحہ کے لیے ٹھہر کر دیکھ لیں کہ آج جو مشکلات پیش آئی ہیں، جماعتی اعمال کی نفسیات میں ان کی حقیقت کیا ہے؟ یہ کہنا ضروری نہیں کہ فرد کی طرح قوم کے اعمال کا اصلی سرچشمہ بھی دماغ ہے۔ قوم کے افراد کا دماغی نشوونما جب اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ

تقویم کی طرح وہ ہمیں ہر سال یکساں طور پر کام دے سکیگی۔

# قومی جدوجہد کا سفر اور اس کی منزلیں

حضرات!

آج ہمارے لیے بہت ضروری ہے کہ قومی زندگی کے اُس قانون کے قطعی اور اٹل احکام سے غافل نہ ہوں۔ صرف یہی بات ہمارے تمام بیجا تعجبوں اور بیجا اندیشوں کو دُور کر سکتی ہے۔ ہمیں آگاہ رہنا چاہیے کہ آج جو کچھ پیش آرہا ہے، وہ نہ تو نیا ہے نہ معمول کے خلاف، بلکہ قومی جدوجہد کے اس مرحلہ کی جس سے ہندستان گزر رہا ہے، ایک بالکل قدیم، معمولی اور ناگزیر حالت ہے۔ دراصل ہم وہ کر رہے ہیں، جو ہمیشہ گزر چکا ہے؛ اور وہ دیکھ رہے ہیں، جو ہم سے پہلے دیکھا جا چکا ہے۔ ہم کچھ نہیں ہیں، مگر تاریخ اقوام کا ایک صفحہ ہیں، جو اس قانونِ اجتماع کی یکسانیت کی بیشمار نظیروں پر ایک نئی نظیر کا اضافہ کرتا ہے۔

دنیا میں ہمیشہ یہ ہوا ہے کہ قومیں غفلت کے بعد بیدار ہوئی ہیں اور جب ان کی دماغی اور فکری حالت کا انقلاب پورا ہو چکا ہے تو ان کی خارجی حالت پر بھی یکے بعد دیگرے تغیرات طاری ہوئے ہیں۔ اگر میں ایک قدیم جرمن حکیم ہرمن[12] کا استعارہ مستعار لوں، تو کہہ سکتا ہوں کہ قومیت کی روح ہمیشہ افراد کی غفلت میں سوتی ہے، ذہن و دماغ کے تغیرات میں خواب دیکھتی ہے، جذبات کے ہیجان میں کروٹ بدلتی ہے، اور بالآخر جدوجہد کے میدان میں اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ پھر یہ جدوجہد بھی ایک ایسا سفر ہے، جس کی بندھی ہوئی منزلیں ہیں، اور ٹھہرائے ہوئے رسم و راہ ہیں، جو ضرور ہے کہ ہر قوم کو پیش آئیں اور ضرور ہے کہ ہر کامیاب قافلہ ان میں سے گزرے۔ جس طرح اس کی کامیابیاں عظیم ہیں؛ اسی طرح اس کی رکاوٹیں بھی بیشمار ہیں؛ اور جس طرح اس کی فتحمندی اٹل ہے؛ اسی طرح اس کی مشکلات بھی ناگزیر ہیں۔

اس کی مشکلات داخلی بھی ہیں اور خارجی بھی۔ اس میں دماغ کے لیے بھی آزمائشیں ہیں اور

خمار کے لیے ضروری تھی۔ معًا افسردگی کا یہ وقتی حجاب دور ہو جاتا ہے اور جدوجہد پھر اپنی اصلی سرگرمی کے ساتھ رُونما ہو جاتی ہے بلکہ اکثر حالتوں میں پہلے سے زیادہ مضبوط اور دیرپا ہوتی ہے کیونکہ یہ وقتی وقفہ محض سطح کا تھا، گہرائیوں کی قوتیں برابر کام کر رہی تھیں۔ اب دوسرے ظہور میں تازہ قوت کے ساتھ پچھلی قوتوں کی مقدار بھی موجود ہوتی ہے۔

دنیا کے تمام تغیرات و حوادث کی طرح جماعتوں کے اعمال بھی یا ختم ہو جاتے ہیں، یا جاری رہتے ہیں، بار بار پیدا نہیں ہوتے۔ البتہ اُتار چڑھاؤ رہتا ہے۔ ہم غلطی سے اُتار کو خاتمہ اور چڑھاؤ کو پیدائش سے تعبیر کرنے لگتے ہیں۔ کسی قومی جدوجہد کے وقفہ کو خاتمہ سمجھ لینا ایسی غلطی ہوگی جیسے سمندر کا اُتار دیکھ کر سمجھ لیں کہ وہ پھر کل نہیں چڑھے گا۔

ہماری اس قومی جدوجہد کو بھی ایک حرکت کے بعد ایک وقفہ پیش آگیا ہے۔ جدوجہد پوری تیزی کے ساتھ دوڑ رہی تھی یکایک بارڈولی[۱۳] کے فیصلہ نے اشارہ کیا کہ تھم جاؤ۔ وہ اچانک تھم گئی لیکن یہ قدرتی بات تھی کہ اس نے صدمہ محسوس کیا اور اس سے وہ تمام نتائج پیدا ہوئے جو ایسے وقفہ کا قدرتی مقتضا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہماری جمعیت جنبش میں آگئی ہے۔ ایسا دکھائی دیتا ہے گویا ایک بندھی اور لپٹی ہوئی چیز تیزی کے ساتھ کھلتی اور بکھرتی جا رہی ہے جدوجہد کا عام سکون، کانگرس کا اختلاف، ہندو مسلم اتحاد میں فتور، اتحاد کی کوششوں کی درماندگیاں یہ سب اسی حالت کے برگ و بار ہیں۔

حضرات!

یقینًا یہ ایک آزمایش ہے جس پر ہمیں فتحمند ارادوں کے ساتھ غالب آنا پڑیگا۔ اور عجب نہیں کہ بڑی کشمکش کرنی پڑے۔ تاہم امید کرونگا کہ آپ اس سے زیادہ کوئی اثر اپنے دل و دماغ کے لیے قبول نہ کرینگے۔ ایک ایسے شخص کے لیے جو اقوام کی نفسیات اور تاریخ کا شناسا ہو، یہ حالت بالکل ایک ایسی معمولی بات ہے جیسے ایک آدمی کا دوڑتے دوڑتے رُک جانا کہ دم لے کر پھر دوڑے۔

خارج میں بھی اپنا اثبات کرے، تو وہ مناسب حالات کا انتظار کرتا ہے۔ مناسب حالات میں اسے سب سے زیادہ ضرورت کسی ایسے قومی موثر کی ہوتی ہے، جو فکر ورائے کے تمام انتشار واختلاف پر غالب آکر قوم کے بکھرے ہوئے عناصر کے لیے ایک نقطۂ اجتماع پیدا کردے۔ افراد کے دماغ جب جماعت کے ترکیبی دماغ میں منقلب ہوجاتے ہیں، تو ان میں عقل وادراک سے زیادہ جذبات کا عنصر کام کرتا ہے۔ پس یہ مرکز بھی جذبات سے پیدا ہوتا ہے، نہ کہ ادراک سے۔ جب ایسی حالت مہیّا ہوجاتی ہے، تو عملی جدوجہد ظہور میں آتی ہے اور بقدر اپنی قوت کے اُبھرتی اور مخالف قوتوں سے ٹکراتی ہے۔ پھر یا تو کسی معیّن حد تک پہنچنے میں کامیاب ہوجاتی ہے، یا راستہ کے قدرتی قوانین کے ماتحت اُسے رُک رُک کر جانا پڑتا ہے۔ اس رکاوٹ کی بھی مختلف حالتیں ہیں اور مختلف احکام ہیں، لیکن ہر حال میں یہ ضروری ہے کہ کسی نہ کسی حد تک ردِّ عمل (ری ایکشن) کا قانون اپنا اثر دکھلائے۔ اس وقت اچانک ایک افسردگی اور اضمحلال کے آثار طاری ہونے لگتے ہیں۔ سب سے زیادہ اس کا اثر خیالات کی جمعیت پر پڑتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک ایندھن میں بیشمار بکھرے ہوئے اوراق بندھے ہوئے تھے، یا تو اس کی گرہ ڈھیلی پڑگئی ہے یا کھل گئی ہے۔ اب اختلافات شروع ہوتے ہیں، انتشار کی ہوائیں چلنے لگتی ہیں، اور قومی جدوجہد کو ایک سخت آزمائش پیش آجاتی ہے۔ چونکہ جماعت کے تمام حالات کی طرح یہ حالت بھی طبعی ہے۔ اس لیے علم وادراک اس میں بہت کم تبدیلی پیدا کرسکتا ہے۔ افراد کتنے ہی ہوشمند اور دنیا کے پچھلے تجربوں سے باخبر ہوں لیکن اپنے جذبات کو ان حالات ونتائج سے نہیں روک سکتے۔ تاہم اگر جدوجہد کا دماغ اور پھیپھڑا محفوظ ہو تو یہ جو کچھ ہوتا ہے جسم کے عوارض ہوتے ہیں۔ جدوجہد کی زندگی کے لیے ان میں کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ یہ اکثر حالتوں میں ایک عارضی وقفہ ہوتا ہے۔ بعض حالتوں میں ایک مشکل عقدہ، اور کبھی کبھی ایک خطرناک التوا کی بھی صورت اختیار کرلیتا ہے لیکن جونہی وہ مدّت ختم ہوتی ہے جو اس نشہ کے

ہو رہا ہے۔ ہم کو صرف اتحاد کی ضرورت ہے اور ہم اسی کی ڈھونڈ میں آج یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔

حضرات!

آج کا یادگار دن اسی لیے آیا ہے کہ ہمیں اس آزمائش سے کامیاب گذر جانے کی نہایت قیمتی مہلت دے ہم نے آج تمام دنیا کی نگاہوں کو دعوت دی ہے کہ وہ ہماری آزمائش کے نتیجہ کا تماشا کریں۔ کیا ہم اس کی یادگاروں کا بہترین استعمال کرینگے؟ اس کا جواب ہمیں چند گھنٹوں کے اندر دینا ہے۔

## لاتعاون سلمی

حضرات!

میرے لیے ناگزیر ہے کہ میں اپنی گزارش کسی ابتدائی سرحد سے شروع کروں۔ ہم نے حصولِ مقصد کے لیے، عام تشدد اور ترکِ تعاون کا اصول اختیار کیا ہے۔

نون کواپریشن[14] کی بنیاد دراصل دنیا کے اس سادہ مگر عالمگیر اعتقاد پر ہے کہ ہمیں برائی کا ساتھ نہیں دینا چاہیئے اور اسے اکیلا چھوڑ دینا چاہئے تاکہ وہ پھول پھل نہ سکے۔ دنیا کے تمام مذہبوں اور اخلاقی تعلیمات کی یہ ایک مشترک سچائی ہے اگر اس اصولی تعریف میں برائی کا لفظ نقصان سے بدل دیا جائے (اور میرے خیال میں دونوں کو مترادف ہی ہونا چاہیے) تو پھر یہ نوعِ انسانی کا نہ صرف عالمگیر اعتقاد بلکہ حیوانی فطرت کا ایک قدرتی رجحان ہو جاتا ہے اور یہاں بھی مذاہب کی صدائیں ہمارے کانوں میں پہنچتی ہیں۔ اسلام نے اپنے پیرؤں کو "ترکِ موالات" کا حکم دیا ہے، جس کا منشا یہی ہے کہ جن لوگوں کے کاموں میں تمھارے لیے قومی نقصان ہے، تم کسی طرح ان کی مدد اور مضبوطی کا ذریعہ نہ بنو۔ دوسرے مذہبوں میں بھی ایسی ہی تلقین موجود ہے۔

ہیں اس کی بالکل پروا نہیں کرنی چاہیے کہ ہمارے مخالفین اور نکتہ چین ہماری اس حالت سے دھوکا کھانا پسند کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ ایک ایسی حالت میں ہیں جس میں طاقت کا صرف اُسی وقت اقرار کیا جاتا ہے جب وہ بالکل سامنے آجائے۔ لیکن خود ہم کو نہیں چاہیے کہ اپنی حقیقتِ حال کی نسبت کسی قسم کا شبہہ قبول کریں۔ کیا ہے جو ہم نے کھو دیا ہے؟ ہماری جدوجہد کے تمام دماغی قویٰ پوری طرح مضبوط ہیں۔ اس کی جڑوں میں اب تک کوئی جنبش نہیں آئی۔ ہم اس کے قدموں کی سُستی محسوس نہیں کرتے؟ کیا ہم کو خود اپنے محسوسات میں بھی شبہہ ہو سکتا ہے۔ کیا ہم محسوس نہیں کر رہے ہیں کہ وہ ایک عقیدہ کی طرح ہمارے دلوں میں ہے، ایک مقصد کی طرح ہماری نگاہوں میں ہے، اور روح کی طرح ہمارے جسم کی ایک ایک رگ میں دوڑ رہی ہے۔

حضرات!

مجھے اجازت دیجیے کہ میں آج آپ سب کی جانب سے ایک ایسا اعلان کر دوں، جو فی الحقیقت آپ کے یقین و احساس کی ترجمانی ہے۔ میں پورے اطمینان کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ ہماری جدوجہد قائم ہے، بدستور جاری ہے، اور ہم ایک ایسے وقفہ کی حالت میں ہیں جس نے فیصلہ کُن معرکہ میں التوا ڈال دی ہے، مگر جنگ کے لیے التوا نہیں۔ ہمارے لیے ہُشیاری، سرگرمی اور کوشش کے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ مگر ہم ان سے قطعی انکار کرتے ہیں کہ التوا یا نا امیدی کا کوئی سوال درپیش ہے۔ لیکن جب میں نے آپ کو اس طرف توجہ دلائی کہ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں، تو مجھے یہ بھی عرض کرنے دیجیے کہ غفلت کے لیے بھی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ہمیں اپنی روزانہ زندگی کی یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ بیماری کتنی ہی بے حقیقت ہو، لیکن غفلت اور بد پرہیزی سے فوراً مہلک بنا دی جا سکتی ہے۔ آج جو آزمائش ہمیں پیش آئی ہے، فی الواقع یہ ایک عارضی وقفہ ہے بشرطیکہ ہم اس کو زیادہ بڑھنے نہ دیں۔ ہم ایسا کیونکر کر سکتے ہیں؟ وقت کی مشکلات کا علاج کیا ہے؟ اس سب کا جواب ہم سب کو معلوم ہے لیکن اس پر عمل دشوار

کہ مارنے سے مارا جانا بہتر ہے۔ اس لیے ہم جھیلتے ہیں مگر مقابلہ نہیں کرتے۔
اس سے زیادہ مکمل اور مؤثر اسپرٹ مقاومتِ سلبی کی کیا ہو سکتی ہے؟ ہم چاہیں تو سترہ سو برس کے ان پرانے لفظوں کو بجنسہٖ آج بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

# کاؤنٹ لیو ٹالسٹائی

البتّہ یہ بات کہ سیاسی حقوق کے حصول اور نامنصفانہ حکومت کے نظاموں کو شکست دینے کے لیے اسے بطور ایک دستور العمل کے اختیار کیا جائے اور مسلّح انقلاب کی جگہ صرف اسی پر قناعت کر لی جائے ایک ایسا خیال ہے جو غالباً موجودہ زمانہ میں سب سے پہلے روس کے سچّے مسیحی معلّم کاونٹ ٹالسٹائی[23] نے اپنی شہرہ آفاق تعلیمات میں ظاہر کیا ہے۔ اور اس قابلِ تعظیم کا داغ دراصل مغربی تمدّن کی بے روح مادّیت، نظامہائے معاشرت کی بے حد ناہمواری سرمایہ داری (کیپیٹل ازم) کی بے روک، بے اعتدالی، اور روس کے ارتھوڈکس چرچ کے مذہبی استبداد اور جمود کے برخلاف ایک انتہائی پروٹسٹ[24] تھا۔ اور اسی انتہائیت کا اثر ہے کہ اس کے انقلابی نظریّات کی نسبت ہمیں امریکہ کے گزشتہ پریزیڈنٹ روز ویلٹ[25] کے نکتہ چین لفظوں میں (جو اس نے ایک مرتبہ امریکن اوٹ لک میں لکھے تھے) ماننا پڑتا ہے کہ "وہ بلا کسی جھجک کے عملیت اور اعتدال کی سرحد عبور کر گئی ہیں"۔ تاہم اس کی تمام تعلیمات میں یہ تعلیم ایک ایسی معتدل تعلیم ہے جس کی سادہ عملیّت بالکل آشکارا ہے اور وہ بلاشبہہ دنیا کو اس کی سب سے بڑی جستجو کا نہایت صاف اور آسان سراغ بتلا دیتی ہے۔ ٹالسٹائی کی تعلیم کی اصلی روح یہ تھی کہ قتلِ انسانی اور جنگ کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ جو قوتیں انصاف اور انسانی حقوق کی راہ میں حائل ہیں۔ ان کا نہ تو اسلحہ سے مقابلہ کرنا چاہیے اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ ان کی طاقت ان کے کارخانوں سے ہے جو انھوں نے ہر طرف پھیلا رکھے ہیں۔ اگر لوگ اپنی شرکت اور اعانت سے ان کے پھولنے پھلنے کا باعث نہ ہوں، تو وہ ایک منٹ کے لیے بھی ٹِک نہیں سکتے۔

قوموں کی سیاسی جد وجہد کے میدان میں دیکھا جائے جب بھی یہ نہ صرف ایک متفقہ اعتقاد ہے بلکہ متفقہ عمل ہے یہ بالکل ظاہر ہے کہ دنیا میں کوئی قوم اور جماعت اپنے آزادانہ حقوق کو اپریشن[15] کے ذریعہ حاصل نہیں کر سکی ہے۔ ہر قوم نے اپنے حقوق جد وجہد کر کے حاصل کیے ہیں اور جد وجہد مقابلہ اور کشمکش ہے، کوآپریشن نہیں ہے۔

مقاطعہ اور مقاومتِ سلبی یا سول ڈس اَدبیڈینس[16] بھی جو اس کے سب سے زیادہ قومی ہتھیار ہیں کوئی نئی تعلیم نہیں ہے۔ کمزور افراد اور جماعتیں جب کبھی مسلح مقابلہ سے مجبور ہوئی ہیں تو انھوں نے اسی طریقہ کو اپنے مقاصد کی حفاظت کا تنہا ذریعہ پایا ہے۔ مذہب، اخلاق اور قومیت کی یہ متفقہ آواز دنیا کی بہت پرانی چیز ہے کہ مصیبت برداشت کرلو، مگر حق سے منہ نہ موڑو۔ کہا جاسکتا ہے کہ ہر مذہب اور تعلیم کی ابتدائی کمزوری اور بےبسی میں صرف یہی اصول ثبات و قرار کا ذریعہ ہوا ہے۔ ہم اس کا عکس سقراط[17] کے جامِ زہر میں دیکھتے ہیں۔ یروشلم کی صلیب[18] پر نقش پاتے ہیں اور مکّہ کی گلیوں[19] میں بھی اس کا غلغلہ سنائی دے چکا ہے۔ مسیحی مذہب کی ابتدائی دو صدیاں تمام تر اسی کا افسانہ ہیں۔ روم کے قیصر سیویرس[20] کے زمانہ میں جب کہ مسیحی چرچ کی ابتدائی بنیادیں ظلم وستم کے طوفان سے ہل رہی تھیں، یہی اصول تھا جس کی غیر مسخّر قوت اسے تھامے رہی۔ اسی عہد کے ایک مسیحی خدا کا ترتولین[21] کی ایک تحریر آج تک محفوظ ہے، جو اس نے رومی عدالتوں کے سامنے بطور اپنی تحریری بیان کے پیش کی تھی۔ اس کے یہ الفاظ امریکن مصنّف ڈریپر کی کانفلکٹ بٹوین ریلیجن اینڈ سائنس[22] میں پڑھ سکتے ہیں:

> اگرچہ ہماری جماعت کو بنے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن وہ کونسی جگہ ہے جہاں ہم موجود نہیں۔ شہر، جزیرے، صوبے، قلعے، فوجی بارکیں، دربار کے محلات، سینٹ کے اجلاس، غرضکہ ہر اُس مقام پر جو تمھارے اقتدار کی علامتیں ہیں، ہم لوگ برابر پائے جاتے ہیں۔ بجز تمھاری عبادت گاہوں کے، ہم نے تمھارے قبضہ میں کوئی جگہ نہیں چھوڑی ہے۔ غور کرو! اگر ہم چاہیں تو جنگ کا کیسا طوفان بپا ہوجائے۔ لیکن ہمارا مذہب ہم کو سکھاتا ہے

چُن لیا ہو۔ یہ شخصیت مہاتما گاندھی کے وجود میں نمایاں ہو گئی۔ ٹالسٹائی سے پہلے بھی دنیا کو نون کواپریشن کی سچائی معلوم تھی۔ لیکن مہاتما گاندھی سے پہلے اس کی عملی طاقت کا راز اسے معلوم نہ تھا۔

## نون کواپریشن کا پروگرام

ہندستان نے مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں نون کواپریشن کا جو طریقہ اختیار کیا۔ اس کے مبادیات اگرچہ وہی ہیں جو اوپر بیان کیے گئے، تاہم بہت سی باتوں میں اس سے مختلف بھی ہو گیا ہے۔ پہلے وہ ایک اخلاقی وعظ تھا اب وہ ایک سیاسی پروگرام ہے۔ ٹالسٹائی کی دعوت میں عقائد اور اصول کی ایسی انتہائی وسعتیں موجود تھیں، جو ایک طرف لوگوں کے موجودہ افکار و عقائد اور بہت سے نظامہائے عمل سے ٹکراتی تھیں۔ دوسری طرف، ان کی عملی دشواریوں پر بھی غالب آنا بہت مشکل تھا۔ لیکن موجودہ شکل نے پوری طرح دامن سمیٹ لیے ہیں۔ اب اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو کسی جماعت کے مذہبی یا سیاسی عقیدہ کو تبدیل کرنا چاہتی ہو یا ایسی دشواری رکھتی ہو جس کو ایک محدود وقت کے اندر قابو میں نہیں لایا جاسکتا۔ عدم تشدّد اس کی اصلی روح ہے لیکن یہ اس امر پر قانع ہے کہ اگر اسے بطور اعتقاد کے تسلیم نہیں کیا جاسکتا، تو بطور ایک مضبوط پالیسی کے اختیار کر لیا جائے۔ ان تمام تعلقات کو ترک کر دینا جو ہندستان کے دفتری اقتدار کے قیام کا باعث ہیں، بلا شبہ اس کا اصل اصول ہے لیکن اس کا دائرۂ نفاذ بھی اس نے بہت محدود کر دیا ہے اور جس قدر بھی ہے، اسے اس طرح عمل میں لانا چاہتا ہے کہ اس کی سختیاں کم سے کم صورت میں باقی رہ جائیں۔ ایثار، ضبطِ نفس اور اخلاقی روح کی بلندی اس کی جنگ کے اصلی ہتھیار ہیں۔ تاہم وہ اس بارے میں بھی پوری رواداری برتتا ہے۔ اور بجز ایک مرکزی اور ملک کے لیے نمونہ بننے والی جماعت کے اور کسی سے ایسا مطالبہ نہیں کرتا جس کا پورا کرنا ملک کی عام استعداد کے لیے بہت دشوار ہو۔ موجودہ شکل میں پورے وثوق کے ساتھ کہا

ٹالسٹائی نے یہ دعوت بیشمار تحریروں میں دی ہے۔ اس کے مضامین کا مجموعہ "سوشل ایول" کے نام سے مرتب ہوا ہے اس میں جا بجا اس کی صدائیں موجود ہیں۔ ۱۹۰۰ء میں جب انارکسٹوں نے ہمبرٹ[26] شاہ اٹلی کو قتل کیا، تو اس نے ایک پیام تمام ان جماعتوں اور قوموں کے نام شائع کیا، جو حقوق اور انصاف کے لیے انقلاب چاہتے ہیں۔ اس میں وہ لکھتا ہے کہ ظلم اور استبداد کا یہ علاج نہیں ہے کہ انسانوں کو قتل کیا جائے۔ یہ تو ایک مرض دور کرنے کے لیے دوسرا مرض لگا لینا ہے۔ حقیقی علاج صرف یہ ہے کہ سوسائٹی کے اس نظام کی تائید ترک کر دی جائے" جس سے تمام ناانصافیاں پیدا ہوتی ہیں۔

یہ طریقہ عمل بالکل صاف اور سہل ہے مگر اس پر عمل کیوں نہیں ہوتا! وہ خاتمہ میں خود جواب دیتا ہے: اس لیے کہ حکومتوں نے اپنے قیام و دوام کے لیے نہایت ہوشیاری سے پبلک کو مسحور بنا رکھا ہے۔ وہ اس طرح سوئی ہوئی ہے کہ نہ کچھ دیکھتی ہے نہ سمجھتی ہے پس اب ہمارا کام یہ نہ ہونا چاہیے کہ حکومتوں کا استبداد دور کرنے کے لیے قتل و خونریزی سے کام لیں، بلکہ چاہیے کہ اس جادو کو توڑ دیں اور لوگوں کو ان کی طلسمی نیند سے بیدار کر دیں۔

## مہاتما گاندھی

دنیا کو ہمیشہ تعلیم سے زیادہ عملی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ حقیقت اور سچائی کی کوئی بات بھی اس کے لیے نئی نہیں ہے لیکن جو بات نئی عظمت اور کامیابی بخشتی ہے، وہ سچائی کا یقین اور عمل ہے۔ یہ بات کہ آزادی کے لیے لڑنا ہمارا فرض ہے، ہر آدمی کو معلوم ہے۔ لیکن یہ بات کہ آزادی کے لیے لڑنا چاہیے، واشنگٹن[27] جیسے چند آدمیوں ہی کو معلوم تھا۔

پس اگرچہ ٹالسٹائی نے دنیا کو اس اصول کی طرف بلایا، لیکن اس کے قدم ایک دوسری ہی شخصیت کے انتظار میں رکے ہوئے تھے۔ ایک ایسی عظیم شخصیت جس کو قدرت نے خاص اس کام کے لیے

تجربہ میں آنے والا عمل تھا۔ جو سوال کے ایک پہلو میں نظر آتا ہے؛ اور نہ اس معنی میں دائمی اور غیر تغیّر پذیر جس کا رجحان دوسرے پہلو میں پایا جاتا ہے۔ دونوں میں دو انتہائی پہلو اختیار کر لیے گئے ہیں اور اصلیّت دونوں کے درمیان ہے۔ اس میں اعتقاد کا استحکام بھی ہے اور دستور العمل کی تغیّر پذیری بھی۔ وہ فرض اور ضرورت دونوں کو ملحوظ رکھتا ہے۔

لیکن اس کے صاف صاف فیصلے کے لیے ضروری ہے کہ ایک مرتبہ اس پروگرام کے طریقِ عمل کی ترتیب پر غور کر لیا جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس بارے میں اپنے وہ خیالات آپ کے سامنے رکھ دوں، جو نون کوآپریشن پروگرام کے اولین دن سے آج تک بلا تغیّر میرے سامنے رہے ہیں۔ نون کوآپریشن کا پروگرام قبل اس کے کلکتہ کے اسپیشل اجلاس میں منظور ہو کر پوری طرح مرتّب ہو چکا تھا۔ سب سے پہلی مرتبہ جس کمیٹی نے اس پر غور کیا وہ ابھی دہلی میں مارچ ۱۹۲۰ء میں منعقد ہوئی تھی۔ اس میں مہاتما گاندھی کے ہمراہ لالہ لاجپت رائے جی، حکیم اجمل خاں صاحب اور میں غور و مشورہ میں شریک تھے۔ میں آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس تاریخ سے لے کر آج تک مجھ پر کوئی وقت ایسا نہیں گذرا ہے جب مجھے اس کا خیال بھی ہوا ہو کہ یہ اس سوال کے دونوں انتہائی پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کا نام ہے۔

## پروگرام کی نوعیّت

اس پروگرام کی بنیاد اصل یہ ہے کہ ہم ہندستان کی موجودہ مسلّح بیوروکریسی[28] کے مقابلہ میں غیر مسلّح اور سلمی (نون وائیلنٹ[29]) جدوجہد کے ذریعہ ایسی فتحمندی حاصل کر سکتے ہیں کہ وہ ہندستانی قوم کی مرضی کے آگے ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو جائے۔ ہم نے "ہندستان کی مرضی" کو "خلافت، پنجاب، اور سوراج" سے تعبیر کیا ہے لیکن فی الحقیقت ہمارا معاملہ ان بہت سے لفظوں میں نہیں، بلکہ اسی ایک لفظ میں مضمر ہے۔ ہر ملک کی طرح ہندستان کے لیے بھی آج جس سوال کا فیصلہ درپیش ہے، وہ صرف یہ ہے کہ کیا قوم کی مرضی کی نمائندہ اس ملک کے باشندوں

جاسکتا ہے کہ وہ تمام حقوق طلب جماعتوں کے لیے ایک ایسا سیاسی دستور العمل بن گیا ہے، جو زیادہ سے زیادہ واضح، سادہ اور اس لیے عملی ہو سکتا ہے اور دنیا کی قوتوں کی غیر مسلّح فتحمندی کا یقین دلاتا ہے ان میں نہ صرف اصول کی سچائی ہی ملحوظ ہے بلکہ عمل کی بھی تمام دشواریوں پر نظر رکھی گئی ہے۔

# ترتیبِ عمل

حضرات!

نون کواپریشن کے پروگرام کی بعض دفعات کی نسبت ہم میں جو اختلاف پیدا ہو گیا ہے، وہ اگرچہ فی الحقیقت صرف اس کے ایک جزوی طریقِ عمل سے تعلق رکھتا تھا لیکن جب اس نے بحث و مباحثہ کی صورت اختیار کر لی تو جیسا کہ قاعدہ ہے طرح طرح کے نئے نئے سوالات پیدا ہوتے گئے۔ اب سب سے پہلے جو سوال ہمارے سامنے آتا ہے، وہ ہمارے موجودہ پروگرام کی نوعیّت کا ہے۔ یہ پروگرام ایک مرتبہ عمل میں لایا گیا اور جس قدر نتائج اس وقت حاصل کر سکتا تھا، اس نے حاصل کیے۔ لیکن جنگ کسی فیصلہ کُن نتیجہ تک نہ پہنچ سکی۔ اس کے تمام معرکے ابھی باقی ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ موجودہ حالت میں اس پروگرام کی نوعیت کیا ہے؟ کیا یہ ایک ایسا پروگرام تھا، جو صرف ایک ہی مرتبہ عمل میں لایا جا سکتا تھا۔ اگر یہ چل گیا تو چل گیا، نہیں تو پھر کسی دوسرے پروگرام کی جستجو کرنی چاہیے۔ یا یہ اخلاق اور مذہب کی دعوت کی طرح ایک دائمی اور غیر متغیر دعوت ہے، جسے کسی غیر معلوم وقت تک کے لیے ہمیں کہتے رہنا چاہیے اور ہمارا مقصد اس دن حاصل ہوگا جس دن تمام ملک یا ملک کا غالب حصہ اس پر پورا پورا عمل کر لیگا، اگرچہ ایسا وقت کتنی ہی مدت کے بعد آئے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں سب سے پہلے اس سوال پر غور کر لینا چاہیے۔ میں سوال کے ان دونوں پہلوؤں کا جواب نفی میں دینا چاہتا ہوں جو وہ ہے اس معنی میں محض ایک ہنگامی اور ایک ہی مرتبہ

تو وہ گو بقیہ کا بھی خواہشمند رہیگا، لیکن اس کے انتظار میں رُکیگا نہیں۔
صورت اس کی یہ ہے کہ اس نے اپنے عمل کو دو قدرتی حصوں میں تقسیم کردیا۔ ایک جنگ کے لیے مواد کا مہیا کرنا اور ایک خود جنگ کا، معرکۂ جنگ کے سروسامان کے لیے اسے آدمیوں کی ضرورت ہے اور اس اسپرٹ[۱۱] کی جو وہ اپنی غیر مسلح جنگ کے لیے ضروری سمجھتا ہے۔ جنگ کے میدان کے لیے اسے ایسے مناسب تصادم کی ضرورت ہے، جو اس کی سلبی (پازیٹو[۱۲]) قوت اور دفتری اقتدار میں پیدا ہوجائے اور جو بالآخر ایک فیصلہ کن معرکہ کی طرح نتیجہ خیز ثابت ہو۔
پہلی غرض کے لیے اس نے وہ پروگرام اختیار کیا ہے جس میں وہ سرکاری درباروں، تعلیمگاہوں اور عدالتوں سے نون کواپریشن کی دعوت دیتا ہے کیونکہ اس کو یقین ہے کہ کواپریشن کی اگلی بستیوں میں کئی ایسے آدمی موجود ہیں، جو دفتری اقتدار اور قومی جدوجہد دونوں کے لیے بہترین سپاہی ہوسکتے ہیں۔ پس وہ ان کو بلاتا ہے۔ تاکہ ایک طرف حریف کے قبضہ سے اس کی بہترین فوج نکل سکے، دوسری طرف اس کی جنگ کے لیے بہترین سپاہی مہیا ہوجائیں۔ جب اس دعوت کے ذریعہ ایک تعداد فراہم ہوگئی تو گویا اس نے اپنی پہلی فوج تیار کرلی۔ اب یہی فوج اس کی تمام جدوجہد کے لیے اصلی اور مرکزی فوج ہے۔ اس کی تمام آیندہ امیدیں ملک سے نہیں، بلکہ اسی جماعت سے وابستہ ہیں۔
یہ پہلی فوج ایک طرف بلا انتظار جنگ شروع کردیگی۔ دوسری طرف اپنی دعوت اور عملی نمونہ کی تاثیر سے وقتاً فوقتاً نئی نئی جماعتوں کو بھی اپنے میں جذب کرتی جائیگی۔
دوسری غرض کے لیے اس نے مقاومتِ سلبی یا سول ڈس آ دبیڈئینس کا پروگرام اختیار کیا ہے۔ یہی اس کی اصلی جنگ ہے اور اسی پر اس کے مقصد کا فیصلہ موقوف ہے۔
پس اس طریقِ عمل نے اس سوال کو بالکل غیر ضروری کردیا ہے کہ تمام ملک نون کواپریشن پر ایک معیّن وقت کے اندر عمل کرسکیگا یا نہیں؟ اور اگر ایک بڑی تعداد اس پر عمل کر کے

کی آزاد حکومت ہوگی یا کوئی ایسی حکومت جو فوجی طاقت کے ذریعہ منوائی گئی ہو۔

یہ غیر مسلح جدوجہد کیونکر عمل میں لائی جائے؟ تو بلاشبہ اس سوال کے جواب میں وہ ہمیں ایک ایسی بات کی طرف بلاتا ہے جو محض ضرورت اور وقت کا مسئلہ ہی نہیں ہے، بلکہ ایک مستحکم اعتقاد بھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہمیں موجودہ نظام حکومت کی شرکتِ عمل سے کنارہ کش ہو جانا چاہیے، اس لیے کہ ہمیں ایسے اقتدار کا ساتھ نہیں دینا چاہیے اور اس لیے کہ ہم کنارہ کش ہوکر اسے اس طرح گرا دے سکتے ہیں کہ وہ ہمارے مقابلہ کے ناقابل ہو جائے۔ اس کا یہ مطالبہ فرض اور ضرورت دونوں پر مشتمل ہے۔ وہ مذہب، اخلاق، تجربہ اور تاریخ سب کی متفقہ صداقت ہے۔ ہمیں اس ناانصافی کے لیے آلۂ عمل نہیں بننا چاہیے جو ہمارے ساتھ کی جا رہی ہے۔ اس اعتقاد سے کس انسان کو انکار ہو سکتا ہے! تجربہ اور تاریخ کی قطعی شہادت ہے کہ دنیا میں کسی قوم نے کسی اجنبی اقتدار سے کوآپریشن کرکے اپنی آزادی حاصل نہیں کی ہے، اور نہ کسی کو یہ متاع بطور عطیہ کے ملی ہے۔ یہ حاکمانہ اقتدار کی فطرت ہی کے خلاف ہے، اس سے بھی کون انکار کر سکتا ہے؟

شرکتِ عمل کی یہ علیحدگی اگر یک وقت پوری طرح عمل میں آجائے، تو کسی عقل کو بھی اس میں شک نہیں ہو سکتا کہ سورج کے ایک طلوع و غروب کے اندر ہندستان کی تاریخ پلٹ جا سکتی ہے۔ لیکن کیونکر عمل میں آئے۔ اس آسانی کی ساری دشواری اسی سوال میں پنہاں ہے۔ اس جنگ میں، جو جنگ ہونے کے ساتھ بھی جنگ نہیں ہے، اگر جنگ کی سی کوئی تیاری ہے تو یہی ہے۔

میں دشواریوں کی تفصیل میں نہ جاؤنگا لیکن مجھے یہ کہنا ہے کہ انھی دشواریوں کا لحاظ رکھ کر اس نے ایسا طریقِ کار اختیار کیا ہے جو تمام دشواریوں کو حل کر دیتا ہے۔ وہ اپنی کامیابی کے لیے کسی ایسے وقت کا انتظار بالکل ضروری نہیں سمجھتا۔ جب ملک کے تمام کوآپریٹر نون کوآپریٹر ہو جائیں، یا ایک بڑی اکثریت اس کے پروگرام پر عمل کرلے۔ بلکہ اس نے ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جس کے لیے صرف ایک خاص مقدار کا عمل کفایت کرتا ہے۔ اگر اتنی مقدار مہیا ہو جائے

اگر پہلے مقابلہ میں وہ نتیجہ حاصل نہ کرسکی تو کوئی مضائقہ نہیں۔ وہ اس سے ذرا بھی ہراساں نہ ہوگی کہ اب سپاہی اپنے بستروں پر واپس جاچکے ہیں۔ وہ اپنا کام جاری رکھے گی اور اس وقفہ کو اس طرح خرچ کریگی۔ تاکہ جلد از جلد دوسرے مقابلہ کے لیے فضا مہیّا ہوجائے۔ پھر جب ایسی فضا پیدا ہوجائیگی، وہ مقابلہ کا اعلان کردیگی۔ اور اس کو یقین ہے کہ وہ سب جو بستروں پر لیٹ چکے ہیں، اچانک میدان میں کھڑے نظر آئیں گے۔

البتہ اس کا پروگرام بالطبع ایک محدود وقت کے اندر نتیجہ حاصل کرلینا چاہتا ہے۔ لمبے لمبے وقتوں کا نہیں ہے۔ اسی لیے اس نے اندازہ کیا تھا کہ پہلے مقابلہ کا نتیجہ سال بھر کے اندر نکل آنا چاہیے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس ترتیبِ عمل کے واضح ہوجانے کے بعد اب اس سوال کا جواب خود بخود مل جاتا ہے، جو موجودہ مباحثہ نے پیدا کردیا ہے۔ سوال کے دونوں پہلو اصلیت سے منحرف ہیں۔ نہ تو یہ پروگرام کوئی ایسا پروگرام تھا، جو صرف ایک مرتبہ عمل میں لاکر ترک کردیا جائے اور نہ یہ صحیح ہے کہ نتائج اور حالات سے بالکل آنکھیں بند کرکے محض ایک اخلاقی اصول کی طرح اس کا وعظ کرتے رہنا چاہیے۔ اس کا نصف حصّہ خود جنگ نہیں ہے بلکہ جنگ کے لیے سپاہیوں کی طلب ہے۔ اور وہ ہمیں اس طرح بار بار کام دیگا، جس طرح بار بار ہم فیصلہ کن معرکے گرم کرینگے۔ بقیہ نصف اصل جنگ کا میدان مہیا کرنا ہے اور اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ ایک ہی مرتبہ فیصلہ کن ہو۔

## نون کوآپریشن کی ذہنیّت (مینٹلٹی)

یہاں سے یہ بات بھی ضمناً واضح ہوگئی کہ نون کوآپریشن کی ذہنیّت کی نسبت جو غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں، وہ کس قدر دُور از کار ہیں! کہا گیا ہے کہ وہ مغربی تہذیب و علوم کے برخلاف ایک چیلنج ہے۔ وہ سیاسی جدوجہد کی جگہ ایک نئے مذہب اور اخلاق کا وعظ ہے۔ وہ ترکِ دنیا اور

عدالتوں اور کالجوں سے نکل بھی آئی، تو ہم اسے اپنی جاری جنگ کے ہر وقت میں یکساں استقامت کے ساتھ اپنے ساتھ رکھ سکینگے یا نہیں؟ اگر تمام ملک عمل نہیں کر سکتا، تو نہ کرے۔ اگر بہت سے لوگ اس پر عمل کر کے قائم نہیں رہ سکتے، تو کچھ مضائقہ نہیں۔ نون کواپریشن کو اس پر افسوس ہوگا، مگر ہراس نہ ہوگا۔ بلاشبہہ وہ بطور ایک اعتقاد اور فرض کے سب کو بلاتا ہے۔ لیکن بطور ایک جد و جہد کے پروگرام کے وہ کسی ایسی مکمل اور یکساں حالت کا بالکل محتاج نہیں ہے۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہے کہ جماعت کے اعمال عقل و استدلال کے تابع نہیں ہیں، تمامتر جذبات کی مخلوق ہیں۔ جماعت یا تو دوڑتی ہے، یا بیٹھ جاتی ہے، لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ یکساں رفتار سے چلتی رہے۔ پس یہ ناگزیر ہے کہ اُتار چڑھاؤ ہوتے رہیں۔ جب کبھی ایک خاص طرح کی فضا پیدا ہو جائیگی، ایک اشارے پر ہزاروں قدم دوڑتے آئینگے۔ پھر جب وہ بدلیگی، تو بار بار کے بلاوے پر بھی ایک قدم جنبش نہ کریگا۔

ایک فضا کیوں کر پیدا ہو سکتی ہے؟ صرف جنگ سے۔ اس کی جنگ سول ڈس اوبیڈئینس ہے۔ پس اگر وہ کسی بات کے لیے فکر مند ہے، تو وہ صرف اس کی پہلی اور مرکزی فوج ہے۔ اس کے میدان کی فتح و شکست کا دار و مدار اس کی اخلاقی فتح و شکست پر ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ یہ پہلی فوج خواہ کتنی ہی کم تعداد میں ہو، لیکن اپنے اندر کمیت کی نہیں، بلکہ کیفیت کی طاقت پیدا کرلے۔ وہ نون کواپریشن کا اپنے آپ کو مجسّم عملی نمونہ بنالے۔ پہاڑ کی طرح اٹل اور سمندر کی طرح لبریز ہو جائے۔ وہ قربانیوں پر قربانیاں کرتی جائے اور عملی نمونہ کی کشش اور گیرائی سے ملک کی غفلت اور اعراض کو شکست دے دے۔ اس کو یقین ہے کہ اگر ایسی جماعت ملک میں قائم ہو گئی، اور اس نے اپنی جنگ جاری رکھی، تو یہ اس طرح کی کش مکش کے نفسیات کا قانون ہے کہ بہت جلد جنگ کے معرکوں کا موقع حاصل ہو جائیگا۔ اور جونہی ایسے معرکوں کی فضا پیدا ہوئی، پھر خود بخود ہزاروں لاکھوں قدم اس کی طرف بن بلائے دوڑینگے، اس کے لیے سپاہیوں کی کمی نہیں رہیگی۔

حالات نے جلد تصادم کی فضا بھی مہیّا کر دی اور مقابلہ شروع ہو گیا۔ یہ دسمبر ۱۹۲۱ء کی بات ہے اب نہ صرف ہمارے لیے بلکہ دنیا کے لیے یہ سوال نہایت اہم ہے کہ یہ پروگرام کہاں تک کامیاب ہوا؟ لیکن کامیابی کی جانچ کا ٹھیک معیار کیا ہے؟ دو چیزیں ہیں۔ دونوں کی کامیابی کا ایک معیار نہیں ہو سکتا۔ ایک نون کوآپریشن کا دستور العمل ہے۔ ایک ہماری وہ جدوجہد ہے جو اس پر عمل پیرا ہو کر ہم نے حاصل کی ہے۔ اگر ہم اپنی جدوجہد میں آخری مقصد حاصل نہ کر سکے، تو ضروری نہیں ہے کہ اس کی ذمہ داری دستور العمل کے سر عائد ہو۔ بحیثیت ایک عملی پروگرام کے اس کی کامیابی یہ ہے کہ تجربہ سے اس کے قابلِ عمل، مؤثر اور نتیجہ خیز ہونے کی شہادت مل جائے اگر ایسی شہادت مل جائے، تو پھر اس کی کامیابی کے لیے کوئی بات نہیں رہ جاتی؛ اگرچہ ہمارے لیے کامیاب ہونا باقی رہ جاتا ہے۔

باقی رہی ہماری جدوجہد کی کامیابی، تو مجھے اس سے بھی انکار ہے کہ اس کے لیے آخری مقصود کا پالینا معیار ہو سکتا ہے۔ آخری مقصود کا پالینا صرف کامیابی ہی نہیں ہے، بلکہ آخری کامیابی ہے، اور ضروری ہے کہ اس سے پہلے متعدد کامیابیاں حاصل کر لی جائیں۔ ہمیں دیکھنا یہ چاہیے کہ وہ کامیابیاں ہم حاصل کر سکتے ہیں یا نہیں؟

## تجربہ کی کامیابی:

حضرات!

میں بلا کسی تامّل کے یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ میرے یقین میں پروگرام کامیاب ہوا بلکہ اس نے وہ زیادہ سے زیادہ کامیابی حاصل کی ہے جو کسی ایسے پروگرام کے لیے ہو سکتی ہے۔ اگر اب سے تین برس پہلے وہ ایک اصول تھا، جس کی کامیابی استدلال سے واضح تھی، تو اب ایک تجربہ میں آیا ہوا یقین ہے جس کی کامیابی مشاہدہ نے ثابت کر دی ہے۔

ایک منٹ کے لیے ان تمام رکاوٹوں اور دشواریوں کو اپنے سامنے لائیے جو اس کی راہ میں

رہبانیت کی تعلیم دے کر دنیا میں تقدم کی جگہ واپسی کی خواہش پیدا کرنا چاہتا ہے۔ لیکن میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ یہ ہمارے خیالات کی ایسی تعبیر ہے، جسے ہم تسلیم نہیں کرتے۔ دراصل تمدن، تعلیم اور معیشت کے سوالوں سے اسے براہِ راست کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ بلاشبہہ ہندستان میں مغربی تہذیب و تمدن کے محاسن اور نقائص کی نسبت مختلف قسم کی رائیں موجود ہیں۔ خود یورپ اور امریکہ کا ذہنی سکون جنبش میں آچکا ہے۔ اور نئے نئے اصولوں اور خیالات کے سیلاب امنڈ آئے ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ٹالسٹائی کی طرح خود مہاتما گاندھی کے بھی اس بارے میں خاص خیالات ہیں، لیکن نون کوآپریشن اپنے مقصد کے سوا اور کوئی رائے نہیں رکھتا۔ وہ اپنے پیروؤں کو نہ تو کوئی مذہبی اعتقاد سکھاتا ہے، نہ ترکِ دنیا اور زہد و عبادت کی ایک نئی خانقاہ تعمیر کرنی چاہتا ہے۔ وہ ہر طرح ایک سیاسی دستور العمل ہے، جس کی بنیاد حقیقت اور سچائی پر ہے۔ اس لیے مذہب، اخلاق، تاریخ سب کی نگاہیں یکساں طور پر اسے پہچانتی ہیں اور اپنی اپنی زبان میں پکارتی ہیں۔ اگر وہ کہتا ہے کہ سرکاری تعلیم گاہیں اور قانون کی پریکٹس چھوڑ دو، تو اسے لیے نہیں کہ وہ یورپین علوم اور قانون کی پریکٹس کا مخالف ہے۔ بلکہ صرف اس لیے کہ وہ اس اقتدار کا مخالف ہے، جس کے ماتحت وہاں رہنا اور اس کی اعانت کا ذریعہ بننا پڑتا ہے۔ اگر وہ کہتا ہے کہ کھدر پہن لو، تو یہ اس لیے نہیں ہے کہ وہ قیمتی لباس یا کسی خاص وضع قطع کا مخالف ہے، بلکہ صرف اس لیے کہ وہ غیر ملکی لباس پر ملکی لباس کو ترجیح دیتا ہے، اور نیز اس لیے کہ اسے یقین ہے کہ ملک کو اپنی آزادی اور نجات کے لیے طرزِ معیشت کی سادگی اور ضبطِ نفس کی اخلاقی روح کی ضرورت ہے۔

## پہلا تجربہ :

آئیے اب غور کریں۔ ہماری موجودہ حالت کیا ہے؟ ہم نے پروگرام کے پہلے حصے کے مطابق لوگوں کو بلایا۔ وہ آئے اور ایک پہلی اور مرکزی جماعت تیار ہوگئی، پھر اس کے دوسرے حصے کے مطابق

ایسی طاقت پیدا کر سکتا ہے جو دفتری اقتدار کے لیے ناقابلِ تسخیر ہوگی۔ پھر کیا یہ تمام نتائج اس کا قطعی ثبوت نہیں ہیں؟

## پہلا معرکہ:

اگر سوال کیا جائے کہ ہماری جدوجہد میدانِ جنگ میں کہاں تک کامیابی حاصل کر سکی؟ تو اس کے جواب کے لیے ہمیں دسمبر ۱۹۲۱ء کے واقعات پر نظر ڈالنی چاہیے۔ جب دفتری اقتدار نے کریمنل لا امنڈمنٹ ایکٹ[۳۴] نافذ کر کے ڈیفنس سول ڈس ادٹیڈ مینس[۳۵] کی راہ صاف کر دی تھی۔

فی الحقیقت یہی جدوجہد کا اصلی معرکہ تھا۔ میں اس کی تاریخ کا یہ واقعہ یہاں ثبت کرتا ہوں کہ ۲ دسمبر کو مقابلہ شروع ہوا اور ابھی دو ہفتے پورے نہیں گذرے تھے کہ دفتری اقتدار پر شکست کے آثار طاری ہوگئے، حتیٰ کہ اسے مجبوراً جدوجہد کی طاقت کا کھلا اعتراف کرنا پڑا۔ اور اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ التوائے جنگ یا صلح کے لیے آمادہ ہو جائے۔ چنانچہ وہ بالکل تیار تھا کہ جدوجہد سے ایک مقابل حریف کی طرح معاملت کرے، دونوں میں سے کسی فریق کے ہار جیت کا سوال نہ ہو، دونوں عارضی طور پر اپنی اپنی کارروائیوں کو ملتوی کر دیں، گورنمنٹ کریمنل لا امنڈمنٹ ایکٹ کا نفاذ اٹھالے اور قیدیوں کو رہا کر دے۔ کانگریس پرنس آف ویلز کے ورود کا مقاطعہ ملتوی کر دے۔ اس کے بعد راؤنڈ ٹیبل کانفرنس منعقد ہو اور وہ جدوجہد کے مطالبات پر غور کرے۔ ہز ایکسیلنسی وائسرائے نے ۱۲ دسمبر کو کلکتہ میں ایک وفد کا جواب دیتے ہوئے انہی شرائط پر زور دیا تھا اور بار بار طلب وتمنا اور صلح وصفائی کے لیے ایسے لب ولہجہ میں جس کا دفتری اقتدار کبھی عادی نہیں ہوا، اپنی انتہائی خواہش ظاہر کی تھی کہ التوا اور صلح کی صورت نکل آئے۔

میں نے اس واقعہ کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ میں اسے جدوجہد کی کوئی بہت بڑی فتحمندی سمجھتا ہوں۔ ہمارا مقصد بلند ہے اور ضروری ہے کہ اسی مناسبت سے ہماری کامیابی کا معیار

حائل تھیں اس تھوڑے سے وقت کا بھی خیال کیجیے جو اس کو تعلیم تیاری اور عمل تینوں منزلیں طے کرنے کے لیے ملا۔ اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کیجیے کہ راہِ آزادی میں یہ ملک کا پہلا عملی قدم تھا۔ پھر دیکھیے کہ کیسے حیرت انگیز نتائج کا کیسا عظیم سلسلہ آپ کے سامنے موجود ہے؟ کیونکر ممکن ہے کہ ہم اس کی ناکامی کا خیال بھی کر سکیں؟ اس کی کونسی بات ہے جس پر عمل نہ ہوسکا اور کونسا عمل ہے جس نے کامیاب اثر نہیں دکھایا؟ کیا بیشمار آدمیوں نے سرکاری انسٹی ٹیوشنوں[۳۳] کو نہیں چھوڑا؟ کیا وہ ان تمام دنیوی فائدوں اور راحتوں سے دست بردار نہیں ہوگئے، جو انھیں حاصل ہو رہی تھیں؟ کیا تمام ملک میں ایثار اور قربانی کا عام ولولہ نہیں پیدا ہوگیا؟ کیا ہزاروں آدمی خوشی خوشی جیل خانوں میں نہیں چلے گئے؟ کیا حکومت کا پورا مسلح نظام اس سے عاجز نہیں آگیا کہ پرنس آف ویلز کے وردد کے موقع پر ہڑتال کی ایک دوکان کا تختہ بھی نہ کھلوا سکے؟ کیا ۱۹۲۱ء کی ہر صبح اور شام نے اس کی شہادت نہیں دے دی، کہ ہندستان میں بھی قوم کی مرضی ہے، اور وہ میدان میں نمایاں ہوسکتی اور مقابلہ کے لیے کھڑی ہوسکتی ہے۔

قوموں کا انقلاب پہلے سطح پر نہیں، بلکہ دل و دماغ کی گہرائیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ اس نے بارہ مہینے کے اندر ہندستان کا دماغ پلٹ دیا۔ قوم کے تمام طبقوں اور جماعتوں کی استعداد دفعتہً بلند کردی۔ برِّاعظم کے ایک ایک فرد تک آزادی اور وطن پرستی کا پیغام پہنچادیا۔ ہزاروں انسانوں کی زندگیوں پر انقلاب طاری کردیے۔ راہِ آزادی کی سزاؤں اور تکلیفوں کا خوف ملک کے دل سے اس طرح نکال دیا کہ قید ہونا کھیل اور سزا دینے والی عدالتیں تماشا گاہ بن گئیں۔ غرضکہ آزادی کی جدو جہد کی کوئی بات ایسی نہیں ہے جس کا دروازہ اس نے ملک پر نہ کھول دیا ہو۔ اگر یہ تمام باتیں کل تک کے واقعات ہیں، تو پھر اس بات کے لیے اور کیا چاہیے کہ پروگرام صحیح ہے، عملی ہے، اور اپنی تاثیر میں بے خطا ہے۔ نون کواپریشن نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ وہ قدیم روایتوں کے معجزے دکھلائیگا۔ اس کا عاجزانہ اعلان یہ تھا کہ اس پر چل کر ملک بلا اسلحہ کے

رائے ظاہر کرتا۔ آج یہ پہلا ہے کہ اس بارے میں زبان کھولتا ہوں۔ اس اختلاف نے جو دو جماعتیں قائم کردی ہیں، ان دونوں میں میرے ایسے محترم احباب موجود ہیں جن کی قابلیت اور خدمت کی میرے دل میں ویسی ہی عزت ہے جیسی ہر باشندۂ ہند کے دل میں ہونی چاہیے۔ تاہم یہ بات اس سے مانع نہیں ہو سکتی۔ کہ میں اپنے خیالات صاف صاف عرض کردوں کیونکہ اگر میں ایسا نہ کروں تو علاوہ ادائے فرض کی کوتاہی کے یہ اُس اعتماد کا بھی صحیح استعمال نہ ہوگا، جو آج آپ نے مجھ پر ظاہر فرمایا ہے۔

سب سے پہلی بات جو اس اختلاف کی نسبت میں عرض کرونگا، وہ یہ ہے کہ اوّل روز سے جس قدر اہمیت اس مسئلہ کو فریقین کی جانب سے دی گئی ہے، مجھے کلیتہً اس سے اختلاف ہے۔ میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ دراصل ہماری تمام موجودہ مشکلات کی اصل بنیاد اسی غلطی میں پنہاں ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ جب کبھی کوئی اختلاف رائے پیدا ہو، ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ ہم دیکھیں یہ اصول کا اختلاف ہے یا فرع کا؛ اس کا اثر کسی جڑ پر پڑتا ہے یا محض شاخ پر۔ اگر وہ اختلاف اصول کا اختلاف ہے تو بلا شبہہ ہمارا فرض ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ ثبات و استقامت اس میں ظاہر کریں؛ نرمی اور درگزری کی اس میں کوئی گنجایش نہیں ہو سکتی۔ کثرت و قلت رائے کا سوال اس کے لیے خارج از بحث ہے۔ ڈسپلن[۲۶] کا سوال بھی اس پر موثر نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر وہ محض ایک شاخ کا اختلاف ہے تو پھر صورت حال بالکل بدل جاتی ہے۔ یہاں بھی ہمیں اپنی رائے میں کمزور ہونے کی کوئی وجہ نہیں لیکن عمل میں اتنا سخت نہ ہونا چاہیے کہ کسی طرح کی لچک قبول نہ کریں۔ ضرورت ہوگی تو ہم اس سے قطع نظر بھی کرلیں گے، کوئی بڑی مصلحت سامنے آجائیگی تو اس چھوٹی چیز کو اس پر قربان بھی کردیں گے۔ جماعت کا ساتھ، حجارٹی[۲۷] کا اتباع، نظام کا ڈسپلن، سب اس سے اوپر رہینگے، اس کے لیے چھوڑ نہیں دیے جائینگے۔ عزم اور ثبات یقیناً انسان کے لیے

بھی بلند ہو۔ یہ بات ہمارے لیے بڑی چیز نہیں ہے کہ ہم سے صلح کی ایک ایسی خواہش پیدا ہوئی، جس کے ساتھ کوئی وعدہ نہ تھا۔ البتہ میں اسے جدوجہد کی ابتدائی کامیابی ضرور یقین کرتا ہوں اس نے دکھا دیا کہ ہمارا طریق عمل کس قدر زود اثر اور بے خطا ہے اور کس طرح وہ دو ہفتہ کے اندر اغماض اور گھمنڈ کی جگہ اعتراف اور طلب کی تبدیلی پیدا کر دینے کی قدرت رکھتا ہے۔

## انقلابِ حال اور جدوجہد کے لیے وقفہ:

حضرات!

ہر قومی جدوجہد کی تاریخ میں جہاں اس کی بہت سی باتیں یادگار ہوتی ہیں، وہیں چند غلطیوں کا بھی ذکر ضرور ملتا ہے۔ ان غلطیوں کا ہونا گویا اس طرح کی حالت کی ایک قدرتی بات ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ باردولی کا فیصلہ ہماری جدوجہد کے لیے ایک ایسی ہی غلطی تھی۔ ہم اس پر اپنے تاسف کو تو نہیں روک سکتے، لیکن ہم اسے اس طرح محسوس کرتے ہیں۔ گویا ایک ہونے والی بات تھی۔ اس سے ہم کسی طرح بچ نہیں سکتے تھے۔ دراصل باردولی کے فیصلہ پر ہماری جدوجہد کا پہلا فیصلہ کن معرکہ ختم ہو گیا اور اس وقت سے ہم ایک ایسے وقفۂ جنگ کی حالت میں ہیں جس میں جنگ تو قائم ہے لیکن مقابلہ کے لیے وقفہ پیدا ہو گیا ہے۔

## کونسل کا اختلاف:

حضرات!

گذشتہ جنوری میں جب میں جیل سے رہا ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ میرے لیے سب سے زیادہ ضروری خدمت یہ ہے کہ اس اختلاف کے دور کرنے کی کوشش کروں۔ چونکہ اس کے لیے ضروری تھا کہ میں اپنے ذاتی خیالات ظاہر کر کے کوئی خاص جانب اختیار کرنے سے پرہیز کروں، اس لیے مجھے اس وقت تک کوئی موقع نہیں ملا کہ اصلی مسئلہ کی نسبت اپنی ناچیز

تبدیلی سے ہمیں انکار ہوگا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم جنگ سے انکار کردیں۔

لیکن افسوس ہے کہ اس اختلاف نے ایسی اہمیت فریقین میں حاصل کرلی گویا یہ ایک اصولی اختلاف ہے اور دونوں طرف سے اس پر اس قدر قوت خرچ کی گئی گویا قومی جدوجہد کا جینا مرنا اسی پر موقوف ہے۔ ایک طرف سے کہا گیا کہ یہ خود نون کواپریشن کا اختلاف ہے، حالانکہ اگر نون کواپریشن کا اصول اس قدر تنگ مان لیا جائے تو پھر میں نہایت ادب سے عرض کرونگا کہ دنیا میں نون کواپریشن کا کوئی عمل چند دنوں سے زیادہ نہیں جی سکتا۔ دوسری طرف سے اس بات پر اس قدر زور دیا گیا کہ اس کی وجہ سے کانگریس کی متحدہ قوت کا تفرقہ گوارا کرلیا جائے، حالانکہ اگر اس طرح کے جُزوی اختلاف کی بنا پر تفریق اور جماعت بندی درست کرلی جائے تو مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑیگا کہ دنیا میں کوئی نظام قائم نہیں رہ سکتا۔

بہر حال جو اہمیت اس معاملہ کو دی گئی، مجھے اس سے اختلاف ہے یہ مسئلہ ہرگز ایسا نہ تھا جس کی خاطر ہم اپنا اتحاد، اپنی سرگرمی، اور اپنا وہ سب کچھ جو ہم نے حاصل کیا ہے، خطرہ میں ڈال دیں۔ میں وثوق کے ساتھ یہ رائے رکھتا ہوں کہ گیا کانگریس میں آپ نے خواہ یہ فیصلہ کیا ہوتا، لیکن اگر آپ متفق رہتے تو آج ان مشکلات کا نام ونشان بھی نہ ہوتا، جن کی وجہ سے جدوجہد کا ایسا قیمتی برس جیسا کہ ۱۹۲۳ء ہے، بالکل ضائع ہوگیا۔

ہندو مسلم اتحاد کے فتور کا بھی اصلی باعث کیا ہے؟ میں عرض کرونگا، صرف آپ کا یہ اختلاف اور اختلاف کی وجہ سے ملک کی بیکاری لوگوں کے لیے جب وہ اصلی کام باقی نہ رہا، جس میں سب کے دل اٹک گئے تھے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ آپس میں ٹکرانے لگیں۔ آپ جب کہ طریق عمل کی ایک خاص صورت کے لیے اس قدر طاقت خرچ کررہے ہیں تو ایک لمحہ کے لیے اس حقیقت کو بھی یاد کرلیجیے کہ کامیابی کا دارو مدار محض ہتھیاروں اور راستوں کی نوعیت پر نہیں ہے، بلکہ خود فوج کی طاقت پر ہے۔ یہ بات کہ ہتھیار کیسے ہوں؟ ایک دوسرے درجہ کا سوال ہے۔ اصلی سوال یہ ہے کہ سپاہی کیسے ہوں؟ اور ان کی اخلاقی حالت کیسی ہو؟ ہتھیار کے لیے صرف اتنا

اول درجہ کے اوصاف ہیں، مگر اسی حال میں جب کہ اپنے صحیح محل پر خرچ کیے جائیں اور صحیح تعداد میں خرچ کیے جائیں۔ میں بلا کسی تامل کے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس مسئلہ کا اختلاف نون کواپریشن کے لیے قطعاً کوئی اختلاف نہ تھا۔ نون کواپریشن بحیثیت ایک اصول کے کیا ہے؟ میں یقین کرتا ہوں کہ کوئی شخص اس کے جواب میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ پروگرام کی دفعات ہیں، جن میں کالج، عدالت اور کونسلوں کے نام ہمیں ملتے ہیں۔ یقیناً وہ سرکاری کالجوں کو چھوڑ دینے، یا کونسلوں کے ووٹروں کو ووٹ دینے سے روکنے ہی کا نام نہیں ہے۔ وہ ان سب سے بالاتر کوئی چیز ہے اور وہی نون کواپریشن ہے۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ یہ اختلاف نون کواپریشن میں نہ تھا۔ اس بارے میں تھا کہ ہمیں کونسلوں میں اشتراکِ عمل کے لیے جانا چاہیے یا نہیں؟ صرف یہ تھا کہ ہمیں اصلاحی کونسلوں کے دوسرے انتخاب کے موقع پر بھی وہی طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے جو پچھلی دفعہ اختیار کیا تھا یا اس میں تبدیلی کرنی چاہیے؟ میں بالکل یہ سمجھنے سے عاجز ہوں کہ نون کواپریشن کی مضبوط سے مضبوط پابندی کے ساتھ کیوں اس بارے میں دو رائیوں کی گنجائش نہیں ہے؟ یہ تو صرف پروگرام کی تبدیلی و عدم تبدیلی کا سوال بھی نون کواپریشن کے لیے ایک اصولی سوال سمجھا جائے۔ نون کواپریشن کی اصل صرف یہ ہے کہ ہم موجودہ دفتری اقتدار سے اشتراکِ عمل نہیں کر سکتے۔ پس، جب ایک شخص نے اس سے اتفاق کیا تو وہ نون کواپریٹر ہے۔ اب رہی یہ بات کہ کس طرح یہ بات بطور ایک قومی حرکت کے عمل میں لائی جائے؟ تو اس کے لیے جو کچھ بھی ہم طے کریں گے، وہ ضرور واجب العمل ہے لیکن بہرحال اصل نہیں ہے، فرع ہے، مقصود نہیں ہے، وسیلہ ہے اور اگر اس میں اختلاف رائے ہو، تو وہ کبھی اس اہمیت کا مستحق نہیں ہو سکتا، جو اصولی اختلاف کو دی جا سکتی ہے۔

آزادی ہمارا مقصد ہے۔ عدم تشدّد اور نون کواپریشن ہمارا اصول ہے اور حصولِ مقصد کے لیے ہم نے ایک پروگرام اختیار کیا ہے جس کی ہر دفعہ ایک وسیلہ ہے، مقصد ہے۔ ہم اعتقاد نہیں بدل سکتے۔ ہم اصول نہیں ترک کر سکتے لیکن ہم وسائل میں ہر آن اور ہر لمحہ تبدیلی کر سکتے ہیں۔ اگر اس

اور بجائے اس کے کہ اپنے ذہن و دماغ سے کام لے محض ایک شخص کا قول اس کے لیے حق و باطل اور صحیح و غلط کا معیار بن جاتا ہے۔ مذہب اور علم دونوں کے راستہ میں اس طرح کی تقلید انسانی ترقی و سعادت کے لیے سب سے بڑی روک ثابت ہوئی ہے! اور ہمیں کبھی نہیں چاہیے کہ سیاست کو بھی اس سے آشنا کریں، برخلاف اس کے اطاعت سے مقصود ایسی پیروی ہے جو ایک سپاہی اپنے کمانڈر کی کرتا ہے۔ جس طرح تقلید ہر طرح کی ترقی و کامیابی کے لیے روک ہے، اسی طرح اطاعت ہر جماعتی عمل کے لیے پہلی شرط ہے۔ ممکن ہے کہ کمانڈر نے حکم دینے میں غلطی کی ہو لیکن سپاہی اس کے خلاف رائے رکھ سکتا ہے مگر اس کے خلاف قدم نہیں اٹھا سکتا۔ اگر ہمارے کمانڈر کا حکم غلط بھی ہو جب بھی ہمیں چاہیے کہ سباسٹوپول کی اس انگریز رجمنٹ کی طرح جس کی بربادی کا مرثیہ ٹینی سن نے لکھا ہے کٹ جائیں لیکن اطاعت سے باہر نہ ہوں۔ ایک حکم کی غلطی کا جھیل لینا اس سے بہتر ہے کہ پوری فوج کا ڈسپلن غارت جائے۔

آج انڈین نیشنل کانگریس ہماری تنہا حکمراں جماعت ہے۔ ہم جنگ کی سی حالت میں ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ خواہ کانگریس کا فیصلہ ہو یا ہمارے بڑے سے بڑے لیڈر کی رائے، ہمیں ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی کورانہ تقلید نہیں کرنی چاہیے لیکن ساتھ ہی ہمیں اطاعت سے باہر بھی نہ ہونا چاہیے۔ جو جماعت تبدیلی کی مخالف ہے وہ اس میں احتیاط نہیں کرتی کہ کہیں تقلید و جمود کی طرف قدم نہ بڑھ جائیں اور جو جماعت تبدیلی پر مصر ہے وہ اس بات پر توجہ نہیں کرتی کہ ایک جزوی اختلاف کی وجہ سے ہمیں اپنے نظام کے ڈسپلن سے باہر نہ ہونا چاہیے۔

# ہمارا آیندہ پروگرام

حضرات!

مجھے اب اجازت دیجیے کہ میں موجودہ حالات اور آیندہ طریقِ عمل کی نسبت اپنے خیالات آپ کی

دیکھ لینا بس کرتا ہے کہ کاٹ رکھتا ہو۔ اگر وہ بہتر قسم کا نہیں ہے تو مضائقہ نہیں۔ فوج میں ایکا اور مضبوطی ہونی چاہیے۔ ایک متحدہ فوج خراب ہتھیاروں کے ساتھ بھی کامیاب ہو سکتی ہے لیکن اچھے سے اچھے ہتھیار بھی منتشر اور بے دل سپاہیوں کو جیت نہیں دلا سکتے۔ ہم سب ایک برس سے صرف اتنی بات پر لڑ رہے ہیں کہ ہتھیار کیسا ہو؟ لیکن اس کی کچھ پروا نہیں کرتے کہ آج فوج کا کیا حال ہو رہا ہے۔ اگر فوج ہی منتشر ہو گئی، تو پھر آپ کو اچھی سے اچھی بندوق بھی کیا کام دیگی؟ مان لیجیے کہ کونسلوں کا بائیکاٹ ہی سب سے بڑا کام ہے، یا کونسلوں پر قبضہ کر لینے میں دنیا جہان کی فتح ہے۔ تاہم جب آپ کی متحدہ طاقت نہ رہی، آپ کا نظام الٹ گیا، کسی قومی مرکز کا ڈسپلن قائم نہ رہا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہندو مسلم اتحاد میں رخنے پڑ گئے تو فرمائیے؟ آپ بائیکاٹ کیونکر کرینگے؟ کونسلوں کی نشستوں پر کیونکر قابو پائیں گے۔

# افراط و تفریط

حضرات!

ہمارے سامنے محافظت کی اصلی چیز جزئیات نہیں ہیں، اصول ہیں۔ پس یہ کسی طرح صحیح طرزِ عمل نہ ہوگا کہ ہم کسی جزوی مسئلہ کے جوش میں اس قدر دور چلے جائیں کہ اس کی وجہ سے نئے نئے اصولوں کے قائم ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو جائے اور وہ آگے چل کر ہمارے لیے اصولی مشکلات پیدا کر دیں۔ اس اختلاف نے جب دو جماعتیں قائم کر کے فریقانہ بحث و نزاع کی شکل اختیار کر لی تو یہ ناگزیر تھا کہ افراط و تفریط کی طرف میلان پیدا ہو۔ لیکن ہمارا فرض ہے کہ ہم اس سے اپنے دل و دماغ کی نگہبانی کریں۔ ہمیں کبھی کورانہ تقلید کی دعوت نہیں دینی چاہیے، لیکن ہمیں ہمیشہ اطاعت (ڈسپلن) میں مضبوط رہنا چاہیے۔ تقلید سے مقصود ایسی دماغی حالت ہے جب کہ انسان کسی بڑے آدمی کی پیروی کرتا ہوا حدِ اعتدال سے گزر جاتا ہے

پس یہ ضروری ہے کہ اُس سے غلطیوں پر غلطیاں ہوں اور ضروری ہے کہ قومی جدوجہد نئی نئی طاقتیں اور مہلتیں حاصل کرے۔ ہمیں یقین کرنا چاہیے کہ اگر ہم نے اپنی تیاریاں قائم رکھیں تو تھوڑے ہی عرصہ کے اندر ایسی فضا پھر پیدا ہو جائیگی کہ ہم اپنا دوسرا فیصلہ کُن معرکہ شروع کر سکینگے۔ جونہی معرکہ شروع ہوگا پھر از سرِ نو سپاہیوں کے لیے کشش پیدا ہو جائیگی۔ ہم دیکھ لینگے کہ بستر خالی ہو گئے ہیں اور میدان پھر سے بھر رہا ہے۔

## کونسلوں کا مقابلہ

لیکن یہ وقفہ کیونکر اس طرح بسر کیا جائے کہ جلد سے جلد مقابلہ کے لیے مناسب فضا مہیّا ہو جائے؟ اور ساتھ ہی ہماری موجودہ مشغولیّت کے لیے بھی مفید ہو؟ اس وقفہ کے لیے یہ بہتر ہوگا کہ ہم موجودہ انتخاب کا بائیکاٹ کریں۔ یا یہ کہ جہاں کہیں اکثریت کے ساتھ کونسلوں میں جا سکتے ہیں، جائیں، اور انھیں بھی نون کواپریشن کی سرگرمیوں کا ایک عارضی گوشہ بنا لیں۔

حضرات!

حالات کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں جو رائے قائم کر سکا ہوں، وہ یہ ہے کہ موجودہ حالت میں ہمارے لیے باہر رہ کر بائیکاٹ کرنا کچھ بہتر نہیں ہو سکتا جس طرح گزشتہ انتخاب کے موقعہ پر ہمارے لیے بائیکاٹ ضروری تھا، اسی طرح آج ہمارے لیے یہ مفید ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، ہم نشستوں پر قبضہ کر لیں۔ اور کونسلوں اور اسمبلیوں میں جائیں اور ایسا طرزِ عمل اختیار کریں کہ یہ مقامات بھی ہماری جدوجہد کا ایک گوشہ بن جائیں۔

میری ناچیز رائے میں ہمارا آئندہ طرزِ عمل یہ ہونا چاہیے کہ ایک طرف ہماری ایک جماعت کونسلوں میں چلی جائے، دوسری طرف کونسلوں سے باہر بھی سرگرمیاں جاری رہیں۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی دونوں جگہ کی نگرانی کرے اور ایک نظام کے ماتحت دونوں جگہ کام ہو۔ یہ

خدمت میں پیش کروں۔ میرا یقین ہے کہ ہندستان کے لیے مہاتما گاندھی کی رہنمائی ایک سچی رہنمائی ہے اور اگر ہندستان آزادی اور نجات حاصل کر سکتا ہے، تو صرف ان ہی کی رہنمائی سے۔ ہندستان کے لیے آج صرف تین راہیں ہیں: یا موجودہ حالت پر قانع رہے، یا مسلح انقلاب کرے، یا قانون کو اپریشن پر عمل کرے۔ ہم موجودہ حالت پر قانع نہیں رہ سکتے۔ ہم مسلح انقلاب نہیں کر سکتے اور نہ کرنا چاہتے ہیں۔ پس ہمارے لیے صرف تیسری راہ رہ جاتی ہے اور وہ نون کواپریشن ہے۔

باقی رہا اس کا پروگرام، تو اس وقت تک کوئی بات ہمارے سامنے ایسی نہیں آئی ہے جس کی وجہ سے کسی اصولی تبدیلی کی ضرورت محسوس کرتے ہوں۔ البتہ ہمیں تسلیم کر لینا چاہیے کہ ہمارا پہلا مقابلہ ہو چکا۔ ہم اس وقت ایک وقفۂ جنگ کی حالت میں ہیں اور ہمیں آیندہ مقابلہ کے لیے تیار ہونا چاہیے۔ ہمارا فیصلہ کن مقابلہ بجز سول ڈس اوبیڈینس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم اس سول ڈس اوبیڈینس سے بالفعل قطع نظر بھی کر لیں، جب بھی ڈیفنسو سول ڈس اوبیڈینس کی طاقت پر پورا اعتماد ہے۔

البتہ اس کے لیے ایسے حالات کی ضرورت ہے، جن میں بعض تو ہماری تیاریوں سے تعلق رکھتے ہیں بعض کا تعلق تمام تر دفتری اقتدار کے طریقِ عمل سے ہے۔ ایک خاص طرح کا طریقِ عمل وہ اختیار کرے جب کہیں وہ صورت پیدا ہو سکتی ہے جو ہمیں مطلوب ہے مثلاً وہ جبر و تشدّد کے ذریعہ ہماری سرگرمیوں کو روکے، یا قوانین کا غلط استعمال کرے، جیسا کہ پچھلے موقعوں پر اس نے کیا تھا۔ بلاشبہہ یہ ایک ایسی چیز ہے جو ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ لیکن ساتھ ہی مطمئن رہنا چاہیے کہ موجودہ حالات کے قدرتی قوانین ہمارے حق میں ہیں۔ ہمیں صرف یہی معلوم نہیں ہے کہ ہم صحیح راستہ پر ہیں، بلکہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہمارا مقابل فریق گمراہ ہے۔ اور یہ ایسے مقابلہ کی طبیعت ہے کہ گمراہ حریف کو ٹھوکریں لگیں۔ ہندستان میں آج دفتری اقتدار کے افراد اور ہندستانیوں کے دماغ کا مقابلہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک غلط نظام اور صحیح مطالبہ میں مقابلہ ہے۔

۱۔ تعمیری پروگرام میں ہندو مسلم اتحاد کی تبلیغ کا کام از سرِ نو شروع کرنا چاہیے۔ تفصیلات کی طرف میں ابھی آپ کو توجہ دلاؤنگا۔

۲۔ ملک کی مزدور جماعتوں کی تنظیم جن سے غافل رہ کر ہم آیندہ کوئی کام نہیں کر سکتے۔

۳۔ عوام کی سیاسی تعلیم تحریر و تقریر کے ذریعہ سے ہم کو اپنی جدو جہد کی گذشتہ سرگرمی میں تیاری، اتحاد اور مقابلہ سب کام بیک وقت کرنا پڑے۔ لیکن موجودہ وقفہ میں ہمیں اس سے غفلت نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ قومی اتحاد، نون، کواپریشن، عدم تشدد اور سول ڈس او بیڈینس کے اصول و مقاصد عوام کے دلوں پر نقش کر دیں۔ وہ اسے محض کسی مذہبی خوش اعتقادی کی بنا پر نہیں، بلکہ خالص جذبہ حب الوطنی سے اپنا فرض سمجھیں۔

بکثرت ہندستانی زبانوں میں لٹریچر تیار کر کے تقسیم کرنا چاہیے۔ کانگریس کمیٹیوں کے ورکر اور والنٹیر[39] قصبوں اور دیہاتوں میں دورہ کریں۔ ہر جگہ جم کر اسی طرح تعلیم دیں، گویا عارضی سیاسی تعلیم گاہیں ہر طرف کھل گئیں ہیں۔ اس کام کا ایک پروگرام تین مہینے کا یا چھ مہینے کا بنا لیا جائے۔ ہم اتنے عرصہ کے اندر تمام ملک کو ایک خاص مقصد کی تعلیم دے سکتے ہیں۔ اگر حکومت کی جانب سے اس میں رکاوٹیں ڈالی گئیں، تو وہ ہمارے لیے اور زیادہ مفید ہوگا۔ عجب نہیں کہ اسی کے ذریعے سے ہماری مطلوبہ فضا پیدا ہو جائے۔

۴۔ تعمیری پروگرام کا بقیہ حصہ!

البتہ میں یہ بات بالکل صاف صاف عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ ہمارے لیے کونسلوں میں داخلہ کی صرف ایک ہی صورت صحیح ہو سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ کانگریس نہ صرف اس کی اجازت دے، بلکہ خود اس کی باگ اپنے ہاتھ میں لے۔ اگر آج آپ کا فیصلہ اس کے برخلاف ہو، تو جیسا کہ میں بہ تفصیل عرض کر چکا ہوں، پھر ہم میں سے کسی فرد یا جماعت کو بھی نہیں چاہیے کہ اس کے خلاف

بات قطعی طور پر طے کر دی جائے کہ کونسلوں میں جانا ایک مقررہ پروگرام کے ماتحت ہے، جو کانگریس قرار دے دے۔ اس پروگرام میں صاف طور پر وہ تمام باتیں موجود ہیں جو ہمارے طرزِ عمل کو شرکتِ عمل کی آلودگی سے محفوظ رکھیں۔ یہ قطعی ہے کہ وہاں جاکر کوئی زیادہ مدت تک کا کام جاری نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ہمارا مقصود کسی حال میں بھی شرکتِ عمل نہیں ہے، اگرچہ بظاہر اچھے کاموں کے لیے ہو۔ یہ بات بھی بالکل صاف کر دینی چاہیے کہ کسی چھوٹی سے چھوٹی مدت کے لیے بھی وہاں کسی عہدہ کی ذمہ داری نہیں لی جاسکتی، خواہ کسی نیت و مقصد سے ہو۔

اب رہی یہ بات کہ کونسلوں میں جاکر کیا طرزِ عمل اختیار کریں؟ تو اس کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں۔ اور بہت کچھ یہ وقت کے حالات پر موقوف ہے۔ تاہم ایک بات تو بالکل واضح اور ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی مناسب موقعہ پر نون کواپریٹر ممبروں کو کونسلوں سے باہر آنا پڑیگا اور باہر کی جماعت کے ساتھ مل کر سول ڈس اوبیڈئینس سے مقابلہ کرنا پڑیگا۔ کونسلوں کا داخلہ ہم صرف اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ اس مقابلہ کی تیاری کے لیے بمقابلہ بائیکاٹ کے، اسے بھی گوشۂ جنگ بنالینا زیادہ مفید ہے۔ اگر آج ہمیں ظنِ غالب پیدا ہوجائے کہ ہم وقفہ کی جگہ مقابلہ کی حالت میں ہیں، تو کم از کم میں ایک لمحہ کے لیے بھی یہ رائے نہ دونگا کہ کونسلوں میں جانے کا خیال بھی کریں۔ یہی وجہ ہے کہ گو میں گیا پروگرام کی طرف سے بالکل مایوس تھا تاہم جب تک ذرا بھی امید اس کی کامیابی کی کی جاسکتی تھی میری کوشش یہی رہی کہ سب مل کر اسے کامیاب بنانے کی سعی کریں، اور کونسلوں میں جانے کا کوئی خیال سامنے نہ لائیں۔ بہرحال اگر ہم چاہیں، تو انتخاب کے بعد کا پروگرام آج ہی بنالے سکتے ہیں۔ چاہیں، تو اسے آئندہ سالانہ اجلاس پر موقوف کریں۔ یہ آخری صورت شاید زیادہ بہتر ہوگی۔ باہر کا کام کیا ہو؟ یہ سب سے زیادہ اہم چیز ہے اور اسی پر اس نئے گوشۂ جنگ کا مفید ہونا موقوف ہے۔ اس بارے میں حسب ذیل امور پر آپ کو توجہ دلاؤنگا:

جدوجہد کی بنیاد کا کیا حال ہے۔ میرا اشارہ ہندو مسلم اتحاد کی طرف ہے۔ یہ ہماری تعمیرات کی وہ پہلی بنیاد ہے جس کے بغیر نہ صرف ہندستان کی آزادی بلکہ ہندستان کی وہ تمام باتیں جو کسی ملک کے زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے لیے ہو سکتی ہیں، محض خواب و خیال ہیں صرف یہی نہیں ہے کہ اس کے بغیر ہمیں قومی آزادی نہیں مل سکتی، بلکہ اس کے بغیر ہم انسانیت کے ابتدائی اصول بھی اپنے اندر نہیں پیدا کر سکتے۔ آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں سے اُتر آئے اور قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج ۲۴ گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے، بشرطیکہ ہندستان ہندو مسلم اتحاد سے دستبردار ہو جائے، تو میں سوراج سے دستبردار ہو جاؤنگا، مگر اس سے دستبردار نہ ہونگا۔ کیونکہ اگر سوراج کے ملنے میں تاخیر ہوئی، تو یہ ہندستان کا نقصان ہوگا، لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا، تو یہ عالمِ انسانیت کا نقصان ہے۔

ملک کی موجودہ حالت کیا ہے؟ کون ہے جو ہندستان کے عشق و محبت کا ایک ذرّہ بھی اپنے دل میں رکھتا ہو اور اسے صبر اور برداشت کے ساتھ دیکھ سکے۔ چار سال ہوئے کہ ہم نے قومی عزت و شرف کا ایک بڑے سے بڑا اعلان کیا اور دنیا سے کہا کہ وہ ہماری آزادی کا انتظار کرے۔ لیکن عین اس وقت جب کہ وہ ہماری آزادی کی داستان سننے کے لیے گوش برآواز ہے ہم آمادہ ہو گئے ہیں کہ اپنی غلامانہ شرمناکی اور اپنے مجنونانہ کُشت و خون کی اس کے لیے کہانی ترتیب دیں۔ موجودہ حالت یہ ہے کہ سوراج اور خلافت کی جگہ شدھی کی تحریک، اس کی مدافعت اور سنگھٹن کا غلغلہ ہر طرف بپا ہے۔ ایک طرف سے کہا جا رہا ہے کہ ہندوؤں کو مسلمانوں سے بچاؤ۔ دوسری طرف سے کہا جا رہا ہے کہ اسلام کی لاج کی ہندوؤں کے حملہ سے حفاظت کرو۔ جب ہندوؤں اور مسلمانوں کی حفاظت کی پکار بلند ہو رہی ہے، تو ظاہر ہے کہ یہ بدنصیب ہندستان کی حفاظت کا ولولہ کب قائم رہ سکتا ہے! ایک طرف جلسوں اور اخباروں میں لوگوں کے اندر مجنونانہ مذہبی تعصبات ابھارے جا رہے ہیں، دوسری طرف نادان اور فریب خوردہ عوام ہندستان کی سڑکوں پر بیدریغ اپنا خون بہا رہے ہیں۔ اجمیر،

قدم اٹھائیے۔ میں اس سے بالکل انکار کرتا ہوں کہ یہ کوئی ایسا معاملہ ہے جس کے لیے ہم قومی نظام کی اطاعت سے باہر ہونے پر مجبور ہو سکتے ہیں۔ اگر آج بھی آپ کا فیصلہ یہ ہو کہ کونسلوں کے لیے نہیں کھڑا ہونا چاہیئے تو اس صورت میں میری رائے یہ ہوگی کہ بائیکاٹ کو داخلہ پر ترجیح ہے۔ کیونکہ ہمارے کام کے لیے اصلی چیز متحدہ جد و جہد ہے جو راہ ہم سب مل کر اختیار کر سکتے ہیں، وہ متفرق قدم سے بہتر ہوگی۔ اور جب تک اصول اور اعتقاد کا سوال نہ آئے ہمیں اپنے نظام کی اطاعت سے باہر نہ ہونا چاہیے۔

حضرات!

گیا کے موقعہ پر علمائے اسلام کی کانفرنس نے یہ رائے قائم کی تھی کہ مسلمانوں کو کونسلوں کے لیے کھڑے ہونے سے احتراز کرنا چاہیے۔ دراصل مذہبی نقطۂ خیال سے ان کے سامنے ترکِ موالات کی اصل تھی۔ اور جہاں تک طریقِ عمل کا سوال ہے قدرتی طور پر انھیں ان تمام طریقوں سے انکار ہونا چاہیے جن سے اصل کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ یہ بات کہ کونسلوں میں جانا اس کے لیے مفید ہے یا مضر، ایک ایسا معاملہ ہے جس پر وہی لوگ رائے قائم کر سکتے ہیں جنھیں ان معاملات کا تجربہ ہے لیکن اس وقت خود ان لوگوں میں اختلاف تھا۔ پس ضرور تھا کہ حضرات علماء اسی پہلو کو اختیار کریں جس میں احتیاط ہو۔ بصورتِ اختلاف احتیاط اسی میں تھی کہ احتراز کیا جائے لیکن میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ اگر آج آپ اس بارے میں ایک مطمئن فیصلہ کر لیں گے تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان کی جانب سے اس معاملہ میں اصرار ہو۔

## ہندو مسلم اتحاد

حضرات!

میں نے آپ کا اس قدر وقت درو دیوار کی فکر میں لے لیا، حالانکہ ابھی یہ بات باقی ہے کہ ہماری

رہ کر اپنی جماعتی تنظیم کی جائے۔

لیکن غالباً آپ میں سے وہ تمام حضرات جو گذشتہ بارہ سال کے اندر مسلمانوں کے جماعتی تغیرات کا مطالعہ کرتے رہے ہیں، اس سے واقف ہونگے کہ ۱۹۱۲ء میں میری سب سے پہلی صدا تھی، جو اس طرزِ عمل کے برخلاف بلند ہوئی۔ میں نے اپنے ہم مذہبوں کو اس طرف بلایا کہ وہ علیحدگی کی پالیسی پر قائم رہ کر اپنی ہستی کو ملک کی آزادی کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ انھیں چاہیے کہ اپنے ہندو بھائیوں پر اعتماد کریں، کانگریس میں شریک ہوں، ملک کی آزادی کو اپنا نصب العین بنائیں، اور فرقہ وار تنظیم سے کنارہ کش ہو جائیں۔ اس وقت میری یہ پکار میرے تمام ہم مذہبوں پر شاق گزری۔ پوری قوت کے ساتھ میری مخالفت کی گئی۔ لیکن بالآخر وہ وقت بہت جلد آگیا، جب مسلمانوں نے اس حقیقت کی سچائی کا اعتراف کیا۔ میں جب ۱۹۱۶ء میں رانچی میں نظر بند تھا، تو سن رہا تھا کہ جوق در جوق مسلمان کانگریس میں شریک ہو رہے ہیں۔

حضرات!

جس طرح میں نے ۱۹۱۲ء میں اپنے تمام ہم مذہبوں کے مسلک کے خلاف اپنی صدا بلند کی تھی اور ان کی مخالفت کا خوف مجھے اظہارِ حق سے نہ روک سکا تھا۔ ٹھیک اسی طرح آج میں اپنا پہلا فرض سمجھتا ہوں کہ ان تمام بھائیوں کے خلاف اپنی صدا بلند کروں، جو ہندو سنگھٹن کی تحریک کے علمبردار ہیں۔ میں حیرت سے یہ محسوس کر رہا ہوں کہ جو دماغی حالت اس وقت مسلمانوں کے سیاسی حلقوں کی تھی، ٹھیک ٹھیک وہی آج ان حضرات کی ہو رہی ہے۔ وہی دلائل آج بھی ہمیں سنائے جا رہے ہیں۔ وہی اسباب و بواعث آج بھی ان کی زبان پر ہیں۔ مسلمانوں کا یہ خیال اس کے ساتھ تھا کہ اُن کی تعداد کم ہے اور آج یہ تحریک اُن لوگوں کو برانگیختہ کرنا چاہتی ہے، جن کی تعداد مسلمانوں سے تین گنی زیادہ ہے۔ میں بلا کسی تامّل کے صاف صاف کہنا چاہتا ہوں کہ آج ہمیں ہندوستان میں نہ کسی ہندو سنگھٹن کی ضرورت ہے، نہ مسلم سنگھٹن کی۔ ہمیں صرف

میرٹھ، سہارن پور، آگرہ، پلول اور کہاں کہاں سخت فسادات ہو چکے اور کون کہہ سکتا ہے کہ آگے چل کر اس کے نتائج کس قدر افسوسناک ہوں گے۔

حضرات!

میں آج ان تمام لوگوں سے جو ان جذبات کی تبلیغ کر رہے ہیں، صاف صاف کہنا چاہتا ہوں کہ یہ حالت ناقابلِ برداشت ہے۔ میں ایک قدم اور آگے بڑھتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ ہم آزادی کی طرف جا رہے ہیں، آپ ہمارا راستہ نہ روکیے! اگر آپ روکینگے، تو ہمارا فرض ہے کہ رکاوٹوں سے راستہ صاف کریں۔ میں آپ تمام حضرات سے جو ملک کے گوشہ گوشہ سے آئے ہیں اور اپنے اندر ہندستان کا دماغ اور ہندستان کی زبان دونوں رکھتے ہیں، یہ عرض کرونگا کہ اگر آج آپ اس مسئلہ کا فیصلہ نہیں کر سکتے کہ نون کواپریٹرز کونسلوں میں جائیں یا نہیں، تو مضائقہ نہیں لیکن خدارا آج اس کا فیصلہ کر کے یہاں سے اٹھیے کہ ہندستان اپنی آزادی و نجات کی زخمی امیدوں کو بچائے رکھے، یا آگرہ اور سہارن پور کی خون آلود سرزمین میں دفن کر دے! آج آپ کو صاف صاف اس بارے میں اپنا فیصلہ صادر کرنا چاہیے اور اپنی تمام قوتیں اس کے لیے صرف کر دینی چاہییں اگر آپ ایک دن کے لیے بھی اسے برداشت کرینگے، تو یقین کیجیے کہ برسوں کے لیے آپ کا سفر پیچھے پڑ جائیگا۔

# فرقہ وار تنظیم

حضرات!

ابھی کچھ زیادہ مدت نہیں گزری کہ مسلمان بہ حیثیت ایک قوم کے کانگریس کی سیاسی حرکت میں شریک نہ تھے۔ مسلمانوں میں یہ جذبہ عام تھا کہ ہندستان میں ان کی تعداد ہندوؤں سے بہت کم ہے، تعلیم اور دولت میں بھی ان سے پیچھے ہیں، اگر وہ کسی متحدہ حرکت میں شریک ہونگے، تو ان کی ہستی پامال ہو جائیگی۔ اسی خیال کا نتیجہ تھا کہ عرصہ تک ان کی قومی پالیسی یہ رہی کہ الگ

کوشش کرے۔ لیکن میں اس سے قطعًا انکار کرتا ہوں کہ کوئی ایسی تحریک اس حالت میں قائم ہو سکتی ہے جب کہ اس کا خمیر فرقہ وار فسادات اور باہمی جنگ کے خون سے مہیا کیا گیا ہو۔

ان تحریکات کے بعض ذمہ دار حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ ہندو مسلم اتحاد کے مخالف نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ ہمیشہ مقابلہ کا وعظ کہہ کر آخر میں اتحاد و محبت کا بھی پیغام سُنا دیتے ہیں۔ ان حضرات سے کہونگا کہ آپ نے ہمیں غلط راستہ کی طرف بلایا ہے۔ لیکن اب فطرتِ انسانی کے انکار کی دعوت نہ دیجیے۔ حضرت مسیح نے دنیا سے کہا کہ دشمنوں کو بخش دو۔[۳۹] مگر دنیا آج تک دوستوں کو بھی بخش نہ سکی۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ ایک طرف انتقام اور مقابلہ کا جذبہ مشتعل کر کے دوسری طرف محبت و اتحاد کا کارخانہ بھی قائم رکھیں۔

اسی طرح میں شدھی کی تحریک کی نسبت بھی عرض کروں گا کہ اگرچہ ہم کاغذ پر سیاست کی متحدہ تحریک اور مذہب کی فرقہ وار کشمکش کو دو مختلف خانوں میں رکھ سکتے ہیں لیکن عمل میں کوئی ایسی تفریق قائم نہیں رہ سکتی۔ ہمیں متحدہ قومیت کی ضرورت ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اگر ہندستان میں ایک طرف سے ملیچھ اور دوسری طرف سے کافر کی صدائیں اٹھتی رہیں گی، تو محال ہے کہ وہ رواداری پیدا ہو سکے، جس کے بغیر اتحاد کا وجود قائم ہی نہیں رہ سکتا۔

حضرات!

میں ملک کی تمام جماعتوں سے عرض کرونگا کہ انھیں ایک مرتبہ ہندستان کی قسمت کا فیصلہ کر لینا چاہیے اگر وہ چاہتے ہیں کہ ہندستان آزادی و نجات حاصل کرے تو پھر انھیں اور تمام کام اس کے لیے ملتوی کرنے ہی پڑینگے۔ خواہ وہ کام انھیں کتنے ہی محبوب ہوں لیکن اس کے سوا چارہ نہیں۔

میں آج اس پلیٹ فارم سے جو ہندستان کی متحدہ قومیت کا گہوارہ ہے، تمام ہندو مسلمانوں سے وطن کے نام پر اپیل کرتا ہوں کہ وہ اُس کی امیدوں کو اس بے دردی کے ساتھ پامال نہ کریں، اور بلا اس بحث کے کہ اب تک کیا ہو چکا ہے۔ آیندہ کے لیے ان تمام سرگرمیوں

## ایک سنگھٹن کی ضرورت ہے اور وہ یہ "انڈین نیشنل کانگریس" ہے۔

میں اس وقت اس معاملہ کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا ہوں جو دلائل ان تحریکات کی تائید میں بیان کیے جاتے ہیں، مجھے ان کی صحت سے بالکل انکار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چونکہ فلاں سنہ میں فسادات ہوئے اور ان میں ایک فریق کا نقصان زیادہ ہوا اس لیے ضروری ہے کہ وہ دوسرے فریق کے مقابلہ میں اپنا علیحدہ سنگھٹن کر لے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر ایک لمحہ کے لیے بھی یہ طریقِ استدلال صحیح تسلیم کر لیا جائے، تو ہندستان کی ہر جماعت اپنے نقصانات کی ایسی ہی ایک فہرست تیار کر سکتی ہے۔ اور اس کے بعد سنگھٹن کا اعلان کر دے سکتی ہے۔ اگر بمبئی کے گذشتہ بیس سال کے واقعات پر نظر ڈالی جائے تو کئی فسادات ایسے ملیں گے جو خود مسلمانوں کے دو فرقوں میں ہوئے ہیں۔ اور ایک فرقے نے دوسرے کو اچھی طرح لوٹا اور قتل کیا ہے۔ البتہ میں اس بات کا صاف صاف اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ ہندو مسلم اتحاد کے نئے دور کے بعد ملتان میں فساد کا ہونا اور وہاں کے مسلمان بلوائیوں کے ہاتھ سے ہندوؤں کو سخت نقصان کا پہنچنا ایک ایسا افسوسناک حادثہ ہے جس پر ہر مسلمان کے دل پر زخم لگنا چاہیے۔ تاہم ہندستان جیسے ملک میں جہاں کروڑوں انسان بستے ہیں، جو ابھی ابھی نئی زندگی کے دور میں داخل ہوئے ہیں، اور جہاں غلط مذہبی تعصب اور بیجا مذہبی جوش کا ابھر آنا کچھ دشوار نہیں ہے، ایسے حوادث ناممکن نہیں کر دیے جا سکتے۔ اس کا صحیح علاج صرف یہی ہے کہ ملک کے دیگر طبقات اس کی وجہ سے فریقانہ جذبہ پیدا نہ کریں۔ جس کی زیادتی ہو اسے ملامت کی جائے، جس پر ظلم ہوا ہو اس سے ہمدردی کی جائے۔ یہ علاج نہیں ہے کہ ایک مقامی معاملہ کو طول دے کر اور تمام ملک اور فرقہ کا مسئلہ بنا کر کسی ایک فریق کو مقابلہ کی دعوت دی جائے۔ پھر دوسرا فریق بھی نئی نئی تیاریاں کرے اور اس طرح ختم نہ ہونے والی جنگ قائم ہو جائے۔

میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ ہندستان کی ہر جماعت کو اپنی اندرونی اصلاح و درستگی کے بیشمار کام درپیش ہیں اور ضروری ہے کہ ہر جماعت اپنی اپنی جگہ اپنی کمزوریوں کو دور کرنے کے لیے

## ۸

# آل انڈیا خلافت کانفرنس

کانپور، ۲۹ دسمبر ۱۹۲۵ء

حضرات!

یہ دوسرا موقعہ ہے کہ آپ نے خلافت کانفرنس کی صدارت کے لیے مجھے منتخب فرمایا ہے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۲۰ء میں جب اس کا اجلاس ناگپور میں ہوا تھا، آپ نے یہی خدمت میرے سپرد کی تھی۔ اب پانچ سال کے بعد دوبارہ مجھے موقعہ دیا ہے کہ آپ کے اعتماد اور محبت کا شکریہ ادا کروں۔

## پنجسالہ گردشِ حوادث

پانچ سال کی یہ مدّت انسانی عمر کی کوئی بڑی مدت نہیں۔ زمانہ کی غیر معلوم مگر طویل عظیم عمر کا تصور کیجیے، تو یہ پانچ برس اس کے ناپیدا کنار سمندر میں ایک قطرہ سے زیادہ ہستی نہیں رکھتے۔ تاہم غور کیجیے تو نظامِ شمسی کی انہی پانچ گردشوں کے اندر انقلاب و تغیر کی کتنی گردشیں دنیا پر گذر چکی ہیں! انقلاب کا ایک کامل دور ہے جو ذہن اور جسم کے ہر گوشہ میں طاری ہے۔ جنگِ عظیم گویا اس انقلاب کی پکار تھی۔ اب خود انقلاب تیزی کے ساتھ قدم بڑھا رہا ہے۔ ماضی کے نتائج ایک نئے مستقبل کے لیے ڈھل رہے ہیں اور مستقبل جلد جلد اپنے آثار و علائم بھیج رہا ہے۔

کو بند کر دیں جو شدھی موومنٹ[۳۸] اس کی مدافعت اور فرقہ وار تحریکوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ اگر بند کر دینے کے لفظ سے وہ متفق نہیں ہو سکتے، تو کم از کم ملتوی کر دیں۔ اگر وہ ایسا کرینگے تو نہ صرف اپنے وطن کی بلکہ تمام عالمِ انسانیت کی ایک سب سے بڑی خدمت انجام دیں گے۔

## ہندستان کا میثاقِ ملّی

حضرات!

اس سلسلے میں مجھے یہ بھی یاد دلانے دیجیے کہ اب ہمیں اس باب میں تساہل نہیں کرنا چاہیے کہ ہندستان کے لیے ایک ایسا میثاقِ قومی تیار ہو جائے جو نہ صرف ہمارے قومی نصب العین کو ہمیشہ کے لیے صاف اور واضح کر دے بلکہ ہندستان کی مختلف جماعتوں کے باہمی علائق اور روز مرّہ کے پیش آنے والے جھگڑوں کا بھی فیصلہ کر دے۔ اس اعتبار سے ہندستان ایک عجیب ملک ہے۔ بہت ممکن ہے کہ تیس کروڑ انسانوں کی آزادی صرف اس لیے تاخیر میں پڑ جائے کہ کسی مسجد کے سامنے سے ایک جلوس ڈھول بجاتا ہوا گزر گیا، یا کسی راستہ کے درخت کی شاخ کاٹ ڈالی گئی پس جب ملک کی مصیبتوں کی نوعیّت کا یہ حال ہے تو ہمیں ان مسائل کے قطعی اور دائمی فیصلہ میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ اس مسئلہ پر بھی غور فرمائینگے۔ بہتر ہوگا کہ منتخب افراد کی ایک کمیٹی اس غرض سے مقرر کر دی جائے اور آئندہ اجلاس سے پہلے ایک مسودہ تیار کر لے۔

## خاتمہ

حضرات! قوموں کے تمام بڑے دنوں کی طرح آج کے دن کے نتائج بھی دو انتہائی قسموں میں منقسم ہیں۔ آج ہم بہت بڑی کامیابی بھی حاصل کر سکتے ہیں اور بہت بڑی ناکامی بھی ہمارے حصے میں آ سکتی ہے۔ ہمارے عزم، ہمارے ثبات اور ہماری حب الوطنی کے لیے آج بہت بڑی آزمائش درپیش ہے۔ آئیے! اس پر غالب آئیں اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جائیں۔

اور دلچسپی حاصل کرلی تھی۔ ایک خاص منزل تک پہنچ کر رک گئی۔ اور اس کے بعد اس کے ردِ فعل (ری ایکشن[1]) کے اثرات نہایت تیزی کے ساتھ ظاہر ہونا شروع ہو گئے۔ اب سرگرمی کی جگہ افسردگی ہے۔ بیداری کی جگہ غفلت ہے۔ اتحاد کی جگہ انتشار ہے۔ ملک و قوم کی جگہ فرقہ اور جماعت کی صدائیں ہیں، اور کام کی رہی سہی قوتوں کے لیے نئے نئے گمراہ کرنے والے فتنے پیدا ہو رہے ہیں۔ ہندستان کے موجودہ منظر کا سب سے زیادہ اور دردانگیز پہلو اس وقت نمایاں ہوتا ہے جب مشرقی ممالک کے موجودہ تغیرات کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا جائے جب کہ مشرق کی تبدیلیاں آزادی اور ترقی کی طرف جا رہی ہیں، تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا ملک قدم اٹھا کر صرف تھک ہی نہیں گیا ہے، بلکہ واپسی کے لیے پیچھے دیکھ رہا ہے۔ افریقہ کے مٹھی بھر قبائل جس آزادی کی حفاظت کی راہ میں فرانس اور اسپین کی متحدہ طاقت کو پے در پے شکستیں دے سکتے ہیں، اس کے لیے ہندستان اپنی اتنی وسیع آبادی کے ساتھ جو موجودہ نسلِ انسانی کا پانچواں حصّہ ہے، اپنی جہالت و غفلت کو بھی شکست نہیں دے سکتا۔ ہندستان کی طرح شام میں بھی مختلف مذاہب اور نسل کی مشترک آبادی ہے۔ وہاں کے دروزی قبائل، عام مسلمان اور مسیحی جماعتیں صدیوں سے باہم دگر قتل و غارت میں سرگرم رہی ہیں۔ مسلمانوں اور مسیحیوں کے مذہبی اختلافات کے لیے صرف صلیبی لڑائیوں ہی کا افسانہ کافی ہے جس کے آٹھ خونی سیلاب اسی سرزمین میں بہہ بہہ کر خشک ہو چکے ہیں۔ تاہم آج اپنے ملک کی آزادی کے لیے ان سب کا متحدہ نعرہ یہ ہے الدّین للواحد والوطن للجمیع[2] وطن سب کے لیے ہے۔ اور ہر شخص کا دین اس کے لیے ہے۔ لیکن ہندستان کا حال کیا ہے؟ یہ ہے کہ اس کی بہترین تعلیمی اور سیاسی پیداوار بھی آج اس حد تک جانے کے لیے تیار نہیں۔ مذہبی منافرت، جماعتی تعصب، فرقہ وارانہ تنگ دلی، اور محکومانہ ذہنیّت کے تمام مفاسد ہماری راہ بدستور روکے کھڑی ہیں۔

## مسلمانانِ ہند

جہاں تک مسلمانانِ ہند کی جماعتی زندگی کا تعلق ہے ۱۹۲۰ء کی ابتدا سے ۱۹۲۵ء کا خاتمہ

## عالمِ اسلامی کے تغیّرات :

آج اس محل میں ہماری بحث و نظر کا دائرہ ہندستان اور عالمِ اسلامی کے اندر محدود ہے لیکن جغرافیۂ عالم کے ان گوشوں کے حوادث بھی اس کے لیے کافی ہیں کہ ایک انقلاب انگیز عہد تاریخی خواص ان میں تلاش کیے جائیں۔

جدید ترکی کا ظہور اور نشو و نما، مصر کی سیاسی حرکت کا اتار چڑھاؤ، مشرق میں یورپ کے طامعانہ استعمار کا نیا دَور، عراق، شام اور فلسطین کی انگریزی فرانسیسی حکمبرداری، عثمانی خلافت کا اختتام، خاندانِ عثمانی کا ترکی سے اخراج، شمالی افریقہ میں امیر محمد بن عبدالکریم کی پے در پے فتحمندیاں، حجاز کے ناگہانی اور فوری تغیرات، شریف حسین کی خودساختہ امارت کا خاتمہ، امیر ابن سعود کا داخلۂ حجاز، جزیرۃ العرب میں ایک نئی سیاسی صورتِ حال کی پیدائش، شام میں قومی حرکت کا طاقتور ظہور، خاندانِ قاچاریہ کا خاتمہ اور پہلوی شاہیت کا قیام، یہ اور اسی طرح کے کتنے ہی واقعات ہیں جو اس قلیل عرصہ کے اندر گزر چکے ہیں۔ اور گو ان کی انقلابی اہمیت ہم نے اپنی روزانہ زندگی کی مشغولیت میں محسوس نہ کی ہو۔ لیکن تاریخ ان کے اندر قرنوں اور صدیوں کے تغیرات کا سراغ لگائے گی۔

## ملک کے داخلی تغیّرات :

یہ تو ہماری دلچسپی کا بیرونی منظر تھا۔ لیکن ہم کسی حال میں بھی یہ حقیقت فراموش نہیں کر سکتے کہ ہمارے لیے زندگی اور سرگرمی کی اصلی جگہ خود اپنی سرزمین اور وطن ہی ہے۔ غور کیجیے! اس پانچ سال کے اندر یہاں کی دماغی و جماعتی حالت میں بھی کیسی کیسی تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ نہیں کہا جا سکتا ہمارے ملک کے مستقبل میں ان کے اثرات کیا کیا اور کس کس طرح کام دینگے۔ خلافت کی حرکت کے ساتھ ہی ملک کی آزادی و استقلال کی جو متحدہ حرکت شروع ہوئی تھی اور جس کی خصوصیتوں نے بہت جلد دنیا کی توجہ

کچھ بھی تعجب انگیز نہیں ہے جو افراد کی طرح قوموں اور جماعتوں کے لیے بھی اس دنیا میں نافذ ہیں۔ یہ علم و حقیقت کا صریح انکار ہوگا اگر ہم مرعوب ہو کر سراسیمہ ہو جائیں جس طرح ایک فرد پر اس کے جسم و دماغ کی مختلف حالتیں طاری ہوتی ہیں اور وہ حالتیں اس درجہ عام اور یکساں ہیں کہ ان کا علم و احساس کم و بیش ہر انسان میں موجود ہے۔ جسم کی صحت اور بیماریاں، دماغ کا نظم اور اختلال، جذبات کا سکون اور ہیجان، ہمارے لیے زندگی کے عام اور قدرتی حالات ہیں۔ ٹھیک یہی حال قوموں اور جماعتوں کا بھی ہے، ان کا بھی ایک مجموعی اور نوعی دماغ ہے اور اس کے لیے بھی نظم و اختلال اور سکون و ہیجان کی مختلف حالتیں ہیں۔ البتہ فرد کی زندگی شب و روز ہم پر گزر رہی ہے اور ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ اس لیے ہم اس کے اندر قوانین زندگی کی کارفرمائی محسوس کر رہے ہیں۔ مگر قوموں اور جماعتوں کی نوعی زندگی کے تغیرات کی رفتار بہت ہی سست ہے۔ گھنٹے کی سوئی کی طرح اس کی حرکت مشاہدہ میں نہیں آتی۔ اگرچہ منٹ کی سوئی کی طرح وہ بھی متحرک ہے۔ تغیر کے ایک نقطہ سے لے کر دوسرے نقطہ تک پہنچنے کے لیے بسا اوقات انھیں قرنوں اور صدیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ہمارا محدود و ناقص علم اس گوشہ کا بھی احاطہ کر سکتا، تو ہم قوموں اور جماعتوں کے تمام احوال کو اسی نظر سے دیکھتے، جس نظر سے ایک طبیب بیمار کا جسم اور ایک حکیم انسان کے دماغی خواص دیکھتا ہے۔

## مایوسی کی کوئی وجہ نہیں :

ہندوستان کے اس پورے آباد رقبہ کو ایک فرد کی طرح تصور کیجیے اور مجھے جواب دیجیے کہ کائنات ہستی کے اس وجود کو بھی وہ سب کچھ کیوں نہ پیش آئے، جو ہمیشہ ان حالات اور ان ظروف میں پیش آتا رہا ہے اور جب تک خالق کائنات کی مرضی ہوگی پیش آتا رہیگا۔ یہ وجود بیمار ہے اور تندرستی حاصل کرنی ہے۔ بیماری کے اسباب ایک نہیں، بیشمار ہیں۔ نئے نہیں، پرانے ہیں۔ صرف بیرونی نہیں، اندرونی بھی ہیں۔ ضروری ہے کہ ان سب کے نتائج ظاہر ہوں اور ناگزیر ہے کہ بار بار اتار چڑھاؤ پیش آئے۔ بیماری اگر پرانی

ہر اعتبار سے مختلف ہے۔ اگر انھیں دو مخالف سمتوں سے تعبیر کیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ گذشتہ حرکت کا سب سے زیادہ نمایاں اور مؤثر پہلو یہ تھا کہ مسلمانوں میں متحدہ مقصد کے لیے متحدہ جدوجہد کی سرگرمی پیدا ہوئی۔ ان کی پراگندگی، نظم و انضباط سے آشنا ہوئی۔ انھوں نے ہندستان کے موجودہ دور میں پہلی مرتبہ مقصد، قوم، فرض اور ایثار کی راہ میں قدم اٹھایا۔ مختلف اسباب سے جن کی تشریح کا یہ موقعہ نہیں، وہ ملک کی سرگرمی میں اپنے برادرانِ وطن سے بہت پیچھے تھے۔ اس حرکت نے مسلمانوں کے قدم بھی میدانِ جنگ کی طرف اٹھا دیے۔ لیکن موجودہ حالت بالکل اس سے متضاد ہے۔ گزشتہ حرکت جو پوری تیزی کے ساتھ جاری تھی، اچانک رک گئی، اور اس کے عدم سے ان کی جمعیت بھی بکھر گئی۔ اب نظم اور انضباط کی جگہ ہر طرف پراگندگی ہے۔ افکار پریشان ہیں۔ طبیعتیں غیر مطمئن ہیں۔ یقین اور اعتماد ہل گیا ہے اور لوگ محسوس کر رہے ہیں کہ کوئی راستہ ان کے سامنے موجود نہیں۔ عام طور پر ملک میں غفلت و گمرہی کی جو آب و ہوا پیدا ہو گئی ہے، وہ خود بھی اسی میں بہ رہے ہیں، اور حالات کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ اس سے الگ ہو کر اپنے فکر و دماغ کی درستی کی انھیں مہلت نہیں ملتی۔ اگر فکر و اعتقاد کی کوئی قوی اور بالاتر روشنی موجود نہ ہو تو اس تاریکی کا لازمی نتیجہ سرگردانی اور حیرانی ہے۔ چنانچہ یہ سرگردانی ہر طرف دکھائی دے رہی ہے۔ بہت سے لوگ کسی غیر معلوم اور غیر معیّن راہ کی جستجو میں ہیں: وہ کہتے ہیں کوئی نیا قدم اٹھانا چاہیے لیکن کس طرف اور کس طرح؟ اس کا جواب خود انھیں معلوم نہیں۔ جب کہ عام حالت ایسی ہو رہی ہے تو کچھ تعجب انگیز نہیں، اگر جا بجا جہل و فساد کے سوئے ہوئے فتنے بھی بیدار ہو گئے ہیں۔

## موجودہ حالت قدرتی ہے:

حضرات!

یہ تمام صورتِ حال کیسی ہی افسوسناک کیوں نہ ہو، لیکن یقین کیجیے، ان قدرتی قوانین کے ماتحت

راہ کی ہر مشکل متحیر کر دیتی ہے اور ہر رکاوٹ پر وہ ہمت ہار کر بیٹھ رہتا ہے۔ حالات کی تبدیلی، کوششوں کی ناکامی، مشکلوں اور رکاوٹوں کی کثرت سے تو ہماری کوششوں کی صورت اور مقدار میں تبدیلی ہونی چاہیے۔ لیکن ہمارے عقائد اور اصول کیوں بدلیں؟ اگر ہندستان کی نجات کی راہ میں غفلت و فساد نے نئی نئی رکاوٹیں پیدا کر دی ہیں، تو اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ ہم اعتراف کر لیں کہ اب منزل زیادہ دور ہو گئی اور کام اس سے کہیں زیادہ ہے جس قدر ہم نے سمجھ رکھا تھا۔ لیکن یہ نتیجہ تو نہیں ہونا چاہیے کہ آزادی ہمارے لیے غیر ضروری ہو جائے! غلامی کی زندگی پر ہم قانع ہو جائیں! اور اس کی پہلی شرط یعنی باہمی جنگ و پیکار کا فیصلہ کر لیں! علم اور روشنی کے ہر کام کی طرح ضروری ہے کہ اس راہ میں بھی ہمارے سامنے کچھ بنیادی اصول ہوں۔ اگر وہ موجود ہیں، تو اصول میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

## درمیانی وقفہ اور دعوتِ عمل:

حضرات!

حقیقتِ حال یہ ہے کہ ہماری سرگرمی کا ایک دور ختم ہو چکا ہے مگر دوسرا ابھی شروع نہیں ہوا۔ اس لیے درمیانی وقفہ کی اداسی اور پریشان حالی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ ضروری ہے کہ جلد از جلد ایک نیا دور شروع ہو۔ اور ہم از سرِ نو تمام بکھری ہوئی قوتیں کسی ایک مرکز پر جمع کر لیں۔ ہمیں چاہیے کہ نہ تو گذشتہ پر ماتم کریں، نہ حال کے ہمت شکن نظاروں سے افسردہ ہوں بلکہ قدم اٹھائیں اور امید کے ایک نئے آغاز پر دستک دے دیں:

تفاوت ست میانِ شنیدنِ من و تو
تو بستنِ در و من فتحِ باب میشنوم

حضرات!

ایک ایسے وقت میں آپ نے مجھے دوبارہ صدا دی ہے۔ آپ میں سے اکثر احباب اس بات سے

اور تمام اعضا میں پھیلی ہوئی ہے تو علاج کی کوششوں کو بھی اسی مناسبت سے اپنے اندر صبر اور برداشت پیدا کرنی چاہیے۔ کیوں ہم علاج کی کسی ایک کوشش کی ناکامی یا بیماری کا کوئی ایک سخت ظہور دیکھ کر گھبرا جائیں؟ اگر علاج منظور ہے تو ہمیں ایک طبیب کے علم اور ایک تیمار دار کی برداشت کے ساتھ اس وقت تک کام جاری رکھنا پڑیگا، جو حکمتِ الٰہی نے اس کے لیے مقرر کر دیا ہے۔ ہم ایک فرد کی معمولی سی بیماری کے لیے بھی یہ حکم نہیں لگا سکتے کہ وہ کب تک تندرست ہو جائیگا، باوجودیکہ جسمانی صحت کے قوانین ہم نے منضبط کر لیے ہیں۔ پھر ہم ایک پوری قوم کے علاج میں کسی ایسے معجزانہ نتیجہ کے کیوں منتظر ہوں؟ اور ایک ابتدائی کوشش کی ناکامی یا نتیجہ کی تاخیر کیوں ہمیں سراسیمہ کر دے؟ ہم مرض کی کہنگی اور شدت پر غمگین ہونگے، لیکن صحت کی طلب میں ہمارے جو عقاید اور یقین ہیں، ان سے دستبردار نہیں ہو سکتے۔

## مسئلہ ہند کے اصول و عقائد:

حضرات!

یقیناً ملک کی موجودہ صورتِ حال ہر محبِ وطن کے لیے انتہائی غمگینی کا سامان ہے لیکن میں پوری سنجیدگی کے ساتھ اس پر اپنی حیرت ظاہر کرونگا کہ مایوسی، انقلابِ عقاید کا سامان کیوں ہو؟ کیا ہم نے ملک اور قوم کی نجات و ترقی کی راہ میں قدم نہیں اٹھایا ہے؟ کیا کروڑوں انسانوں کے ذہن و عمل کے انقلاب کا عظیم و گرانبار کام ہمیں درپیش نہیں؟ کیا مذہب، تاریخ، زبان، رسم و رواج، تہذیب اور معاشرت کے گہرے اختلافات اور جہل و غفلت کی بیشمار خرابیاں ہماری راہ میں حائل نہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ مرض صدیوں سے موجود ہے اور علاج کی عمر چند برسوں سے زائد نہیں؟ یہ چند برس بھی قومی زندگی کے لیے زیادہ سے زیادہ چند ایام ہیں۔ اگر ان صاف اور سادہ سوالات کا جواب اثبات میں ہے تو ضروری ہے کہ ہمارے سامنے اعتقاد یقین اور علم کی روشنی موجود ہو۔ ہم نے ایک بیخبر اور ناآشنا آدمی کی طرح قدم نہ اٹھایا ہو جسے

اور صرف سفر ہی جاری رکھیں، تو یقین کیجیے اس راہ میں چلتے رہنا ہی بجائے خود مقصود ہے:

رہروان را خستگیِ راہ نیست

عشق ہم راہ ست و ہم خود منزل ست

کیا ہم فی الحقیقت بڑھنے کے لیے تیار ہیں؟ میں سمجھتا ہوں اس کا صحیح جواب وہ نہ ہوگا، جو آج ہماری زبانیں دیں گی۔ بلکہ وہ ہوگا، جو سال آیندہ کے خاتمہ پر ہماری صورتِ حال دے سکیگی۔ اب ہمیں اعلان و دعویٰ ختم کر دینا چاہیے اور عمل کے لیے مستعد ہو جانا چاہیے

ربنا اتنا من لدنک رحمۃ وھی لنا من امرنا رشدا

## وقت کے مباحث:

حضرات!

اس قدر تمہیدی کلمات ناگزیر تھے۔ اب آپ اجازت دیں کہ پیشِ نظر مسائل کی طرف متوجہ ہوں۔ مجھے جو کچھ عرض کرنا ہے، وہ نہایت مختصر ہے۔ میں چاہتا ہوں جہاں تک ممکن ہو آپ رسم و نمایش کی جگہ حقیقت اور عمل کی طرف متوجہ ہوں۔ میری جانب سے اس راہ میں پہلا قدم یہ ہے کہ خطبۂ صدارت کے روایتی امتیاز و نمایش سے اپنی دستبرداری کا اعلان کرتا ہوں۔ یہ سالانہ تصنیف و انشا پردازی کی پر تکلف نمایش ممکن ہے، ملک کے ادبی ذخیرہ میں کچھ اضافہ کا موجب ہوتی ہو۔ لیکن اپنے محل اور وقت کے لیے تو قطعاً غیر ضروری ہے۔ اس کا غیر ضروری ہونا ہی اس کی ناموزنیت کے لیے کافی تھا۔ لیکن اس کے سننے کا بوجھ حاضرین کے لیے کس درجہ ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے، جب کہ وہ غیر دلچسپ بھی ہوتا ہے۔ ایک تحریر جو لکھی ہوئی اور چھپی ہوئی موجود ہوتی ہے اور جسے ہر شخص اپنی فرصت کے اوقات میں پڑھ سکتا ہے صرف اس لیے تین تین اور چار چار گھنٹہ تک پڑھی جاتی ہے تاکہ کسی نہ کسی طرح ایک رسم پوری کر دی جائے۔ میں نے قومی مجالس کی اس وقت کی تلخی ہمیشہ محسوس کی ہے اور میں اسے

بیخبر نہ ہونگے کہ میں کئی سال سے اس کوشش میں ہوں کہ صرف اپنی قلمی مشغولیت ہی کے لیے وقف ہو جاؤں۔ میری طبیعت کا یہ میلان محض میرے ذوقِ طلب ہی کا تقاضا نہیں، بلکہ میرا یقین ہے کہ میرے لیے وقت کی تمام قومی خدمات میں یہی خدمت سب سے زیادہ ضروری اور اہم ہے۔ گذشتہ پانچ سال کے اندر میں نے بار بار کوشش کی کہ قومی مجالس کی سرگرمیوں کے ساتھ یہ کام بھی جاری رکھوں۔ لیکن تجربے سے معلوم ہو گیا کہ بغیر یکسوئی کے ممکن نہیں۔ بالآخر مجبور ہو کر فیصلہ کرنا پڑا کہ ان سرگرمیوں سے بالفعل کنارہ کش ہو جانا چاہیے۔ اور اگر ان میں حصہ لینا بھی چاہیئے تو صرف اسی حد تک جہاں تک میری قلمی مشغولیت کا ضروری انہماک اجازت دے۔ اس حالت کا یہ قدرتی نتیجہ تھا کہ مجھے اس نئی ذمہ داری کی قبولیت میں تامل ہوتا، مجھے تامل ہوا۔ لیکن بالآخر جب میں نے گردوپیش پر نظر ڈالی، تو اس کے سوا چارہ نظر نہ آیا کہ اپنے فیصلہ پر وقت کے تقاضا کو ترجیح دوں اور تسلیم کر لوں کہ ہم خدمت گزارانِ قوم کے لیے اصلی فیصلہ وہی ہے جو وقت کا فیصلہ ہو۔ ہمیں پسند اور اختیار کی بہت سی چیزوں کی طرح اپنے فیصلہ کے حقِ ترجیح سے بھی دستبردار ہونا چاہیے۔ چنانچہ میں نے آپ کی دعوت منظور کر لی، اور اس وقت آپ کے سامنے موجود ہوں۔ آیئے، اپنی طلب و سعی کا سفر از سرِ نو شروع کر دیں۔

ہمارا سفر قوموں اور ملکوں کا سفر ہے۔ ہمیں انسانی اولوالعزمی اور فیروزمندی کی طرف جانا ہے۔ ہمیں اپنی گم گشتہ سعادت کا سراغ لگانا ہے۔ ہمیں اپنی راہ سے بیشمار رکاوٹیں دور کرنی ہیں۔ ہمیں خطروں اور مصیبتوں کے بیابان طے کرنے ہیں۔ خدارا مجھے جواب دیجیے، کیا ایسے عظیم و گرانبار مقصد کے لیے راہ کی درازی اور سفر کی تھکن محسوس کی جا سکتی ہے؟ ہم ابھی چلے ہی کتنے ہیں کہ ستانے کے لیے بیٹھ جائیں؟ ہماری یہ چند برسوں کی حرکت، قوموں کے سفر کے لیے بمشکل چند قدم تھی۔ اگر ہمیں موت سے زندگی، پستی سے بلندی، اور ذلت سے شرف و عظمت کی طرف پلٹنا ہے، تو ہمیں نہیں معلوم ایسے کتنے ہی سفر پیش آئیں گے اور ہر مرتبہ ہمیں نئے عزم اور تازہ ہمت کے ساتھ اٹھنا اور بڑھنا پڑیگا۔ اگر ہم مقصود سے غافل نہ ہوں

حقوق کے خلاف دنیا کی ایک عالمگیر مصیبت ہے۔ ایسی حالت میں ہندستان کا ایک دن کے لیے بھی اپنی غلامی پر قانع رہنا فی الحقیقت کسی قوم کی غلامانہ برداشت کی انتہا ہے۔ افسوس کہ ہمیں معلوم نہیں، ہماری بدبختی کی یہ برداشت کب تک جاری رہے گی۔ میں امید کرتا ہوں۔ اس وقت ہم میں ہمارے جنوبی افریقہ کے بھائیوں کا وفد موجود ہے۔ میں آپ کی جانب سے انھیں یقین دلاؤنگا کہ ہم اگرچہ اپنی بدقسمتی کی وجہ سے آج بیدست و پا ہیں، تاہم ہم میں ایک فرد بھی ایسا نہیں ہے، جو اپنے سمندر پار بھائیوں کی اس مصیبت کے احساس سے خالی ہو۔ ہم ان کی جدوجہد میں اپنی تمام ممکن قوتوں کے ساتھ شریک ہیں۔

حضرات!

ہندستان سے باہر کے بعض تازہ حوادث بھی نہ صرف سالِ رواں میں، بلکہ اس پورے دور میں اپنے آثار و نتائج کے اعتبار سے یادگار رہینگے۔ عنقریب تاریخ مختلف عنوانوں سے ان کی داستانیں مرتب کریگی۔

بالآخر موصل کے قضیہ کا نام نہاد مجلس اقوام نے فیصلہ کر دیا۔ یہ مجلس برطانیہ اور فرانس کی وزارتوں کا جنیوا میں ایک نیا دفتر ہے۔ اس لیے اس کا فیصلہ انصاف کے کتنے ہی خلاف ہو، لیکن توقع کے خلاف نہیں ہے۔ امید نہیں، ترکی حکومت اس صریح جبر و ناانصافی کو جو اس کی ترکی آبادی و رقبہ کا ایک اہم ٹکڑہ اس سے الگ کر دیتی ہے، منظور کر لے۔ اگر ترک جنگ پر مجبور ہوئے، تو جہاں تک ہندستان کا تعلق ہے، ایک بات بالکل صاف ہے۔ ہندستان اپنی تمام موجودہ کمزوریوں اور غفلتوں کے ساتھ بھی اس غلطی کا دوبارہ مرتکب نہیں ہو سکتا، جس میں وہ ایک صدی سے زیادہ عرصہ تک مبتلا رہ چکا ہے۔ وہ یقیناً اس سے انکار کر دیگا کہ اس کی مادی اور اخلاقی قوتیں آیندہ کسی ایسی جنگ کے لیے استعمال کی جائیں، جس کا مقصد محض برطانی شہنشاہیت کے جابرانہ اغراض ہیں۔ یقیناً ہندستان کے بدقسمت مسلمان اب اس کے لیے تیار نہ ہونگے کہ برطانوی شہنشاہیت کے لیے ان ترکوں کے سینوں پر گولیاں

گوارا نہیں کروںگا کہ خود بھی آپ کے لیے اس تلخی کا موجب بنوں۔ بلاشبہ میں محسوس کرتا ہوں کہ وقت کے متعدد مسائل بحث و بیان کے مستحق ہیں لیکن میں کوئی وجہ نہیں پاتا کہ اس قومی مجلس کا وقت جو نظر و بحث کے لیے نہیں، بلکہ عملی تدابیر کے لیے ہے، ان مباحث کے لیے کیوں حاصل کروں! اخبار و رسائل کے ذریعہ تحریر و اشاعت کا موقعہ ہمیشہ حاصل رہا ہے۔ پس یہاں مجھے آپ سے جو کچھ کہنا ہے، وہ صرف یہ ہے کہ آیندہ بارہ مہینے کے لیے ہماری جدوجہد کا پروگرام کیا ہونا چاہیے۔

## سالِ رواں کے بعض حوادث:

لیکن حضرات! خواہ ہم وقت کے احتساب میں کتنی ہی سختی کریں، تاہم سالِ رواں کے بعض حوادث ایسے اہم ہیں جن کی یاد سے اپنے دلوں کو اس وقت نہیں روک سکینگے۔ دیش بندھو چترنجن داس کی وفات ہمارے ملک کا ایک نقصانِ عظیم ہے۔ وہ ملک کے ان سیاسی رہنماؤں میں سے ایک تھے، جن کی ذات ہر ملک و قوم کے لیے موجبِ فخر ہو سکتی ہے۔ اُن کی رہنمائی سے ملک ایسے وقت میں محروم ہوا جب کہ ان کے تدبّر، حب الوطنی اور متحدہ قومیت کے سچے اور مضبوط اعتقاد کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ سریندر ناتھ بنرجی کے انتقال سے بھی ہندستان کی سیاسی شخصیتوں میں سے ایک دوسری شخصیت کی جگہ خالی ہو گئی۔ انھوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں کیسا ہی مسلک اختیار کیا ہو تاہم ملک کی سیاسی زندگی کی پیدائش میں ان کی طویل خدمات تاریخِ ہند میں اپنی جگہ حاصل کر چکی ہیں۔ سالِ رواں میں ملک کا موجودہ نظامِ حکومت بدستور اپنے جابرانہ خواص کی نمایش میں سرگرم رہا اور ہندستان اپنی غلامانہ زندگی کی بے بسی برابر محسوس کرتا رہا۔ جنوبی افریقہ میں ایشیاٹک بل کا معاملہ اس حقیقت کا ایک تازہ ثبوت بہم پہنچاتا ہے کہ ہندستان کی غلامانہ زندگی نے اس کے فرزندوں کو ذلّت و مصیبت آخری درجہ تک پہنچا دی ہے اور یورپ کا نسلی تعصّب نوعِ انسانی کے قدرتی

انسانی تہذیب و انصاف کی ان امیدوں کا کیوں ذکر کروں، جن کا فی الحقیقت کوئی وجود ہی نہیں ہے۔

انسانی ظلم و ناانصافی ہمیشہ کی طرح آج بھی موجود ہے۔ اس لیے ہم اس کے نتائج دیکھ رہے ہیں۔ لیکن انسانیت اور انصاف کہاں ہے، جس کی پامالی پر متعجب ہوں! طاقت نے کمزوری اور غفلت کے ساتھ کب انصاف کیا ہے کہ آج کریگی؟ ہر انصاف جس کا مطالبہ کمزوری کرے، رحم ہے؛ اور اس دنیا میں قوہیں رحم نہیں کیا کرتیں۔ یہاں صرف طاقت اور ضرورت کا اعتراف کیا جاتا ہے؛ اور اسی کا نام انصاف ہے۔ ہمیں چاہیے کہ حقیقت کے خلاف ہر فریبِ خیال سے انکار کردیں۔

سرزمینِ حجاز کے حوادث میں جہاں ایسے نتائج موجود ہیں، جو عجب نہیں، تاریخِ اسلام کے لیے ایک نئے دورِ اصلاح و ترقی کا دروازہ کھولیں، وہاں ہمارے لیے باشندگانِ حجاز کے مصائب کا تصور بھی کچھ کم المناک نہیں۔ شریفی حکومت جس کا وجود عرب اور اسلام کے لیے موجودہ عہد کی سب سے بڑی مصیبت تھی، اپنا آخری لمحۂ حیات بھی ظلم و استبداد کے بغیر بسر نہ کرسکی۔ مدینۂ منورہ کے ہزاروں باشندے فقر و فاقہ سے مجبور ہوکر شہر سے نکل گئے، اور اس وقت حجاز کے ساحلی مقامات میں خانہ ویرانی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

ہمارے وفدِ حجاز نے ان کے مصائب کا دردانگیز پیام مسلمانانِ ہند کے نام بھیجا ہے۔ میں آپ کو خصوصیت کے ساتھ توجہ دلاؤں گا کہ تمام خلافت کمیٹیوں کے ذریعہ کوشش کی جائے کہ آیندہ حج کے لیے زیادہ سے زیادہ حجاج روانہ ہوں۔ اہلِ حجاز کی معیشت کا دار و مدار زیادہ تر موسمِ حج کی رونق و کثرت پر ہے۔ جس قدر زیادہ حاجی جائیں گے، اسی مناسبت سے ان کی اقتصادی حالت سال بھر تک بہتر رہیگی۔

## طلوعِ امید

لیکن حضرات! ان المناک حالات کی تاریکی میں امید اور مراد کی روشنی بھی کیسی تابندہ و نمایاں ہے!

چلائیں، جو اپنے قومی و وطنی حق کی حفاظت کے لیے دفاع پر مجبور ہوئے ہیں۔
سرزمینِ شام کی وحشیانہ بربادی خصوصاً دمشق اور اس کے بے گناہ باشندوں کا ہولناک قتلِ عام شاید نوعِ انسانی کے لیے موجودہ عہد کا سب سے زیادہ ماتم انگیز واقعہ ہے۔ عظیم و جمیل دمشق جو دنیا کی تاریخی آبادیوں میں سے ایک ہے، جس کا چپہ چپہ تاریخِ مشرق کے بیش قیمت آثار کا دفینہ ہے، جو ایک صدی تک اسلام کے شاندار عہدِ عروج و تمدن کا مرکز رہ چکا ہے، جس کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے ایک زمانہ میں حافظ ابن عساکر کو اسّی ضخیم جلدیں لکھنی پڑی تھیں، اب ایک منہدم کھنڈر ہے اور متصل بہتر گھنٹہ کی گولہ باری نے جو کسی میدانِ جنگ کے لیے بھی ایک ہولناک ہلاکی تھی، اسے انسانی قتل و غارت کا ایک وسیع مدفن بنا دیا ہے نسلِ انسانی کی یہ تازہ ترین ہلاکت کن ہاتھوں سے انجام پائی ہے؟ فرانس کے ہاتھوں سے، اس فرانس کے ہاتھوں سے، جس نے اپنے انقلاب کی زبانی نوعِ انسانی کو حقوق، مساوات اور آزادی کا پیغام دیا تھا اور جس کے روسو[3]، والٹیر[4]، میرابو[5] اور لافیٹ[6]، وکٹر ہیوگو[7] کے لفظوں میں "نسلِ انسانی کے نجات دہندہ" تھے۔

حضرات!

تاریخِ عالم کے موجودہ عہد کی اس ہولناک بربریت کے ذکر کے بعد جو نوعِ انسانی کی اس نجات دہندہ قوم کے ہاتھوں انجام پائی ہے، آپ قدرتی طور پر منتظر ہونگے کہ اب میں فوراً دنیا کی اخلاقی زبان کے وہ تمام الفاظ بول جاؤں، جو ہمیشہ ایسے موقعوں پر بولے جاتے ہیں۔ میں انسانیت کا ذکر کروں، تہذیب کا حوالہ دوں، انسانی حقوق اور انصاف کی پامالی پر ماتم کروں، اور کم از کم آپ کو یاد دلاؤں کہ نام نہاد لیگ آف نیشنز اور یورپ کی فیاضانہ اور مربیانہ حکم برداری کے نتائج یہ ہیں، جو بدقسمت مشرقی اقوام کے حصہ میں آتے ہیں لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ یہ قطعاً بے سود ہے اتنا ہی نہیں بلکہ ایک معلوم و محسوس حقیقت سے انکار کرنا ہے۔ میں انسانی ظلم و حرص کی اس ہولناکی کا تو ذکر کر سکتا ہوں جو موجود ہے، لیکن

خاندانِ قاچاریہ کے عزل کے بعد دنیا کو قدرتی طور پر اسی کا انتظار تھا مگر اسے مایوسی ہوئی۔ تاریخ نے تعجب انگیز صورت میں اپنا ایک مشہور باب دہرا دیا اور ایران کے جمہوری مواد سے اچانک ایک نیا تاج و تختِ شاہی آراستہ ہوگیا۔ بہر حال یہ ایران کے لیے ترقی کا ایک قدم ضرور ہے۔ آج اس کا تاجِ شاہی اس کے طاقتور اور صاحبِ عزم رہنما کے سر پر ہے۔ اور تاریخ منتظر ہے کہ اس واقعہ کے نتائج کا فیصلہ کرے۔

حضرات!

آئیے اب وقت کے سب سے آخری مگر سب سے اہم واقعہ کی طرف متوجہ ہوں۔ یہ سرزمینِ حجاز کے عظیم الشّان انقلاب کی تکمیل ہے۔ مدینہ منوّرہ میں نجدی فوجیں امن و امان کے ساتھ داخل ہوچکی ہیں، اور جدّہ کی تسخیر کی تصدیق ہوگئی ہے۔ اب شریف حسین کے فتنہ سے یہ سرزمینِ مقدس پاک ہوگئی۔ اور اس طرح وہ عظیم الشان اسلامی خدمت مکمل ہوگئی جس کا شرف قدرتِ الٰہی نے امام عبدالعزیز آلِ سعود کے نام لکھ دیا تھا۔ فی الحقیقت نجدی افواج کا حجاز میں داخلہ اس سے کہیں زیادہ اہم واقعہ ترتیب دے رہا تھا، جس قدر دنیا کی نگاہوں نے تصوّر کیا تھا۔ اب نہ صرف سرزمینِ حجاز بلکہ جزیرۃ العرب کے لیے بالکل ایک نئی صورتِ حال پیدا ہوگئی ہے۔ موجودہ عرب کا سب سے بڑا انسان ہمارے سامنے نمودار ہوگیا ہے۔ اور ایک عظیم مستقبل اس کے عقب میں ہے۔ اب صدیوں کے بعد مسلمانانِ عالم کو موقعہ ملا ہے کہ سرزمینِ حجاز کی تجدید و اصلاح کے خواب کی تعبیریں ڈھونڈیں۔ اگر مسلمانانِ عالم کی رائے عامہ نے اس انقلاب کی قدر و قیمت محسوس نہ کی تو عجب نہیں، وہ تاریخ کی نظروں میں ایک بہت بڑی فرصتِ عمل ضائع کردینے کے لیے مجرم ثابت ہوں۔

## مرکزی خلافت کمیٹی اور اس کا نظام

حضرات! قبل اس کے کہ میں آپ کو وقت کے اہم کاموں کی طرف توجہ دلاؤں، چند الفاظ اس بارے

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ آثار اپنے پیچھے کیسا روشن طلوع رکھتے ہیں۔

شمالی افریقہ میں امیر محمد بن عبدالکریم کی فتحمندیاں حق و آزادی کے معجزاتِ باہرہ میں سے ایک نیا معجزہ ہیں۔ اسپین کی تنہا فوجی طاقت جب بار بار ٹکرا کر رہ گئی، تو فرانس اور اسپین نے اپنی متحدہ قوت کا اسے نشانہ بنایا۔ مٹھی بھر بے سروسامان قبائل اور موجودہ عہد کی دو متمدن اور خونریز طاقتوں کا مقابلہ! دنیا کے لیے ایک عجیب نظارہ تھا۔ تاہم جو نتائج نکلے وہ ہمارے سامنے ہیں اس وقت تک ایک بالشت بھر زمین بھی ریفی علاقہ کی مسخر نہیں کی جا سکی اور عجب نہیں، بہت جلد حق و باطل کا آخری فیصلہ ہو جائے۔ اسی طرح شام میں شجاع اور جانفروش دروزیوں کی قومی حرکت کیسی شاندار اور امید افزا ہے! بہادر دروزیوں کی حرکت پہلے صرف جبلِ حوران کے قبائل ہی میں محدود تھی۔ لیکن دمشق کی ہولناک بربادی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب تمام آبادی ان کے ساتھ شامل ہو گئی ہے اور غوطہ کے مرغزاروں سے لے کر جبلِ حوران کی سنگلاخ گھاٹیوں تک استقلال یا موت کا نعرہ بلند ہے نہیں کہا جا سکتا آئندہ حالات کیا صورت اختیار کریں، تاہم یہ تو واضح ہے کہ شام نے اپنے مقصد کی طرف عزم و ہمت کا قدم اٹھا دیا ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ سفر جلد طے ہو اور اب یا کسی قریبی مستقبل میں منزلِ مقصود تک پہنچ جائے۔ ہندوستان بھی اسی منزل کا ایک پا شکستہ رہرو ہے۔ اس کے دل کی آرزومندیاں اور روح کی بے چینیاں اپنے برادرانِ شام کی کامیابیوں کی راہ تک رہی ہیں۔

ایران کے نئے انقلاب میں خاندانِ قاچاریہ کی شاہیت کا خاتمہ یقیناً ایک ایسا واقعہ ہے، جس کا تمام مشرق خیر مقدم کریگا۔ یہ سلسلہ حکومتِ ایران کے عہدِ تنزل کی ایک پیداوار تھا۔ اس لیے شخصی حکومت کے بدترین مفاسد اس کے خمیر میں داخل تھے۔ اس کی پوری تاریخ اس عظیم سرزمین کے مصائب کی ایک مسلسل داستان ہے۔ یہ داستان جس قدر جلد ختم ہو جاتی، بہتر تھا۔ لیکن دنیا کو عرصہ تک انتظار کرنا پڑا۔ البتہ یہ انقلاب کیسا شاندار اور مکمل ہوتا، اگر ایک نئی شاہیت کے آغاز کی جگہ ہم ایران کی جمہوریت کا اعلان سنتے!

کرلی ہے کہ ان کے لیے صرف مرکزی خلافت کمیٹی بھی کافی ہو سکتی ہے لیکن مجھے اس سے انکار ہے کہ ہندستان کی سیاست و عمل کی زندگی میں مسلمانوں کو پیچھے ہٹنا چاہیے۔ اور میں محسوس کرتا ہوں کہ بحالتِ موجودہ اگر وہ کارکن حلقہ باقی نہ رہا، جو خلافت کمیٹی کے نام سے پہچانا جاتا ہے تو لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ مسلمانوں کی جماعتی سرگرمیوں کو آگے بڑھنے کی جگہ پیچھے ہٹنے کے لیے چھوڑ دیا جائے اور گذشتہ تحریک نے اعتقاد و عمل کی جو ایک خاص آب و ہوا پیدا کردی ہے، وہ ایک عرصہ تک کے لیے معدوم ہو جائے۔ ذرا تفصیل کے ساتھ غور کیجیے کہ موجودہ صورتِ حال کیا ہے؟ خلافت کمیٹی کو صرف اس کے نام میں نہیں دیکھنا چاہیے۔ نام تو صرف اس تختی کا سوال ہے جو اس کے دروازے پر لٹکا دی جاتی ہے۔ دراصل خلافت کمیٹی مسلمانوں کے اس کارکن حلقہ کی نمائندگی کرتی ہے جس کے عقائد و اعمال کی چند خاص خاص خصوصیتیں ہیں اور انھی خصوصیتوں کی بنا پر اس کا ایک خاص حلقہ ملک میں قائم ہو گیا ہے۔ یہ حلقہ مسلمانانِ ہند کی جماعتی زندگی میں ۱۹۲۰ء کی ایک نئی کڑی پیدا کرتا ہے جو ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک کے دماغی تغیرات کا قدرتی نتیجہ تھی۔ اگر یہ کڑی نکال دی جائے، تو مسلمانوں کی سیاسی و عملی سرگرمی کی رفتارِ ترقی میں سے ایک منزل گم ہو جائیگی۔ جہاں تک ہندستان کا تعلق ہے، اس حلقہ کی بڑی خصوصیت جو اسے دوسرے حلقوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ یہ ہیں کہ یہ ہندستان کی آزادی و نجات پر جو متحدہ قومیت کے ذریعہ حاصل ہوگی، یقین رکھتا ہے۔ موجودہ صورتِ حال کی بدقسمتی اس کام میں کتنی ہی دشواریاں پیدا کردے لیکن وہ تیار نہیں کہ اس نصب العین سے دستبردار ہو جائے۔ وہ مسلمان کے جماعتی حقوق و فوائد کا تحفظ ضروری سمجھتا ہے، لیکن اس طریقِ عمل سے انکار کرتا ہے کہ مسلمان ہندؤوں کے طرزِ عمل سے روٹھ کر اجنبی حکومت کی آڑ پکڑلیں اور ان کی ہستی ہمیشہ ملک کی قسمت کے لیے ایک دھمکی کی طرح استعمال کی جائے۔ اگر ہندؤوں سے انھیں منصفانہ طرزِ عمل کا مطالبہ کرنا ہے، تو پوری قوت سے کرنا چاہیے لیکن ساتھ ہی ضروری ہے کہ ہماری باہمی آویزش ملکی جنگ کے میدان سے ہمیشہ

میں بھی کہنا چاہتا ہوں کہ بحالتِ موجودہ ہماری ملکی سرگرمیوں میں خلافت کمیٹی کی نوعیت کیا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس بارے میں صاف اور واضح خیالات کی ضرورت ہے۔ خلافت کمیٹی جس وقت قائم ہوئی تو دو مقصد اس کے پیشِ نظر تھے: مسئلہ خلافت کے لیے ملک میں عام جدوجہد جاری رکھنا اور مسلمانوں میں خصوصیت کے ساتھ ملکی آزادی کے لیے سرگرمی پیدا کرنا۔ اس آخری مقصد کی ضرورت اس لیے پیش آئی تھی کہ اس راہ میں مسلمانوں کے قدم بہت پیچھے تھے۔ اس لیے ضروری تھا کہ خصوصیت کے ساتھ ایک جماعت ان میں سرگرمی پیدا کرتی رہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ جہاں تک مسئلہ خلافت کا تعلق ہے کوئی ایسی جدوجہد موجود نہیں ہے جس کے لیے تمام ملک میں ایک مستقل نظام کی ضرورت ہو اور جو مسائل درپیش ہیں ان کے لیے صرف مرکزی کمیٹی کافی ہے۔ باقی رہا دوسرا مقصد، تو کہا جا سکتا ہے کہ اس کے لیے بھی اب ضروری نہیں کہ خلافت کمیٹی کے نام سے تمام صوبوں اور ضلعوں میں کوئی نظام قائم رکھا جائے۔ مسلمانوں میں جو لوگ ملک کی موجودہ افسردگی اور ہندو مسلم نااتفاقیوں سے پریشانِ خاطر ہو چکے ہیں، وہ تو آگے کی طرف دیکھنے کے لیے کوئی نگاہ نہیں رکھتے؛ اور جب پیچھے دیکھتے ہیں تو انھیں خیال ہوتا ہے کہ خلافت کمیٹی کی جگہ سے ہٹ کر کیوں نہ کوئی نیا نظام قائم کر لیا جائے؟ یا کم از کم کوئی پچھلا نظام ہی کیوں نہ از سرِ نو زندہ کر لیا جائے؟ جن لوگوں کی پریشان خاطری اس حد تک نہیں پہنچی ہے کہ اپنے گذشتہ اصول و عقائد سے دستبردار ہو جائیں، وہ اگرچہ دوسرے مقصد سے انکار نہیں کرتے تاہم وہ بھی محسوس کرنے لگے ہیں کہ اگر خلافت کمیٹیوں کے لیے ملک کے اندر کوئی معیّن اور جاری کام نہیں ہے تو پھر یہ پورا کارخانہ کیوں کر قائم رکھا جا سکتا ہے! اور اگر نہیں رکھا جا سکتا تو کیوں قائم رکھا جائے؟

حضرات!

مجھے آخری خیال کے وزن سے انکار نہیں، مگر میں پہلے سے بھی متفق نہیں ہو سکتا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ جہاں تک باہر کے اسلامی مسائل کا تعلق ہے، معاملات نے ایسی صورت اختیار

کیا ہے؟ یہ ہے کہ آپ اپنے ملک کے اندر بدستور قید و بند کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ آپ کی حالت، صرف آپ کی نجات کی راہ ہی میں نہیں، بلکہ تمام ایشیا اور مشرق کی راہ میں روک ہے۔ پس ضروری ہے کہ آپ کی قوتیں اب ملک کی اندرونی خدمات کے لیے وقف ہو جائیں: بحیثیت ملک کی ایک بڑی جماعت کے مسلمانوں کی تعلیمی، معاشرتی اور عام دماغی اصلاح و ترقی کا کام ہر حال میں ایک مقدّم اور ناگزیر فریضہ ہے۔ اگر ملک کے سامنے سیاسی حرکت کے لیے کوئی عملی پروگرام موجود نہیں اور بحالتِ موجودہ جس قدر بھی زیادہ سرگرمی جاری رکھی جا سکتی ہے اس میں نیشنل کانگریس مشغول ہے، تو چاہیے کہ یہ موقع ہم کسی صحیح تعمیری کام میں صرف کر دیں۔ یہ واقع ہے کہ ہم نے ۱۹۲۰ء کی حرکت سے پہلے کوئی مہلت ایسی نہیں پائی کہ عوام کی اصلاح و ترقی کے لیے چار پانچ سال تک کوئی بھی سرگرمی جاری رہی ہوتی۔ اس کا افسوسناک نتیجہ آج ہم اس ردِّ فعل (ری ایکشن) میں دیکھ رہے ہیں، جس نے اچانک تمام ملک کو انتشار اور افسردگی کے حوالہ کر دیا ہے۔ اب اگر ہم اور کچھ نہیں کر سکتے تو کم از کم آیندہ چند سالوں میں وہی کام انجام دے لیں، جو گزشتہ چند سالوں کے اندر نہیں کیا گیا۔ اگر ہم اس کام میں تھوڑی سی بھی کامیابی حاصل کر سکتے، تو یہ مسلمانوں کے لیے بحیثیت ایک جماعت کے اور ملک کے لیے بحیثیتِ مجموعی ایک عظیم الشّان خدمت ہو گی۔ میرا خیال تھا کہ اس کام کا ایک بڑا ٹکڑا جو بغیر کسی جماعتی خصوصیت کے کیا جا سکتا ہے، آل انڈیا کانگریس اپنے ہاتھ میں لے لے۔ لیکن اگر کانگریس سرِدست کوئی ایسا کام شروع نہیں کر سکتی، تو ملک کی تمام جماعتوں کو چاہیے کہ اسے اپنے اپنے حلقوں میں شروع کر دیں۔ اگر خلافت کمیٹیوں کا نظام کسی ایسے کام میں مشغول ہو جائے، تو پھر میں یقین کے ساتھ کہوں گا کہ ان کے غیر ضروری ہونے کا کوئی سوال درپیش نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ آپ نے گزشتہ سال ایک پروگرام منظور کیا تھا جو آپ کے ریکارڈ میں موجود ہے۔ اس میں کام کی متعدد دفعات جمع کی گئی ہیں۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ وہ اپنی موجودہ شکل میں

الگ رہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ عمل اور سرگرمی کے ان ابتدائی اور بیسود طریقوں پر وہ قطعاً اعتقاد نہیں رکھتا، جنھیں ۱۹۲۰ء کی تبدیلی کا دروازہ بند کر چکا ہے۔ کوئی میدان ہو، وہ یقین کرتا ہے کہ جدوجہد کی اصلی روح قربانی و ایثار اور عملی اقدام ہے۔ گزشتہ تحریک ملک کی قوتِ عمل کے لیے ایک پورا امتحان تھی۔ جن جن قدموں میں چلنے کی سکت تھی، وہ چل اٹھے۔ جو نہ چل سکے، انھوں نے ثابت کر دیا کہ اسباب کچھ ہوں، لیکن ان کے لیے چلنا مشکل ہے۔ اب جو حلقہ مسلمانوں میں ہر جگہ خلافت کمیٹی کا سمجھا جاتا ہے، یہ گویا مسلمانوں کی موجودہ قوتِ عمل کا خلاصہ ہے۔ اگر موجودہ دور میں کسی طرح کی بھی عملی سرگرمی جاری رکھنی ہو، تو یہ ناگزیر ہے کہ اسی مواد سے کام لیا جائے۔ اس سے باہر کوئی ایسا مواد موجود نہیں، جو کسی طرح کی عملی سرگرمی شروع کر سکے۔

میں اس وقت دلائل اور تفصیل سے کام نہیں لونگا کیونکہ میں سمجھتا ہوں، میرا مدعا ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ کیا آپ اس کی ضرورت نہیں محسوس کرتے کہ مسلمانوں میں اعتقاد اور فکر کا یہ مذہب (اسکول)، قائم رکھنا چاہیے؟ میں تو محسوس کرتا ہوں کہ اس کی ضرورت ہے اور اگر یہ حلقہ سرِ دست اپنی جگہ خالی کر دے تو صرف اتنا ہی نہیں کہ وہ خالی رہیگی، بلکہ ایسی جماعتیں آگے بڑھ آئیں گی، جن سے نہ تو کسی طرح کی صحیح عملی سرگرمی کی امید کی جا سکتی ہے، نہ وہ آگے کی طرف کوئی نگاہ رکھتی ہیں۔ اگر مسلمان موجودہ انتشار اور افسردگی کے وقفہ میں اور کچھ نہیں کر سکتے تو کم از کم انھیں پیچھے تو نہیں دیکھنا چاہیے۔

البتہ ایک مسئلہ کا فیصلہ ناگزیر ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ آپ اس کا فیصلہ کر لیں کہ آپ کے لیے اہم ترین کام خود ہندستان کے اندر کی زندگی اور اس کی ضروریات ہیں یا نہیں؟ اگر آپ کا جواب اثبات میں ہو، تو آپ کو غور کرنا چاہیے کہ اس راہ میں کوئی معین اور عملی قدم اٹھا سکتے ہیں یا نہیں؟ آپ نے پانچ سال تک ہندستان کے باہر کے اسلامی اور مشرقی مسائل کے لیے جدوجہد کی اور جس قدر نتائج اس سے نکل سکتے تھے حاصل ہوئے۔ لیکن موجودہ صورتِ حال

۱۹۲۶ء میں کم از کم اتنا بھی کر لیا کہ ہم ایک خاص مقدار کی مفید اور ضروری تعلیم لکچروں کے ذریعہ عوام کے مختلف حلقوں کو دیتے رہے اس کی مسلسل صدائیں ان کے دلوں تک اترتی رہیں اور اس طرح کارکن حلقہ میں اور عوام میں روزانہ خطاب اور مقابلہ کا تعلق قائم ہو گیا، تو غور کیجیے کہ ۱۹۲۶ء کی جماعتی استعداد سے ۱۹۲۷ء کس قدر مختلف ہو گا!

میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو سرِ دست صرف یہ تعلیمی پروگرام اختیار کرنا چاہیے اور اس میں بھی صرف چار چیزوں پر قناعت کر لینی چاہیے۔

۱۔ عوام کے موجودہ طبقہ میں نوشت و خواند کی اشاعت اور اس کے لیے نائٹ اسکولوں کا قیام۔ اکثر صورتوں میں ان کے لیے مساجد کافی ہیں۔

۲۔ عوام کی مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی اصلاح و ترقی کے لیے ایسی تعلیم گاہوں کا اجرا جہاں مرتّب و مسلسل لکچروں کے ذریعہ اس طرح تعلیم دی جائے کہ ہر مہینے کا ایک معیّن کورس ہو اور اس میں ایک خاص مقدار کی مفید اور ضروری معلومات موجود ہوں۔ اس کے لیے بھی اکثر حالتوں میں مسجد بہترین محل ہے۔

۳۔ جہاں تک ممکن ہو، عوام کے لیے قرأت خانوں (ریڈنگ رومز) کا قیام۔

۴۔ کوشش کی جائے کہ جمعہ کے خطبات کی اصلاح ہو اور ان کے ذریعہ ضروری اور مفید تعلیم ہفتہ وار سامعین کو مل سکے۔

اس پروگرام کے نفاذ کے لیے لکچروں اور خطبوں کی ترتیب و اشاعت ضروری ہے اور اس کا خود مرکزی خلافت کمیٹی کو انتظام کرنا چاہیے۔

## روپیہ کی فراہمی:

حضرات!

روپیہ کی فراہمی کے لیے بھی اس وقت تک جو طرزِ عمل چلا آتا ہے میں سمجھتا ہوں، اب اس

آپ کے لیے مفید عمل ہو سکتا ہے۔ آپ کو چاہیے کہ آپ سب سے پہلے اس پہلو پر غور کریں کہ مسلمانوں کی جماعتی اصلاح و ترقی کے لیے بنیادی سطح کونسی ہے اور پھر کوئی ایک معیّن اور واضح اور سہل العمل قدم اس طرف اٹھائیے۔

## ۱۹۲۶ء اور تعمیری پروگرام:

تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے لیے ہر حال میں مقدّم کام عوام کی تعلیم ہے۔ یہی کام سب سے زیادہ ضروری ہے اور اسی کی طرف سے ہمیشہ اغماض کیا گیا ہے۔ تعلیم کے لفظ کو یہاں اس سے زیادہ وسیع معنوں میں لیجیے۔ تعلیم سے مقصود وہ تعلیم ہی نہیں ہے جو قواعد اور منضبط اصول کے ذریعہ مکتبوں اور مدرسوں میں دی جاتی ہے۔ یہ تو دراصل آنے والے عہد کے لیے ہے جنھیں آج پڑھایا جا رہا ہے: وہ کل کام کریں گے۔ لیکن قوم کو اس کی موجودہ حالت میں بلند کرنے کے لیے ضروری ہے کہ موجودہ نسل کی دماغی حالت اور عملی استعداد درست کی جائے۔ وقت کی تمام مشکلات کا یہی علاج ہے۔

ہم عوام میں باہمی اتحاد پیدا نہیں کر سکتے، عملی سرگرمی اُبھار نہیں سکتے، معیشت کی تکلیفیں دور نہیں کر سکتے۔ وقت کی ضروریات کا احساس پیدا نہیں کر سکتے۔ جب تک ان کے فہم و استعداد کے مطابق ان سے ہمارا ایک دائمی ذریعہ خطاب و درس قائم نہ ہو جائے۔ اس کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں۔ موجودہ نسل میں جس کی ابتدائی تعلیم کا زمانہ گزر چکا ہے، نوشت و خواند کی تعلیم عام کرنا اور باقاعدہ و مرتّب تعلیمی اسباق کے ذریعہ جو مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی تعلیمات پر مشتمل ہوں، عوام کی جماعتوں کو مسلسل تعلیم دینا۔

اگر ہم نے اَن پڑھ عوام کی ایک بڑی تعداد میں اتنی استعداد پیدا کر دی ہے کہ وہ اٹک اٹک کر اردو عبارت پڑھ لیں اور غلط سلط اردو لکھ لیں، تو آپ یقین کیجیے کہ ہر طرح کی اصلاح و ترقی کے دروازے جو کسی حال میں بھی نہیں کھل سکتے تھے، ہم نے بہ یک دفعہ ان پر کھول دیے۔ اسی طرح اگر ہم نے

ہمارا وفد اس وقت حجاز میں موجود ہے اور امید ہے کہ اس باب میں اس کے ذریعہ عنقریب مفصّل اطلاعات موصول ہونگی۔ بہت ممکن ہے کہ اس سلسلہ میں بعض اہم خدمات کے انصرام میں مرکزی خلافت کمیٹیاں نمایاں حصہ لیں۔ امید ہے کہ مسلمانانِ ہند کی رائے عامہ ہمیشہ اس کی اعانت میں سرگرم رہیگی۔

## خاتمہ:

حضرات!

آخر میں میرے لیے صرف یہ رہ گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے توفیقِ عمل کے لیے دست بدعا ہوں۔ اگر ہماری نیّتیں اخلاص سے اور ہمارے قلوب عزم سے خالی نہیں ہیں، تو ہمیں راہ کی مشکلات پر نہیں، بلکہ رہنمائے حقیقی کی دستگیری پر نظر رکھنی چاہیے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا وَھَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَۃً [12]

میں تھوڑی سی تبدیلی کرنی چاہیے۔ یہ ظاہر ہے کہ بغیر روپیہ کے کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ حالت زیادہ عرصہ تک چل نہیں سکتی کہ عوام سے روپیہ کی مسلسل طلبی بھی جاری رہے، اور کام کا اعلان اور وعدہ بھی ہوتا رہے۔ ہمیں چاہیے کہ اب ایسا طرزِ عمل اختیار کریں کہ لوگوں کو، روپیہ دینے اور اس کے نتائج تولنے کا صحیح طور پر موقعہ مل سکے۔ اگر آپ اس سال عملی سرگرمی پیدا کرنا چاہتے ہیں تو چاہیے کہ روپیہ کی مسلسل طلبی و وصولی کا طریقہ ملتوی کر دیجیے۔ آج یہاں طے کر لیجیے کہ ۱۹۲۶ء کے کاموں کے لیے خصوصاً اس تعلیمی پروگرام کے لیے آپ کو کم از کم کس قدر روپیہ چاہیے۔ اس کے بعد سال کی پہلی سہ ماہی صرف اس رقم کی طلبی و وصولی کے لیے صرف کر دیجیے۔ خلافت کمیٹی کا تمام نظام تین ماہ تک صرف اسی کام میں مشغول رہے۔ اس عرصہ میں پبلک کا فرض ہے کہ وہ آپ کو روپیہ دے، اور اس کا مطالبہ نہ کرے کہ آپ کام کر رہے ہیں یا نہیں! اس کے بعد کے نو ماہ خالص عمل اور مشغولیت کے ہونے چاہییں۔ ان نو مہینوں کے ہر دن کے لیے آپ پبلک کے سامنے جوابدہ ہونگے۔ سال کے خاتمہ پر وہ فیصلہ کر سکیگی کہ کس قدر آپ کو روپیہ دیا گیا اور کس قدر آپ نے کام انجام دیا۔

## مؤتمرِ حجاز:

حضرات!

۱۹۲۶ء کا دوسرا اہم کام آپ کے لیے مجوّزہ مؤتمرِ حجاز ہے، جس کا پیام دعوت امیر عبدالعزیز آلِ سعود کی جانب سے تمام عالمِ اسلامی کو دیا جا چکا ہے اور خصوصیّت کے ساتھ آپ کے نام بھی پہنچ چکا ہے۔

مؤتمرِ حجاز بجائے خود ایک ضروری کام ہے لیکن حجاز کے مسئلہ نے اس کی ضرورت اور زیادہ اہم کر دی ہے۔ تاریخِ اسلام کو صدیوں کے بعد موقع ملا ہے کہ سرزمینِ حجاز کو اصلاح و عمل کے لیے مستعد دیکھے۔ اس دور کے آغاز کے لیے سب سے پہلا کام موسمِ حج میں مؤتمرِ اسلام کا انعقاد ہے۔

زیادہ اصرار کیا، میں نے معذرت کی لیکن ان کے اصرار کے آگے میری معذرت کو شکست ہوئی میں ان کی بات ماننے پر مجبور ہو گیا۔ معاملہ اسی پر ختم نہیں ہوا بلکہ مزید اصرار کیا گیا کہ میں جلسے میں صدر بنوں، لیکن میں نے اس کے لیے ہر بار معذرت کی پھر بھی اصرار کے آگے جھکنا پڑا اور میں نے وعدہ کر لیا کہ جلسے میں شریک ہو کر کچھ کہہ دوں۔

## تقریر کی قسمیں

ایک ضروری چیز پہلے بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں، یعنی تقریر کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک تقریر تو وہ ہے جس کا مقصد ہے کہ آپ سے اپیل کی جائے، آپ کے دل کو متوجہ کیا جائے، آپکے احساسات کو اکسایا جائے اور آپ کے جذبات سے کھیلا جائے۔ دوسری تقریر وہ ہے جس کا تعلق دماغ سے ہے اس کے لیے ضرورت اس کی ہے کہ آپ کا دماغ اس طرف متوجہ ہو کان سنے، دماغ سوچے اور فیصلہ کرے کہ کہاں تک حقیقت کو پا رہا ہے۔

## تقریر کا مقصد

میں اس لیے پہلے ہی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میری تقریر پُر جوش نہ ہوگی۔ ولولہ انگیز نہ ہوگی۔ آتش بداماں نہ ہوگی۔ بلکہ محض انجمن کے مقاصد کے سلسلے میں کام کی باتیں آپ تک پہنچانے کی کوشش ہوگی، تاکہ وہ آپ تک پہنچ جائے اور آپ غور کریں نیز مجھے یہ کہنے کا خیال یوں بھی ہوا کہ یہ ایسا جلسہ ہے جہاں علما موجود ہیں میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، وہ امور غور و فکر سے متعلق ہیں اس کو دوسرے سے زیادہ بہتر یہی کر سکتے ہیں۔

## انجمن کے مقاصد

مجھے آپ کی انجمن کے مقاصد معلوم نہیں ہیں لیکن جہاں تک معلوم ہیں، وہ یہ ہیں کہ چند

## ۹

# جمعیۃ تبلیغ اہلحدیث

**کلکتہ، ستمبر ۱۹۳۴ء**

برادرانِ عزیز!

قبل اس کے کہ اس موقع پر بعض مطالب، جو میں آپ لوگوں کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں، پیش کروں، میں چاہتا ہوں کہ چند باتیں بطورِ تمہید کہہ دوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس مجمع میں ایسی تعداد موجود ہے جو بے خبر نہیں کہ میں عام مجمعوں میں شریک ہونا نہیں چاہتا۔ کچھ تو صحت کی کمزوری کا اقتضا ہے، اور کچھ طبیعت کی افتاد کہ میری طبیعت دوسری طرف نہیں جاتی۔ یہ یقیناً میری کمزوری ہے، مگر یہ واقع ہے کہ مجھے تھوڑی دیر کے لیے بھی رسمی تقریر کرنا گراں ہوتا ہے۔ اب چند سالوں سے اگر گوارا بھی کرتا ہوں، تو جبر ہے، مگر جبر کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ ان قسموں میں ایک خوشگوار جبر بھی ہے اور ایسا ہی ایک خوشگوار جبر اس موقع پر بھی کیا گیا ہے۔ ان حضرات نے جنھوں نے اس جمعیت کی بنیاد ڈالی ہے، مجھ سے سخت اصرار کیا۔ میں نے معذرت کی، انھوں نے اور

# ایک خیال

میں خود بھی فکر میں تھا کہ جمعیۃ العلما کا ایک جلسہ طلب کیا جائے کہ مسلمانوں کو جلد دعوتِ عمل دے؟ غور کرے کہ معاملہ کیا ہے. مسلمان کدھر جارہے ہیں؟ لیکن کس کی تبلیغ کس کے سامنے؛ کس شکل میں کی جائے؛

اب ایک شکل اجمالی طور پر سب کے سامنے آگئی ہے لیکن یہ موضوع بہت وسیع ہے. موقع ہے اور نہ اتنا وقت کہ اس پر تقریر کرسکوں.

# قرآن پاک کی عظمت

بہر حال میرے عزیزو! اس وقت تو محض یہ دیکھنا ہے کہ اسلام کیا ہے؟ یہ اللہ کی صداقت کا ایک عالمگیر پیغام ہے. ہم تمام کرۂ ارضی پر نظر ڈالیں. اس کرۂ ارضی کی نبض ہاتھ میں لے لیں اور بیماری کی تشخیص کے بعد اس کے سامنے آبِ حیات پیش کریں. تمام قوموں کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ ان کو پیاس کس آبِ حیات کی ہے. لیکن آپ کی نظر محدود اور مسئلہ وسیع ہے. ہم سے کوتاہی ہورہی ہے. ضرورت اس بات کی ہے کہ علمی حیثیت سے مطالعہ کریں کہ دنیا کی حالت کیا ہے؟ اس کو ضرورت کس چیز کی ہے؟ تو کام چل سکتا ہے؟ اور اگر ہم ایسا کریں تو دنیا کی کونسی بات نہیں ہوسکتی کیونکہ دنیا کی تمام قومیں جس چیز کی تلاش میں ہیں، وہ تو آپ کے پاس قرآن میں ہے لیکن حالت یہ ہے کہ ہر گوشے میں اس سے انکار ہے.

# اوروں کا تعصّب اور عوام کی حالت

حقیقتاً ایک شخص جو اسلام کی تعلیم اور دنیا کے حالات سے واقف ہو، حیرت میں رہ جاتا ہے کہ روشنی

اہلِ خیر نے اس کی ضرورت محسوس کی کہ تبلیغِ حقیقت کے لیے انجمن قائم کی جائے۔

## اقدام اور نفسِ عمل

حالات کو دیکھ کر ان تمام حضرات کو مبارکباد دیتا ہوں کہ یہ ایک نہایت مبارک اور مفید اقدام کیا ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کی زندگی کا تعلق ہے، وہ اسلام کی حقیقی تعلیم کی دعوت و تبلیغ ہے آپ کی کوششوں کے اثرات دیکھتا ہوں۔ بحمداللہ آپ نے عظیم الشان جلسہ منعقد کیا ہے۔ مبارک اقدام ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ یہ نہ سمجھے ہوں گے کہ وہ اقدام یہیں ختم ہو جائیگا۔ ضروری ہے کہ آپ کو رُخ بھی معلوم ہو، منازل موجود ہوں، اور منزلِ مقصود بھی پیشِ نظر رہے۔ علما کی جماعت کو دنیا اور ان کے پند و نصائح سے شہریوں کو فائدہ پہنچانا مبارک اقدام ہے مگر نفسِ عمل نہیں ہے، منزلیں آگے آنے والی ہیں۔ لہذا منزل بھی آپ کے سامنے ہونی ضروری ہے۔

رہی اسلام کی حقیقی تعلیم کی تبلیغ و اشاعت، تو عزیزانِ من! ہندستان کے مختلف ادارے اور جماعتیں اس خدمت کو انجام دے رہے ہیں۔ لیکن عام طور پر دیکھا ہوگا کہ ہندستان میں تمام کوششیں صرف سالانہ اجتماع کے انعقاد میں صرف کردی جاتی ہیں۔ اور اقدام عمل، سعیِ طلب اور رفعِ تشنگی کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھتا۔ اگر واقعی صرف تبلیغ پیشِ نظر ہے، تو یہ کافی نہیں۔ کافی ابتدا بھی نہیں۔ ابتدا تو جب ہے کہ اشاعت و تبلیغ کے سلسلے میں یہ بھی سوچا ہو کہ وقت کیا ہے؟ اس کا مطالبہ کیا ہے؟ اس کا رخ کدھر ہے؟ اس کی پیاس کیا ہے؟ آپ کو کس رخ کا جواب دینا چاہیے؟ اس کی تشنگی کو بجھانے کے لیے کیسے گلاس میں آبِ حیات انڈیل کر دینا چاہیے؟ اگر آپ کے سامنے یہ باتیں نہیں، یہ خیال نہیں، تو پھر اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں۔ آپ اگر اسلامی کوشش کرتے ہیں، تو کیجیے۔ بھلائی ہوگی۔ لیکن آپ اسی پر قانع نہ ہو جائیں اور افسوس ہے اگر آپ اسی پر قانع ہو جائیں اسی پر قناعت کر لیں۔

مسلمانوں کے اخلاق و عادات کی اصلاح کی ضرورت ہے، کیا انھیں وہاں حقیقی اسلام کا جلوہ نظر آرہا ہے؟ نہیں، تو اسلام کی تبلیغ کا اہم میدان داخلی ہے۔ کیونکہ ہم سے اس کی جلوہ فرمائی دور ہوگئی ہے، ہماری آنکھیں حقیقی اسلام کے جلووں کو ڈھونڈتی ہیں، لیکن نہیں دیکھتیں اس لیے صورتِ حال کو بدل ڈالنے کے لیے ہم سنبھلیں اور قدم اٹھائیں۔

اسلام کی بیرونی تقویت اور اشاعتِ اسلام خارجی کے لیے ضروری ہے کہ ان میں جو غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں اور پھیلی ہوئی ہیں، ہم ان کو دور کریں۔ اس کے ساتھ ہی یہ اندازہ کریں کہ فکری زندگی کس رُخ جارہی ہے اور وہ کس چیز کی ضرورت محسوس کررہی ہے اس کے بعد ہم ان کی ضرورت کی تمام چیزیں اسلام کے خزانے سے نکال کر ان کے سامنے رکھ دیں، تو ممکن نہیں کہ وہ کسی اور چوکھٹ پر سر جھکا دیں۔

## اسلام کی مخالفت کا آغاز

بڑی مشکل یہ ہے کہ دنیا میں سب سے بڑی قوم عیسائیوں کی ہے اور یہ معلوم ہے کہ مختلف اسباب ایسے پیدا ہوئے کہ مختلف سیاسی جماعتوں کو مسلمانوں اور اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس ضرورت کے ماتحت انھوں نے اس پروپیگنڈے پر اپنی ساری جدوجہد ختم کردی اس پروپیگنڈے کا آغاز حروبِ صلیبیہ سے ہوتا ہے۔

یورپ میں تحریک ہوئی کہ بیت المقدس کو مسلمانوں کے ہاتھ سے لے لیا جائے کیونکہ بیت المقدس سیّدنا حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کا مولد ہے اور یورپ کی بڑی قومیت عیسائیوں پر مشتمل ہے۔ اسی تحریک کے زیرِ اثر تیس سال کے اندر بیت المقدس پر آٹھ حملے کیے گئے۔ آخر میں صلاح الدین ایّوبی نے اس کو ختم کیا

### غلط بیانی

لیکن یہ فتنہ دبا نہیں، بڑھتا ہی گیا مسلمانوں پر غلط الزام لگائے تاکہ ان کی طرف سے بدظنی

ہونے پر بھی دنیا اس کا اعتراف نہیں کرتی۔ اس زمانے میں حکومتیں اور جماعتیں متعصب ہیں۔
لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عوام میں علم کی وسعت نے، عقلی نشوونمانے، سائنس کی روشنی نے یورپ و امریکہ میں ہزاروں نہیں بلکہ کروڑوں بے تعصب انسان پیدا کر دیے ہیں۔ ان میں اتنی سچائی ہے کہ ہر حقیقت کو مان لیتے ہیں۔ بلاشبہہ ان کے اداروں میں اب بھی وہی تعصب کام کر رہا ہے لیکن افراد اپنی چیزوں پر بھی نکتہ چینی کرتے ہیں، اور غیروں کی بھی اچھی چیزوں کو مان لیتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اسلام عالمگیر صداقت کے ساتھ موجود ہے اور وہ متوجہ نہیں ہوئے؟ پھر دنیا جس کو ڈھونڈتی ہے، وہ اسلام کے سوا کچھ نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی کوئی حرکت ایسی نہیں ہوتی، جو ان کو اپنی طرف متوجہ کرے۔ لوگ اس برکت سے محروم ہیں۔ ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں نگاہیں روشنی کی تلاش میں بھٹکتی پھر رہی ہیں، روشنی سامنے ہے، اور وہ نہیں دیکھتے، کیوں؟ روشنی تو ایسی چیز ہے جو دور ہی سے نظر آئے۔ لیکن روشنی پر اگر چادر ڈال دیں، تو روشنی باہر نہیں نکلیگی۔

میں صاف کیوں نہ کہوں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام تمام سچائیوں کے باوجود لوگوں کی غلط فہمیوں کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ اس کے متعلق غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں، پھیلی ہوئی ہیں اور پھیلائی جا رہی ہیں، اور وہ ذوقِ طلب پیدا نہیں ہوتا، جو ہونا چاہیے تھا۔ اب ضرورت اس کی ہے کہ مدتوں کی لپٹی ہوئی چادر کو ہٹا دیا جائے تاکہ روشنی کو سب دیکھ سکیں اور پروانوں کی طرح اس سے لپٹ جائیں۔

## تبلیغِ اسلام کے دو میدان

تبلیغِ اسلام کے لیے دو میدان ہیں: ایک خارجی، دوسرا داخلی۔ خارجی میدان وہ ہے کہ جہاں غیر مسلم قومیں ہیں، جہاں غیر مسلمین میں تبلیغ کرنی ہے۔
داخلی سے مقصود یہ ہے کہ جہاں تک مسلمانوں کے اعمال و عقائد کا تعلق ہے، جس میدان میں

وہ غلط فہمیوں سے پُر اور غلط فہمیاں پیدا کرنے والی تھیں مبلّغین کے گروہ آئے۔ تبلیغ و اشاعت کے ادارے قائم ہوئے۔ اسلامی ممالک میں عیسائیت کی تبلیغ شروع ہوئی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان کی تیار کردہ کتب از سرتا پا غلط تھیں۔ یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اگر مقدمہ غلط نہ تھا، تو تشریح غلط ضرور تھی۔

## ہندستان میں مسیحیّت کی تبلیغ

انیسویں صدی میں ہندستان میں عیسائیت کی تبلیغ کے لیے ایک ادارہ قائم کیا گیا یہ وہی زمانہ ہے جب مسلمانوں میں بیداری کی جنبش پیدا ہوئی۔ مولوی محمد حسن[1] اور ڈاکٹر وزیر خان[2] سینہ تان کر مدافعت کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر وزیر خان نے انگریزی زبان سیکھی، کتابوں کا مطالعہ کیا اور پادری فنڈر[3] سے مناظرہ ہوا۔

اس وقت پادریوں نے جس شکل میں اعتراضات کیے تھے، وہ موجودہ یورپ کی ترجمانی نہ تھی۔ موجودہ دَور کے یورپ نے چرچ کو شکست دے کر مذہب کا چولا اتار پھینکا ہے۔ مادّی اور عقلی نشو و نما کا دَور ہے اور وہ مذہب کو کسی حال میں بھی ماننے کو تیار نہیں۔

## مسلمان اور تبلیغِ اسلام

لہٰذا تبلیغِ اسلام کے لیے مسلمانوں کو دوسری صورتیں اختیار کرنی چاہییں۔ عیسائی مشنریوں کا نمونہ سامنے موجود ہے۔ دیکھو، وہ کس طرح مذہب کی اشاعت کیا کرتے ہیں۔ جس زمانے میں ہندستان میں تعلیم کا نیا دور شروع ہوا، اسی زمانے میں مصر اور ترکی میں بھی یہی مشنری اپنا کام کرنے لگے۔ لیکن ترکی میں اسلامی حکومت کی وجہ سے اپنے ارادوں میں ناکام رہے۔ البتہ مصر اور ہندستان میں انھوں نے اپنا کام جاری رکھا۔ عیسائیوں کے اعتراضات مسلمانوں اور اسلام پر ہوتے رہے۔ یورپ کا ذہن اور اس کی مشنری الگ ہیں ہر گروہ برابر حملے کرتا رہا، سبھوں

اور غلط فہمیاں پھیلیں۔ تمھیں ان الزامات کو سن کر حیرت ہوگی۔ کہا گیا کہ مسلمان ایک بُت پرست قوم ہے اور محمد ایک سونے کا بت ہے جو مدینے میں رکھا ہوا ہے۔ توحید سے انھیں کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ ایک ایسی قوم ہے جو دنیا میں صرف لوٹ مار کر کے اپنا پیٹ بھرنا چاہتی ہے۔ اب اس قسم کا پروپگنڈا نہیں ہوتا کیونکہ خود وہاں مذہبی اداروں کی حالت خراب ہے۔ خود اپنے متعلق کچھ کہنے کھڑے ہوتے ہیں تو عوام یہ کہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ یہ پاگل ہو گیا ہے۔ لیکن صدیوں کا زمانہ گزر چکا، ان زہریلے خیالات کی اشاعت کی صدا کے بازگشت اب تک یورپ میں موجود ہے۔ اور یہ زہریلا پروپیگنڈا کہ اسلام جو دراصل انسانیت کے لیے آبِ حیات ہے زہر ہے، ان کے لٹریچر کا اہم جزو بن گیا ہے، ضرب المثلین قائم ہو گئی ہے۔

## سولھویں صدی میں دورِ جدید

پھر سولھویں صدی کا وہ زمانہ آیا کہ یورپ میں موجودہ تہذیب کی پیدائش ہوئی اور وہاں کے اداروں نے محسوس کیا کہ قرآن کا ترجمہ کیا جائے۔ اشاعت و تعلیم کا کالج قائم کیا گیا۔ شام سے اہلِ علم عیسائیوں کو بلایا گیا۔ قرآن کا تفسیر کے ساتھ لاطینی زبان میں ترجمہ شایع ہوا۔ لاطینی اس وقت یورپ کی علمی زبان تھی، اس لیے لاطینی میں ترجمہ ہوا۔ اور یہی عربی کا پہلا ٹائپ ہے، جس میں پہلی مرتبہ یورپ میں قرآن شائع ہوا۔ اب حالت پہلی جیسی نہ تھی، لیکن اداروں اور مدرسوں میں پڑھنے والوں کی باگ انھیں کے ہاتھ میں تھی۔ اس لیے اعمال کی تعبیر جس حال میں کی گئی وہ برائیوں سے خالی نہ تھی، وہ اثرات ضائع نہ ہونے پائے۔ ان کا سلسلہ قائم رہا۔ اور یہ حالت سترھویں صدی تک قائم رہی۔

## انگریزی ہندستان میں

اس کے بعد انگریز ہندستان میں آئے۔ مسلمانوں سے ملے پھر بھی جو کتابیں اسلام کے متعلق لکھی گئیں،

کے لیے نکاح کی طرح طلاق بھی ضروری ہے۔ بلکہ وہاں کی نئی پود نے تو اکتا کر چرچ سے کھلم کھلا بغاوت کر کے ایک دوسرا طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ اور وہ طریقہ وقتی نکاح کا ہے۔ ایک مدّت کے لیے نکاح کر لیتے ہیں، اور دیکھتے ہیں کہ اگر اچھی طرح نبھ جاتی ہے تو پھر قائم رکھتے ہیں، ورنہ اس رشتے کو توڑ ڈالتے ہیں۔

## سرسیّد کا اخلاص

یہی اعتراضات ہندستان میں بھی عیسائی مشنریوں نے اسلام پر کیے تھے، اور سب سے پہلے مخلص مسلمان سرسیّد تھے جنھوں نے عیسائیوں کے اعتراضات کا جواب دینے کی سخت کوشش کی۔ لیکن انھیں سمجھانے کے لیے انھوں نے مذہب سے زیادہ عقل سے کام لیا۔ اور اسلام کی حقیقی تعلیم سے علیحدہ ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ عیسائی پادریوں کے اعتراضات کو مذبذب طور پر لوگوں نے مان لیا اور اسلام کی تاویلیں شروع ہو گئیں۔ اور یہ مسئلہ مذبذب بن کر رہ گیا اور اس یورپ کا جس کی روشنی میں یہ سب تاویلیں ہوئیں، حال یہ ہے کہ سب سے بڑی پیاس تعددِ ازدواج اور مسئلۂ طلاق کا فیصلہ کرنا ہے اور یہ فیصلہ بہترین صورت میں تمھارے پاس موجود ہے کاش کہ تم ان کے سامنے پیش کرو!

## مغرب کے سامنے کیا پیش کرنا چاہیے

ان کے سامنے پیش کرنے کے لیے تمھیں کسی معجزے کی ضرورت نہیں۔ یورپ مذہبی زنجیروں کو توڑ کر عقلی دَور میں شریک ہو چکا ہے۔ یورپ کے موجودہ دَور کا معیار وہ نہیں ہے جو بدقسمتی سے ایشیا اور مشرق کے علما نے سمجھ رکھا ہے۔ جب تم ان کے سامنے اسلام پیش کرو گے، تو وہ یہ نہیں دیکھینگے کہ معجزات ہیں یا نہیں۔ بلکہ وہ اپنی پیاس بجھانے کے لیے سرد پانی اور اپنی بیماری کے لیے تریاق کی جستجو کریگا؛ وہ ڈھونڈیگا کہ جس چیز کی اس کو ضرورت ہے وہ ہے یا

کو جوابات دیے گئے۔ جن میں بہت سے اداروں نے جوابات کو مان لیا اور خاموش ہو گئے۔ کہیں اُن کے دوسرے ساتھی برابر اپنے کاموں میں مشغول رہے اور ان سب کا جواب اسلام میں بیک وقت موجود ہے مثلاً:

## مسئلۂ طلاق اور یورپ

عیسائی کہتے ہیں کہ ایک مرد کے لیے ایک وقت میں ایک ہی عورت کی ضرورت ہے اور ایک ہی رشتے میں دلفریبی اور خوشنمائی پیدا کی گئی ہے اس لیے طلاق غلط ہے گناہ ہے، ایک الٰہی رشتے کو قطع کرنا ہے یہ ان کا مقدمہ ہے۔

لیکن برخلاف اس کے نہ تو اسلام اس کو مقدس اور الٰہی رشتہ قرار دیتا ہے اور نہ اس کے انقطاع سے منع کرتا ہے بلکہ اس کو محض ایک مرد اور عورت کے درمیان زندگی نباہنے کے لیے ایک معاہدہ تصور کرتا ہے لیکن واجبات اور فرائض کے ساتھ۔ اگر اس معاہدے سے فرائض اور واجبات ادا نہیں ہوتے، تو پھر اسلام کے نزدیک یہ معاہدۂ اشتراک سوسائٹی کے لیے تعذیب ہے اس لیے اسلام حکم دیتا ہے کہ جب ایسا موقع آجائے تو علیحدہ ہو کر چھٹکارا حاصل کر لو اور زندگی خوشگوار بنانے کے لیے نیا اپنا رشتہ اختیار کرو تاکہ دونوں کی زندگی راحت و سکون سے گذر سکے۔ کیونکہ اس معاہدے کا اس اشتراکِ جنسی کا مقصدِ واحد راحت و سکون کی زندگی گذارنا ہے تو جب ایسی زندگی نہ گذر رہے تو زبردستی دونوں کو ساتھ رکھنا ظلم نہیں، تو اور کیا ہے۔ اس لیے طلاق بھی نکاح کی طرح راحت و سکون کے لیے ضروری ہے۔

لیکن مسیحیت اس سے بالکل مختلف ہے خواہ راحت کی تلاش میں ایک بیوی سے وابستہ ہو کر تم پہلی راحت کو بھی کھو دو لیکن پھر گئی ہوئی راحت کو حاصل کرنے کے لیے تم اس سے الگ نہیں ہو سکتے۔

آج یورپ میں سب سے بڑا معاشری مسئلہ جس کی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے وہاں کا بڑے سے بڑا دماغ مصروف اور پریشان ہے وہ مسئلہ نکاح اور طلاق کا ہے وہ محسوس کر رہے ہیں کہ قومی ترقی

لیکن تم نے کبھی اس پر غور بھی نہیں کیا، اپنی اجتماعی زندگی کے انتشار کو ختم کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔

## یورپ والوں کی تلاش حق

یورپ کی قومیں ہیں کہ عمل کو اپنا رہبر اور عقل کو اپنی راہ کی روشنی بنا رہی ہیں، اور اس کے لیے ہمیشہ کوشاں ہیں کہ کوئی لائحہ عمل مل جائے۔ سب سے پہلے انھوں نے ایک نسخہ روما سے لیا۔ لیکن وہ ناکام ثابت ہوا۔ دوسرے دور میں انقلاب فرانس، اور امریکہ کی آزادی نے انھیں جمہوریت کا پیغام سنایا۔ اس پیغام سے انھوں نے دوسرا نسخہ حاصل کیا اور اس کا استعمال بھی کیا لیکن نصف صدی کے اندر ہی اندر یہ بھی ناکام ثابت ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے طرح طرح کے نسخے تجویز کیے۔ ایک نسخہ رُوسُو کا تھا دوسرا کارل مارکس کا تھا۔ اور اسی طرح کے بہت سے حکیموں نے نسخے تجویز کیے۔ لیکن سب کے سب ناکام رہے۔ اور وہ اب بھی نئے نسخے کی تلاش میں سرگرداں ہیں، اور مختلف نسخوں کو آزما رہے ہیں۔ لیکن ہر ایک نسخہ غلط ثابت ہو رہا ہے۔

## نسخہ تمھارے پاس ہے

اور وہ نسخہ تمام صحت کے ساتھ تمھارے پاس ہے۔ تم اسے ان کے سامنے پیش کرو، وہ منظور کرلینگے۔ عزیزانِ من! یہ غلطی نہ کھاؤ کہ مسیحی پادریوں کا مشن یورپ کا ترجمان ہے، اور یورپ تمھاری چیزوں کو منظور نہیں کر سکتا۔ یورپ کے مسیحی مبلغین اپنے منتشر شیرازے کو جمع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ یورپ میں اپنے لیے جگہ نہ پاکر دوسرا میدان تلاش کر رہے ہیں۔

## مسیحی مبلغین یورپ کے ترجمان نہیں

اب ضرورت اس کی ہے کہ مسلمان اسے خوب سمجھ لیں کہ یہ غلطی جو اُن کے دماغوں میں حلول

نہیں؛ اور جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ صرف عیسائیت کی نہیں بلکہ اس کے دامن میں ساری دنیا کی نجات ہے۔ ساری دنیا کی بیماریوں کے تریاق کا سرچشمہ اس کی آغوش میں بہہ رہا ہے۔ دنیا کو صلائے عام دو، اور اس صورت میں کہ وہ تمھاری طرف جھک جائے۔ تمھارے پاس تو ایک گھونٹ میں اس کی ساری بیماریوں کا علاج ہے۔ جب تم اس صورت میں پیش کرو گے کہ وہ سمجھ سکے، تو ضرور جھکیگی۔

## اسلام کی تعلیم کس طرح پیش کی جائے؟

اب سنو! یورپ کا معیار یہ ہے کہ وہ جلد از جلد سوسائٹی کے تمام مسائل کو حل کرنا چاہتا ہے۔ وہ ایسے لائحہ عمل کی تلاش میں ہے کہ جس کے ذریعہ سے زندگی امن و صحت کے ساتھ بسر ہو سکتی ہے۔ وہ رکاوٹیں جو راہ میں حائل ہو جاتی ہیں، باقی نہ رہیں۔ تو اس کی صورت صرف یہ ہے کہ اسلام کی تعلیم کو پیش کرو، لیکن اس سے پہلے اس مسئلہ کو حل تو کرو کہ یہ تعلیم کن صورتوں میں پیش کی جائے، اس کے لیے قدم بڑھانا چاہیے، اس میں نقصان نہیں، کوئی برائی نہیں۔ اگر تعلیم انسان کے لیے ہے، اور اس لیے ہے کہ زمین پر بسنے والے اس پر عمل کریں، تو اسی حالت میں، اسی صورت میں پیش کرو کہ وہ اسے دیکھ کر گھبرا نہ جائیں۔ اور اگر اس لیے ہے کہ اس پر فرشتے عمل کریں، تو تمھیں اختیار ہے۔

## ناکامیوں کا علاج

سوچو اور غور کرو۔ جو چیزیں تمھیں اس راہ میں ناکام بنا دیتی ہیں، وہ کیا ہیں؟ کس وجہ سے ہماری اجتماعی زندگی منتشر اور پراگندہ ہو رہی ہے اور اس کا حل کیا ہے؟ اس کا حل صرف قرآن کی تعلیم پر ہے۔ قرآن خود سوسائٹی کے معیار کی پرکھ کے لیے یہ کسوٹی بتاتا ہے کہ دیکھا جائے کہ اس سوسائٹی نے اپنی اجتماعی زندگی کے مسائل اور راہ میں آنے والی مشکلات کا حل کس طرح کیا!

پیشتر رسول عربی صلعم نے پیش کیا تھا اور تیرہ سو سال سے متعصّب نگاہیں اس میں سخت سے سخت نکتہ چینی کرتی رہیں، متعصّب دماغ اس کی مضبوط جڑوں کو ہلانے کی کوشش کرتے رہے لیکن کیا وہ اپنی لاحاصل کوششوں میں کامیاب ہوئے ؟ یا کامیاب ہو بھی سکتے ہیں ؟

## اسلام کا سب سے بڑا معجزہ

اسلام کا سب سے بڑا معجزہ یہ ہے کہ اس کا ظہور عرب میں ہوا۔ اس کی پہلی کرنیں وہاں پھیلیں جہاں سخت ظلمت و تاریکی تھی۔ نہ حقیقت کی روشنی کہیں نظر آتی تھی اور نہ ان کی تاریکی پسند نگاہیں اس کو دیکھنا ہی چاہتی تھیں۔ عرب کا ہر فرد خود کو نوشیرواں اور خسرو سے کم نہ سمجھتا تھا۔ جماعتی گھمنڈ اتنا زیادہ تھا کہ ہر قبیلہ اپنے سوا دوسروں کو ذلیل سمجھتا تھا اب تم آنکھیں کھول کر دیکھ لو، علم کی روشنی میں وہی حال یورپ کا ہے یا نہیں۔

## عرب کی حالت

نسلی شرف کا یہ حال تھا کہ ہر شخص اپنے قبیلہ پر اتنا زیادہ مغرور تھا کہ اگر خود دو چار خون بھی کر دیتا تھا۔ تاہم دوسرے کے بدلے چار خون کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔

## اسلام کے ظہور کے اثرات

اسلام کا ظہور اس وحشی قوم میں ہوا اور تئیس برس کی مختصر مدّت میں اس نے سارے عرب میں کچھ کا کچھ کر دیا۔ قرآن کے درس نے ان کے دلوں میں رشک و حسد کی دہکتی ہوئی آگ کو محبت کی چھینٹیں دے دے کر ٹھنڈا کر دیا۔ اسلام نے اتنی کم مدّت میں سب کچھ اس ملک میں کیا جہاں کے بہادر اپنے سے نیچے کے ہاتھ سے میدانِ جنگ میں بھی مرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہاں اجلۂ سادات قریش کا سردار ایک غلام کو بنایا جاتا ہے اور ابوبکرؓ اس کی رکاب تھامے چلتے ہیں۔

کر گئی ہے کہ یورپ کے ترجمان عیسائی مبلغین ہیں اور یورپ ان ہی کے ذریعہ سے اپنی بیماری کا علاج ڈھونڈ رہا ہے، غلط ہے۔ سوسائٹی کے مسائل کا حل جس کی تلاش میں یورپ پریشان ہے، سوائے قرآن کے اور کہیں نہیں ہے۔ اور اگر تم اس آبِ حیات کو اس کے سامنے پیش کرو گے، تو یورپ قبول کرلیگا۔ وہ نسخوں کو تلاش کرتے کرتے تھک چکا ہے۔ اس کی پیاس اب تک نہیں بجھی، اور اب وہ اس نسخے پر جھکنے کے لیے مجبور ہوگیا ہے۔

## جمہوریت کا مفہوم

جمہوریت کے معنی یہ ہیں کہ طاقت واقتدار چند افراد کے ہاتھ میں نہیں، پوری قوم کے ہاتھ میں رہے۔ اور مساوات کے معنی یہ ہیں کہ سب برابر ہوں۔ لیکن بعض لوگوں نے اپنے لیے کچھ اور ہی قانون بنا لیے ہیں، جن کی بنیاد خود غرضیوں اور تعصبات پر ہے ایک طرف تو دنیاوی اور دوسری طرف مذہبی شہزادے پیدا ہوگئے ہیں۔ اور لوگوں کی اجتماعی زندگی ان دو پتھروں کے نیچے دب کر رہ گئی ہے۔ انقلابِ فرانس اور امریکہ کی آزادی نے اس پتھر کو ہٹانا چاہا تھا، لیکن ایک ہٹا تو دوسرا اس کی جگہ پر آگیا۔

## نیا نسخہ اور اس کے اثرات

لوگ گھبرا اٹھے، تو ایک بالکل نیا نسخہ تجویز کیا گیا، جو اب روس میں سوشلزم کی صورت میں ہے۔ لیکن میں تمھیں بتا دوں، یہ نسخہ بھی غلط ہے، جس طرح پہلے نسخے غلط تھے۔ سوشلزم کو محض پہلی سرمایہ داری کا جواب سمجھو۔ پہلے جتنی قوت کے ساتھ سرمایہ داری تھی اب اتنی ہی طاقت کے ساتھ اس سے انکار ہے۔ ضرورت اعتدال کی ہے اور اس کا نام ونشان وہاں نہیں اور میں تمھیں یہ بھی بتا دوں کہ دنیا جس چیز کو ڈھونڈ رہی ہے، وہ مساوات ہے، اور اس کی بہترین صورت تمھارے پاس ہے۔ دنیا کی ساری پریشانیوں کا حل وہ ہے جو آج سے تیرہ سو سال

نے جواب دے کر ان کو بہت کچھ اہمیت دے دی ہے۔ یہ مسلمانوں کی غلطی ہے کہ وہ انھیں جواب دیتے ہیں، اور یہ غلطی مسلمان ہمیشہ کرتے آئے ہیں۔ ایسی ہی ایک جماعت جو مسلمانوں پر ہمیشہ اعتراض کرنے کی عادی ہے آریوں کی ہے۔ یہ آج سے بہت پہلے سے اسلام پر اعتراض کر رہی ہے، لیکن ہمیشہ ناکام رہی۔ ان سے پہلے عیسائیوں کے اعتراض سامنے آچکے ہیں اور ان کا بہت زیادہ اور شافی جواب دیا جا چکا ہے۔ اب ان ہی اعتراضات کو آریہ نیا جامہ پہنا کر سامنے پیش کر دیتے ہیں، پھر جواب مانگتے ہیں اور مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ ان میں بھی چند ایسے موجود ہیں، جو اسی پر چلّا اٹھتے ہیں کہ ہندو مسلمانوں کو ہضم کرنا چاہتے ہیں اور اسلام کو مٹا ڈالنا چاہتے ہیں۔

ہاں! اگر تمھارے نزدیک اسلام کی جڑیں ایسی ہی کمزور ہیں، جو معمولی جھونکوں سے اکھڑ جائیں، تو یہ ہوسکتا ہے۔ اگر تمھارے نزدیک مسلمان ایسے ہی مجبور ہیں، تو آسانی سے ہضم ہوسکتے ہیں۔ میرے عزیزو! تم نے غلط سمجھا یا تم کو غلط سمجھایا جا رہا ہے۔ میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کا حریف اگر کوئی بھی ہوسکتا ہے تو عیسائی مذہب اور عیسائی قوم ہے؛ دوسرا کوئی نہیں۔

## ہندستان میں آنے کے بعد

ہندستان میں آنے کے بعد مسلمانوں میں یہ عیب بھی پیدا ہوگیا ہے کہ نسلی افتخار سے بھی آگے بڑھ کر وہ اکثر جماعتوں کو اپنے سے نیچا ہی نہیں، بلکہ ناپاک سمجھنے لگے ہیں۔ اسلام کسی کے جسم کو ناپاکی سے ملوث ہوئے بغیر ناپاک نہیں سمجھتا۔ وہ جسم کی ناپاکی کو بہت کم وقعت دیتا ہے، وہ دلوں کی ناپاکی کو ناپاکی سمجھتا ہے۔ اور اسی کو اہمیت دیتا ہے۔ اس لیے تمھارا فرض ہے کہ اس برائی کو جو تم میں دوسروں کی دیکھا دیکھی پیدا ہوگئی ہے، دور کرو اور بہت جلد دور کرو۔

ایک مسلمان مہتر کو تم اس لیے اپنے ساتھ بٹھانے کے لیے تیار نہیں کہ وہ ظاہراً ناپاک کام کرتا ہے اور خستہ حال رہتا ہے، خواہ وہ تہجّد گزار عابد ہی کیوں نہ ہوں، اس کا دل ایمان کی شعاعوں سے منوّر ہی

اور یہ خوش نصیب غلام جس کی رکاب آقا تھامے تھے، حضرت اُسامہ بن زید تھے۔

## اسلام کی تعلیم کا اثر

یہ تھا اسلام کا وہ عدیم المثال کارنامہ جو اس نے تئیس برس کی مدت میں پیش کیا۔ نسلی اور شخصی غرور کا نام تک نہ رہا۔ نظریوں کا سوال نہیں، بلکہ سوال اجتماعی زندگی کے مشکلات کے حل کا ہے ان حلوں کو اسلام نے زندگی کا لازمی جُز بنا دیا ہے اور جمہوریت کی وہ روح جو آج سے تیرہ سو سال پہلے پھونکی گئی تھی، اور وہ جوہر جو اسلام نے پیش کیا تھا آج بھی باقی ہے۔ آج کی ٹوٹی پھوٹی مسجدوں میں بھی ہر روز پانچ وقت تمھاری آنکھیں یہ سب کچھ دیکھ سکتی ہیں۔ اسلام کی اچھوتی قوت کو دیکھو اسلام آج تیرہ سو سال سے حکومت کر رہا ہے۔ تم میں سے ہزاروں اب بھی ایسے موجود ہیں، جو اس کی تعلیمات سے بغاوت کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں بھی جماعتی غرور کا شیوہ اختیار کرنے کی عادت پیدا ہو گئی ہے لیکن اس کی طاقتوں کے آگے سر نہیں اٹھا سکتے۔ بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے درجہ کا آدمی پانچ وقت تو ضرور ایک ہی صف میں نظر آتا ہے ہزار غرور اور تمکنت کے باوجود بھی اگر وہ مسلمان ہے، تو ضرور ایک ہی صف میں کھڑا ہونا ہوگا۔ یہی ہے مساوات! اور اسی کی دنیا کو اشد ضرورت ہے۔ اسلام کا بنایا ہوا لائحۂ عمل یہی ہے، جو کبھی بیکار ہونے والا نہیں۔

## یورپ کیا چاہتا ہے

یورپ اس وقت معجزوں کو تلاش نہیں کرتا بلکہ اُس کو حقیقی تلاش ایسی مساوات اور اجتماعی زندگی کے حل کی ہے، جو ان کے پاس نہیں صرف آپ کے پاس ہے۔ آپ اس پر خود غور کریں اور دوسروں کو دعوتِ فکر و عمل دیں۔

## اسلام پر اعتراضات کا جواب

پھر ایسی بہت سی جماعتیں پیدا ہو گئی ہیں، جو اسلام پر بے دھڑک اعتراض کر دیتی ہیں۔ لیکن خود مسلمانوں

## نکاح اور طلاق

امریکہ کے صرف ایک صوبے میں پچاس کلب ایسے موجود ہیں، جو عقدِ موقت کی اشاعت کر رہے ہیں۔ یعنی لوگ ایک مدت کے لیے نکاح کریں کیونکہ اگر مسیحی قانون کے مطابق نکاح کرتے ہیں، تو وہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اور اگر دونوں کا میل نہیں ہوا تو دونوں کی زندگی مسلسل عذاب بن کر رہ جاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ یہی فطرت کا اقتضا تھا۔ وہاں شادیاں چار چار اور چھ چھ مہینوں کے لیے بھی ہوتی ہیں لیکن تمہارے پاس یہ چیز جس کو وہ اب پا سکے ہیں، پہلے سے موجود ہے، اور عین فطرت ہے اور اسی قسم کے دوسرے قوانین ہیں، جو عین فطرت کے مطابق ہیں۔ دیکھو ایک طرف تو نکاح کی اہمیت قائم ہے اور دوسرے ایسے ناگفتہ بہ مصائب سے گلو خلاصی کے لیے بھی دروازہ کھلا ہے۔

آج یورپ و امریکہ معاشرتی نظام کا نقشہ اور وہ بھی نامکمل بنا رہے ہیں۔ حالانکہ مکمل نقشہ اسلام میں ایک زمانے سے اور کامل طور پر موجود ہے۔

## اسلام اور سوشلزم

انقلاب فرانس نے ایک نسخہ دیا تھا، لیکن پہلے کی جگہ دوسرے سرمایہ دار آ گئے۔ مساوات کا دور ختم ہو گیا۔ پھر بڑے بڑے عزت حاصل کرتے رہے، باقی سب ذلت میں پڑ گئے۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ جمہوریت کا نسخہ بھی غلط تھا۔ آج ہندوستان میں بھی اس کے مقلد موجود ہیں، اور بہت زیادہ ہیں لیکن اس کی وجہ کیا ہے؟ یہی کہ غلامی سے ہمارے دماغ ماؤف ہو گئے اور ہم یورپ کے سامنے جھک گئے۔

غلامی صرف ہماری قومیت پر ہی نہیں، بلکہ دماغ پر بھی طاری ہو گئی ہے۔ اور اب جمہوریت کے بدلے ہمارے سامنے سوشلزم ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ سوشلزم اسی وقت سامنے آتا ہے، جب انسان کے

کیوں نہ ہو! اس کے برخلاف تم ایک سفید کپڑے پہنے ہوئے آدمی کو اپنے ساتھ بٹھا کے کھلانے کے لیے تیار ہو، خواہ اس کی روح کتنی ہی میلی، اس کا دل کتنا ہی تاریک اور اس کے اعمال کتنے ہی ناپاک کیوں نہ ہو۔

میں پہلے ہی کہ چکا ہوں کہ تم غلط وزن کرنے کے عادی ہو گئے ہو، اور اگر تم وزن کرتے ہو تو تم خود غلط ہوتے ہو۔ جب تم خود غلط ہوئے تو تمھارا ہر قدم غلط ہوگا۔ اور تم آنکھیں رکھتے ہو، تو پھر دیکھو کہ تمھارا ہر قدم خود غلط اٹھ رہا ہے۔

عزیزو!

اب وقت کم رہ گیا! اور جیسا کہ میں پہلے کہ چکا ہوں کہ میری صحت زیادہ دیر تک بولنے کی اجازت نہیں دیتی، اس لیے اس طویل مبحث کو چھوڑ کر میں اپنے مقصد پر آتا ہوں یعنی یہ جلسہ تبلیغ و اشاعت کا ہے۔

## تبلیغ کہاں کی جائے؟

اس لیے میں کہوں گا کہ پہلے سوچ تو لو کہ تمھیں کہاں تبلیغ کرنا ہے، اندرونی گوشوں میں یا بیرونی میدان میں۔ اگر اندرونی تبلیغ کرنا چاہتے ہو، تو بہت سی برائیاں تمھاری آنکھوں کے سامنے مذہب کے دامن پر رینگتی پھر رہی ہیں، اُن کو دور کرو، اور اگر بیرونی تبلیغ تمھارے پیش نظر ہے تو کسی اقدام سے پہلے یہ معلوم کرو کہ دنیا کیا چاہتی ہے، اس کو کس چیز کی پیاس ہے اور تم اس کی پیاس کو کس طرح بجھا سکتے ہو؟ اور وہی چیز پہلے اس کے سامنے پیش کرو۔ ورنہ تمھاری کوششیں لاحاصل اور بیکار ہیں۔ دنیا کا رخ دیکھو، معلوم ہوگا کہ وہ اسی کو ڈھونڈ رہی ہے جو پیغام اسلام کا ہے۔ اسلام کا پیغام نجات اور دائمی راحت ہے۔ پھر دنیا مسلسل مصائب سے گھبرا کر اسی کی تلاش میں ہے۔

تلگو میں، پنجابی میں یا ملک کی اور زبانوں میں کونسا مستند ترجمۂ قرآن ملک اور اہل ملک کے سامنے پیش کیا ہے؟

تو پھر کیا اسی پر تبلیغ کا خیال ہے، جب تم قرآن مجید کو غیر مسلموں تک نہیں پہنچا سکتے، اللہ کے پیغام کو صحیح اور درست طریقے پر نہیں سمجھا سکتے، تو تم کس طرح امید کرسکتے ہو کہ تبلیغ اسلام کرسکو گے!

عزیزو!

وقت بہت زیادہ ہوگیا اور اب تقریر کا ختم ہونا ضروری ہے مجھے جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکا اور اب اس کا سمجھنا آپ کے لیے ہے۔

آخر میں یہ کہونگا کہ جو لوگ تبلیغ دین کا جوش رکھتے ہیں، وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ لیکن میں ان سے پھر یہی کہونگا کہ اس ابتدا کو انتہا نہ سمجھیں، اس پہلی منزل کو منزلِ مقصود نہ سمجھیں ان کی کوششیں مجلسوں محفلوں اور سالانہ جلسوں تک نہ ختم ہو جائیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک ان کی نیتوں کو خیر اور استقامت بخشے!

دل میں انتقامی جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اور انتقامی جذبہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان مجبور ہوجاتا ہے۔

## اسلام سرمایہ داری کے خلاف ہے

اسلام سے زیادہ سرمایہ داری کی مخالف کوئی جماعت نہیں، کوئی تحریک نہیں۔ اس کی سب سے پہلے کوشش یہ ہوتی ہے کہ گھر میں دولت جمع ہی نہ ہو۔ یہ نہیں کہ جب دولت جمع ہوجاتی ہے تو وہ اسے بانٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ دولت ایک گھر ایک خاندان ہی میں نہ رہے، بلکہ ہمیشہ چلتی اور پھیلتی رہے۔

اسلام کا ایک قانون ہے وراثت، باپ کی جایداد تمام اولاد میں تقسیم ہوجاتی ہے لیکن عیسائیوں میں بڑے بھائی کو ملتی ہے۔ بقیہ دوسروں کو صرف زندگی گذارنے بھر۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دولت نسلاً بعد نسلٍ بڑھتی جاتی ہے اور جب تک دولت کا انجماد ختم نہ ہوجائے، دنیا کو تسکین نہیں ہوسکتی، وہ ہمیشہ مضطرب رہیگی۔ اس لیے اسلام چاہتا ہے کہ دولت بٹ جائے، ایک جگہ جمع نہ ہو، بلکہ ہمیشہ پھیلی رہے۔

اگر یہ نہ ہوتا تو فطرت کے مطابق کبھی نہ ہوتا۔ اسی لیے اسلام نے دولت کی تقسیم کی بہترین صورت پیش کی۔ اور اس وقت، جب دنیا اتنی ہی تاریکی میں تھی۔ اب اگر تم چاہتے ہو کہ اسلام کی تبلیغ اور اشاعت ہو تو سب سے پہلے تم خود ان تمام باتوں کو سمجھو۔ ان مقدس تعلیمات پر غور کرو کیونکہ اگر تم خود سمجھ کے پیش نہ کروگے تو دوسرے کیا سمجھینگے۔

اس سے زیادہ شرم کی اور کیا بات ہوسکتی ہے کہ جو یورپ اور امریکہ میں تبلیغ کا خواب دیکھ رہے ہیں، اپنی ہمسایہ قوم کو اب تک نہیں سمجھا سکے۔ پھر یہ کس درجہ شرمناک ہے کہ تم سے اب تک اتنا بھی نہ ہوسکا کہ اپنے اللہ کے پیغام کو، دینِ فطرت کی تعلیم کو دنیا کی سب زبانوں میں نہ سہی تو کم از کم ملک کی زبان میں اہل ملک تک پہنچا سکو۔ بتاؤ تو تم نے انگریزی میں، ہندی میں، بنگالی میں، گجراتی میں،

موضوع اس قدر اہم ہے کہ ہر شخص کے سامنے آتا ہے۔ اس لیے ضروری ہوا کہ یہ مسئلہ ہمارے سامنے زیادہ صاف اور روشن شکل میں آجائے۔

# زبان کا مسئلہ

جو ترتیب جلسے کی میرے سامنے تھی اس سے میں ذرا ہٹنا چاہتا ہوں۔ اور جس چیز پر میں آپ کو غور و فکر کی دعوت دونگا، وہ چیز زبان کا مسئلہ ہے، اور اس مسئلہ کی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے۔ وہ جماعت جو قوم کا لقب اختیار کرتی ہے، اس کے لیے یہ مسئلہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر کوئی قوم یا جماعت اس شرط کو پورا نہیں کرتی جو زبان سے متعلق ہے، تو اس کے بغیر وہ ایک قدم نہیں چل سکتی۔ زبان کا مسئلہ نہایت اہم ہے، اس مسئلے کو قدرتی طور پر ہندستان میں ابھرنا تھا، اور وہ ابھرا۔ ہندستان اس وقت مختلف ٹکڑوں کا نام ہے، اور ان ٹکڑوں کی مختلف جغرافیائی حیثیت ہے۔ اس ملک میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اگر ہندستان کے آگے قومی زبان کا مسئلہ آتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ زبان ایک ہو۔ کیونکہ ہر ٹکڑا اپنی ایک تاریخ رکھتا ہے، جس کا تعلق اس کی معاشرتی زندگی سے ہوتا ہے، اس کی مقامی زبان ہوتی ہے۔ میرے وہ قدرتی جذبات جو مقامی زبان کے بارے میں ہیں، یہ ہیں کہ وہ زبان جو سب سے پہلے ماں کی گود سے نکل کر بچے کے کان سے ٹکرائے۔ اگر آپ کسی بناوٹی ذریعہ سے منطق یا مصلحت سے، کوشش کریں کہ وہ جذبات بھی جو ماں کی گود سے اٹھتے ہیں مصلحت میں شامل ہو جائیں، تو میرا خیال ہے کہ اس کے لیے زمانہ درکار ہے۔

اس لیے قدرتی طور پر ہندستان میں قومی زبان کے مسئلے نے نازک صورت اختیار کرلی۔ اگرچہ یہ خاص ایسا الجھاؤ نہیں ہے جو صرف ہندستان میں پیش آیا ہو۔ میں آپ کو بتاؤنگا کہ متمدن ممالک میں بعض ایسے حصے ہیں، جہاں پانچ پانچ زبانیں تسلیم کرنی پڑی ہیں، اور انھوں نے ان پانچوں زبانوں کو اس طرح تسلیم کیا ہے کہ انھیں وہ تمام حقوق عطا کر دیے جو کسی قومی زبان کو عطا

۱۰

# ہندستانی کمیٹی، بہار

۱۹۳۷ء

آپ حضرات مجھے اجازت دیں کہ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، وہ کہوں۔ ملنے کا مقررہ وقت تین تھا۔ لہذا ضروری تھا کہ میں تین بجے آجاؤں۔ لیکن اتفاق کہ دیر ہوگئی۔ چنانچہ سب سے پہلے میں جو مشورہ آپ کو دینا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ ہم سب آدابِ مجلس کی پابندی کیا کریں، اور پہلی شرط آدابِ مجلس کی یہ ہے کہ جلسے میں وقتِ مقررہ پر شریک ہوا کریں۔

میں یہ ہرگز نہیں پسند کروں گا کہ اب جو محدود وقت اس وقت ہمارے قبضے میں ہے، اسے اصل مقصود کے سوا، دوسری چیز میں صرف کیا جائے۔ اس سے پہلے بھی دو ایک جلسے ہو چکے ہیں۔ اور میں امید کرتا ہوں کہ جو حضرات اِس وقت اِس جلسے میں شریک ہیں، ان کی اکثریت گذشتہ جلسوں میں موجود تھی۔ میں چاہتا تھا کہ بحث و نظر کے لیے ایک مرتّب سلسلہ آپ حضرات کے سامنے پیش کروں، اور میں نے وعدہ بھی کیا تھا کہ اسی ترتیب کے ساتھ آپ کے ساتھ چلونگا۔ یہ پہلی بار ہے کہ اس سلسلہ میں مجھے غور کرنے کا موقعہ ملا، اور میں نے محسوس کیا کہ میں آپ کے سامنے وہ چیز پیش کروں، جو وقت کی اہم ضرورت ہے۔ جس ترتیب کی چال سے میں چلنا چاہتا تھا، اگر چلتا تو دو تین منزلوں کے بعد ضرور اس موضوع پر پہنچتا، جسے میں آج آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ وہ

کہ شمار کیا جائے تو وہ زبانیں جو معاشرتی ضروریات کو پورا کرتی ہیں ان کی تعداد ۱۲ تک پہنچتی ہے۔ بارھویں صدی عیسوی میں بہتیروں نے ہندستان کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔ اور ابن خلدون نے بھی اس پر کافی بحث کی ہے۔ اس وقت ہندستان میں جو زبانیں پیدا ہو چکی تھیں، وہ پراکرت کہلاتی تھیں۔ اور سنسکرت کو مقدس اور مذہبی زبان کا درجہ حاصل تھا۔ اگر کالیداس کے ڈراموں کو دیکھا جائے، تو معلوم ہوگا کہ دربار کے اعلیٰ طبقے کی زبان سنسکرت ہوتی تھی، اور بادشاہ بھی درباریوں کے سامنے جب کبھی زبان کھولتا تو سنسکرت میں گفتگو کرتا تھا۔ دربار کی زبان اگرچہ سنسکرت تھی، مگر دربار میں جو مختلف گوشوں کے لوگ ہوتے تھے ان کی عام بول چال پراکرت زبان میں ہوتی تھی۔

چھٹی صدی عیسوی سے پہلے مختلف زبانیں پیدا ہو چکی تھیں، اور سنسکرت بول چال کی زبان نہیں رہی تھی۔ اس کی حیثیت فقط علمی، مذہبی، اور شاید درباری زبان کی تھی۔ ملک کی تمام بول چال دوسری زبانوں میں تھی۔ یہ پراکرت زبانیں مختلف گوشوں میں پیدا ہوئیں۔ شمالی ہند میں بھی ایک مختلف زبان پیدا ہوئی۔ مثلاً ہمیں برج بھاشا کا پتہ ملتا ہے۔ اودھ کی بھی ایک زبان بن چکی تھی۔ ان چیزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان زبانوں کا ابتدائی مادّہ بھی ایک ہی تھا، اور زبان کا قدرتی قاعدہ بھی ایک تھا۔ اختلاف جو کچھ تھا، وہ فقط لب و لہجہ کا تھا۔ اور اس لب و لہجہ کا اختلاف البتہ زبانوں پر اثر ڈالتا تھا۔ شمالی ہند کی زبانوں میں اب تک پنجاب کی زبان موجود ہے، چودھویں صدی میں گرو نانک کی زبان میں جو اشارے ملتے ہیں وہ اپنے ابتدائی مادّوں میں شمالی ہند سے الگ نہیں تھے۔ علم اللسان کی رُو سے دیکھا اور ان کی لغات سامنے رکھی جائے، تو معلوم ہوگا کہ ان زبانوں کے مصادر وغیرہ ایک تھے۔ لب و لہجہ کا اختلاف جو تھا اُن کے اثر سے مختلف زبانیں پیدا ہو گئیں۔ چنانچہ اودھ میں برج بھاشا کی زبان کا پتہ چلتا ہے۔

اس کے بعد مسلمان آئے، ابتدائی دور میں معلوم نہیں زبان کا کیا رنگ تھا، مگر لوگوں کے میل جول سے جو زبان پیدا ہو چلی تھی، اور سعد سلمان کے قصائد میں جس زبان کا اکثر تذکرہ کیا گیا ہے،

کیے جاتے ہیں۔

یہ کوئی ایسی دشواری نہیں ہے جو صرف ہمارے سامنے پیش آئی ہو۔ ہر ملک کی خاص دشواریاں ہوتی ہیں۔ اور ہمارا فرض ہے کہ ہم ان دشواریوں پر غالب آجائیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس مسئلے پر غور کریں اور اس کا جو صحیح فیصلہ ہو اسے ہمارے سامنے ہونا چاہیے۔ بہت ممکن ہے کہ اس سلسلہ میں جذبات کی راہ سے کچھ اثر اس فیصلے پر پڑے۔ مگر کچی رائے سے یہ منزل طے نہیں کی جاسکتی۔ اس کی بنیاد محض وقتی جذبات پر نہ ہونا چاہیے، بلکہ منطق اور ٹھوس دلائل پر ہونا چاہیے۔ یہ سوال وقت اور موسم کا سوال ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ یہ سوال آپ کے دلوں کو ملتفت بھی کر سکیگا۔ لہٰذا میں اسی سوال پر آپ کے غور وفکر کو دعوت دونگا۔

یہ معاملہ بہت وسیع ہے، اگر اس کا صرف ایک پہلو بھی لیا جائے تو اس کے لیے متعدد مجلسوں کی ضرورت لاحق ہوگی۔ اور مجھے صرف اسی مجلس میں مختلف مراحل طے کرنے ہیں۔ اس لیے میں کوشش کرونگا کہ تمام مراحل جلد جلد اس مجلس میں طے کرلوں۔

پہلا مرحلہ جو ہمیں طے کرنا ہے، وہ تاریخ کا ہے۔ مگر میں تفصیل میں پڑنا نہیں چاہتا۔ بنا بریں تاریخ کے لیے صرف سرسری اشاروں کو جگہ دی جائیگی۔

دوسری چیز قدرتی طور پر سامنے یہ آتی ہے کہ اٹھارھویں صدی میں جس میں ہندستان کی بہت بڑی زبان اردو کو سر اٹھانے اور پھیلنے کا موقعہ ملا، حالات کیا تھے! اس لیے کہ ہم کسی گوشے میں بھی جائیں، اس درمیانی کڑی کو بھول نہیں سکتے۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ موجودہ حالت کیا ہے۔ اور اس کی پیاس کیا ہے، نیز وہ کیوں کر بجھ سکتی ہے۔ جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے، بہت سی چیزیں آپ حضرات کے سامنے سے گزر چکی ہیں اور ان بنیادی چیزوں میں سے، جیسے آپ جانتے ہیں ایک یہ ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں ہندستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندستان کی کیا حالت تھی، اس پر کافی روشنی پڑ چکی ہے۔ اور اس وقت جو دور گذر رہا تھا اس کا بھی حال آپ لوگوں کو معلوم ہے۔ ہندستان میں اس قدر زبانیں موجود ہیں

تعلق ہے جو ایک ملکی زبان میں ہونی چاہییں، وہ سب اس میں موجود ہیں۔ اس لیے جہاں تک بول چال کا تعلق ہے، اس زمانے کو آپ بلا کسی تردّد، جھجک اور تذبذب کے بابر اور اکبر سے شروع کر سکتے ہیں۔ اکبر کے عہد ہی میں وہ زبان جسے اردو سے تعبیر کیا جاتا ہے نشو و نما پا چکی تھی، اور عام طور پر بولی جاتی تھی؛ نیز باہر کے بسنے والوں نے بھی اسے تسلیم کر لیا تھا۔

اکبر کی جو درباری اور علمی مجالس ہوا کرتی تھیں۔ ان مجالس کی زبان غالباً فارسی ہوگی میر فتح اللہ شیرازی شیراز سے آئے تھے اور اکبر کے دربار میں ایک گرانقدر عہدے پر فائز تھے۔ ابو الفضل، فیضی، اور عبد القادر بدایونی کے ساتھ ان مجالس میں میر فتح اللہ شیرازی بھی شریک ہوتے تھے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ وہ مجلس کی زبان کیونکر سمجھتے ہوں گے۔ اور جب میر فتح اللہ شیرازی بحث میں عام حصہ لیتے ہوں گے، تو وہ کس زبان میں لیتے ہونگے ؟

لیکن اب مجھے اتنے شواہد مل گئے ہیں کہ مجلس کی زبان فقط فارسی نہیں ہوگی۔ مغلوں کا یہ خاندانی اثر تھا کہ وہ اپنی خاندانی زبان ترکی رکھنا چاہتے تھے، اور بچہ پیدا ہوتے ہی ترکی ماماؤں کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ یہ ماما خالص ترکی النسل ہوا کرتی اور خاص اس غرض سے وطن سے بلوائی جاتی۔ ان ماماؤں کے سپرد کر دینے کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ ان بچوں کے کانوں میں اوائل سے جو زبان ٹکرائی، وہ ترکی اور فارسی ہوتی۔ یہ سلسلۂ تربیت شروع سے آخر تک قائم رہا حتیٰ کہ شاہ عالم کے زمانے تک اس خاندان کی تربیت اسی طور پر ہوتی رہی۔ اس ابتدائی تربیت کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ شاہی خاندان کی زبان خالص فارسی اور ترکی ہوا کرتی تھی اور ان کی زبانوں میں دوسری زبان کی آمیزش نہیں ہو سکتی تھی۔

اس لیے ظاہر ہے کہ مجلس کی زبان فارسی زبان میں محدود نہیں ہوتی ہوگی، بلکہ مختلف بحثیں یقیناً اس زبان میں ہوتی ہوں گی جو ملکی ہوں گی۔ اور اسے بغیر تردّد کے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زبان ہندوی تھی۔ امیر خسرو نے بھی اپنی نظم "نُہ سپہر" میں، جس میں ہندستان کی خصوصیات کے ساتھ مختلف باتیں بیان کی گئی ہیں، اس زبان کو جابجا ہندوی ہی سے تعبیر کیا ہے۔ یہ عہد ابتدائی عہد تھا، اور مسلمان اب فاتح کی حیثیت سے نہیں، بلکہ باشندوں کی حیثیت سے بسر کرنے لگے تھے۔

شمالی ہند میں عام طور پر ایک زبان بولی جاتی تھی، جو قدرتی طور پر آپس کے میل جول کا نتیجہ تھا۔ لیکن جب وسط ایشیا کے باشندے عربی اور فارسی ساتھ لیے ہوئے آئے، تو ان کے بہت سے الفاظ ہندستان کی زبانوں میں مل گئے، اور ایک ملی جلی صورت پیدا ہونے لگی۔ نیز لہجہ کے اختلاف کا بھی زبان پر اثر پڑا، اور برج بھاشا اور اودھ کی زبان ایک نئی منزل سے گزرنے لگی۔

خالق باری جو امیر خسرو کی طرف منسوب ہے، اگر اسے تسلیم کرلیا جائے، اور نہ تسلیم کرنے کی کوئی وجہ نہیں، تو جو نقشہ ہمارے سامنے آتا ہے، وہ اپنی بنیاد کے اعتبار سے، اس میں کوئی شک نہیں کہ جو زبان ہم آج استعمال کر رہے ہیں، وہی ہے جس کا اشارہ خالق باری میں کیا گیا ہے۔ غرض یہ ایک دورِ تاریخ کا تھا، جو زبان پر گذرا۔

جہاں تک دکن کا تعلق ہے وہاں مسلمانوں نے شمالی ہند سے جاتے ہی ایک سلسلۂ حکومت قائم کردیا۔ اور وہاں بھی ایک عام بول چال پیدا ہوگئی۔ نامناسب نہ ہوگا اگر اس کا نام دکنی زبان رکھ دیا جائے۔

اگرچہ وہاں کی زبان موجودہ زبان سے قدرے مختلف ہے، لیکن بہرحال وہاں بھی ایک زبان نشوونما پارہی ہے اور جہاں تک وہاں کی مسلمان حکومت کا تعلق ہے، وہاں اب ایک عام زبان تسلیم کرلی گئی۔

اب بیچ کا زمانہ آتا ہے، یہ زمانہ تاریخی نزاع سے بالکل پاک ہے۔ ملک کی ایک عام زبان تسلیم کرلی گئی ہے، اور وہ زبان عام طور پر بولی جارہی ہے اور جہاں تک ان ساری شرائط کا

سعد سلمان اور غزنوی شعرا کے کلام، اعجاز خسروی وغیرہم میں اس زبان کو ہندوی سے منسوب کیا گیا ہے اس لیے آپ دیکھیں گے کہ عام طور پر زبان کا نام ہندوی ہے۔

اردو نثر کی سب سے پہلے جو چیزیں وجود میں آئیں۔ ان میں پہلی چیز قرآن حکیم کا ترجمہ ہے سب سے پہلے حضرت شاہ ولی اللہ نے قرآن حکیم کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا اور پھر وہ وقت آیا کہ شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین نے اس کا ترجمہ ۱۸۱۰ء میں اردو میں کیا۔ شاہ عبدالقادر دیباچے میں لکھتے ہیں کہ ضرورت کے ماتحت اس کا ترجمہ ہندی زبان میں کر رہا ہوں۔ اس ترجمہ کے محرک سید احمد بریلوی ہوئے تھے۔ پھر اس کے بعد مولانا اسماعیل شہید نے ایک کتاب تقویت الایمان لکھی، اور انھیں اصلاح کی ضرورتوں نے مجبور کیا کہ وہ اس کتاب کو سہل اور آسان زبان میں لکھیں اور انھوں نے بھی یہی لکھا کہ میں اس کتاب کو ہندی میں لکھ رہا ہوں۔

اٹھارویں صدی میں قدرتی طور پر اس زبان کا نام ہندی پڑنا تھا اور ہندی پڑا۔

پریس کا جہاں تک تعلق ہے۔ ہندستان میں پریس سب سے پہلے کلکتہ میں آیا۔ یہاں کئی دروازے اب ایسے کھلتے ہیں جو وہاں نہیں کھلتے تھے، اور اردو زبان کی تاریخ کی متعدد کڑیاں کلکتے میں ملتی ہیں۔ اسی زمانہ میں ایک دوسرا لفظ بھی اٹھا۔ اور وہ ریختہ تھا۔ ریختہ کی خاص خصوصیت تھی۔ شاہ عبدالقادر کی تعریف ریختہ کے بارے میں بہترین ہے۔ وہ ہندی اور ریختہ میں یہ فرق کرتے ہیں کہ وہ ترجمہ جو عام سہل اور آسان، ٹھیٹ زبان میں ہوتا، اسے وہ ہندوی کہتے ہیں۔ اور وہ زبان جو شاعری کی فارسی آمیز زبان تھی، اسے وہ ریختہ کے نام سے پکارتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ ترجمہ ہندی زبان میں ہو، نہ کہ ریختہ میں۔ ولی کے بعد شاعری نے جو نشو و نما پائی وہ فارسی آمیز تھی اور اسے ریختہ سے تاویل کیا جاتا تھا، ٹھیٹ اردو کو ہندی کہتے تھے۔

**اردو کا نام**

اب یہاں دیکھنا چاہیے کہ اردو کا تسمیہ کیونکر شروع ہوا، اردو

ہیں ملکی زبان اردو ہی تھی۔ البتہ یہ بات صاف ہے کہ ملک کی تعلیمی اور سرکاری زبان فارسی تھی۔

اس کے بعد اٹھارویں صدی کا زمانہ آتا ہے۔ ایک قوم سمندر پار سے آتی ہے اور سیاسی قوت حاصل کرنے لگتی ہے۔ ان کی ضرورتیں بڑھتی ہیں۔ اور ان کے میل جول سے معاشی ضروریات کی مشکلات پیدا ہونے لگتی ہیں۔ اس سلسلے میں چند چیزیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ان میں سے ایک چیز یہ ہے کہ اب وہ زبان صرف بول چال کی زبان نہیں ہے بلکہ شاعری کی زبان ہے۔ اکثر موقعوں پر دیکھا گیا ہے کہ نثر سے پہلے نظم نے سر اٹھایا ہے، اس لیے وہ زبان سترھویں صدی کے اواخر اور اٹھارہویں صدی کے اوائل میں نظم کی زبان تھی۔

شاعری کی ابتدا کیونکر ہوئی، کس طرح ہوئی، کہاں ہوئی؟ میں ان تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا۔ کہا جاتا ہے کہ شاعری کی ابتدا دکن سے ہوئی۔ لیکن ولی دکنی کو جو شاعری کا باوا آدم مانا جاتا ہے، یہ قطعی غلط ہے۔ ولی وغیرہ کو شاعری کی پہلی صف میں جگہ دینا غلط ہے کیونکہ واقعات و شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ ولی سے ایک سو برس پہلے اس زبان میں نظم لکھی جا چکی تھی، ہاں اس میں البتہ شک نہیں کہ شاعری کی ابتدا دکن سے ہوئی۔

ولی کا زمانہ درحقیقت ایک تاریخی زمانہ ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب اس زبان کو فارسی محاورات اور فارسی تمثیل سے آشنا کیا گیا، جس کی تکمیل میر و سودا کے ہاتھوں ہوئی؛ اور ولی ان میں سے ایک تھا۔

سر دست یہ زبان سترھویں صدی کے اواخر میں شاعری کی زبان ہو چکی ہے۔ اس زبان کی شاعری اب تکمیل کے درجے تک پہنچ رہی ہے۔ اور مذہبی ضرورتوں نے بھی مجبور کر کے اس میں نثر کا مواد جمع کر دیا۔

اب ایک منٹ کے لیے ہمیں رکنا چاہیے۔ زبان کے نام کا جہاں تک تعلق ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کا نام ہندی ہے۔ ابتدائی اشارات بھی مثلاً امیر خسرو کی نظم "نہ سپہر،

ہوگئی ہے۔ ٹھیٹ اردو کا مقصد اب یہ رہ گیا ہے کہ وہ زبان جس میں فارسی اور عربی تراکیب کا اثر کم ہو اور وہ عام بول چال کی زبان ہو۔ وہ زبان جو فارسی رس اور فارسی مصادر میں ڈوبی ہوئی ہے وہ علمی زبان ہے۔ اور وہ زبان جو بول چال کی زبان ہے، ٹھیٹ ہے؛ یہ اردو، فارسی کی تراکیب سے تقریباً خالی ہے۔

دلی کے بعد لکھنؤ زبان کا دوسرا مرکز بنا اور دلی و لکھنؤ کے مابین زبان کے مسئلے میں بڑا تغیر پیدا ہوگیا۔ دلی کا رجحان یہ تھا کہ جو صاف زبان ہے، یہی رہے۔ لیکن لکھنؤ میں جو دور شروع ہوا، وہاں یہ تغیر واقع ہوا کہ جہاں تک ممکن ہے فارسی کے مغلق اور موٹے الفاظ بولے جائیں۔ چنانچہ اس کی مثال میر انشا کے بیان سے بخوبی ملتی ہے۔ میر انشا نے مرزا صاحب کی ملاقات کے سلسلہ میں اپنی تحریر اور مرزا صاحب کی تحریر کا جو نمونہ پیش کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان میں کس قدر تغیر پیدا ہوگیا تھا۔ مرزا صاحب لکھتے ہیں۔

"اپنے تئیں بھی ایسے لوگوں سے علاقہ رہا۔"

مگر میر انشا نے اپنی جو زبان لکھی ہے، وہ دو خصوصیت کی نمایندگی کرتی ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ بہت سخت ہے، اور دوئم وہ زبان وہ ہے، جو اس وقت لکھنؤ کے اونچے طبقے میں بولی جاتی ہے، مرزا صاحب کی زبان وہی سیدھی اور صاف ہے۔

مگر اس کے باوجود اٹھارھویں صدی کے اوائل میں بھی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس زمانے میں بھی زبان کا نام ہندوی دیا جاتا تھا۔

مجھے بخوبی یاد ہے کہ والد مرحوم کی زبان سے میں نے کبھی اردو کا نام نہیں سنا! وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ یہ ہندی کی کتاب ہے۔ اور یہ اس وقت استعمال کرتے تھے جب خلاصے کے بارے میں گفتگو کرتے۔ وہ کہتے کہ یہ خلاصہ ہندی میں ہے، یا یہ خلاصہ کیدانی میں ہے۔

کے متعلق سب سے پہلے تذکرہ میر امّن نے کیا۔ میر امّن کو کلکتے میں جان گلکرسٹ نے بلایا، تاکہ اس طرح کی چیزیں تیار کی جائیں، جو عام بول چال میں ہوں۔ چنانچہ فورٹ ولیم کالج میں ایک بورڈ بنایا گیا۔ اسی سلسلے میں شیر علی افسوس وغیرہ بھی بلائے گئے، اور باغ و بہار لکھی گئی۔

میر امّن نے جو کام کیا، وہ عجیب و غریب ہے۔ اس وقت صاف اور سلیس زبان کا نمونہ پیش کرنا، جو دریا کی طرح رواں ہو، بہت دشوار تھا، کیونکہ زبان ہنوز صاف نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت بھی کہ اردو ارتقا کی کئی منزلیں طے کر چکی ہے، چار درویش اپنی جگہ پر قائم ہے، اور شاید ہمیشہ قائم رہے گا۔

بادشاہ اور امرا کا بڑا حصہ لشکری زندگی میں بسر ہوتا تھا۔ یہاں کیمپ کی زندگی کے جو معنی ہیں وہی معنی اردو کے بھی تھے۔ لشکری زندگی، دائمی زندگی کی سی ہو گئی تھی۔ لشکر کی زبان چونکہ عام زبان سے زیادہ ٹکسالی تھی، اس لیے آہستہ آہستہ یہ تصور پیدا ہوتا گیا کہ جو زبان زیادہ ٹکسالی اور فصیح ہوتی، وہ اردو کی زبان کہلاتی، کیونکہ اس زبان میں اور گلیوں کی زبان میں بہت فرق ہوتا اور عام طور پر یہ سمجھا جاتا کہ شستہ بولی فقط اردو میں پائی جائیگی۔

دلّی میں ایک اردو بازار بھی تھا اور قلعہ کے باہر سب سے شاندار بازار وہی تھا۔ بہت ممکن ہے کہ وہ جو اردو بازار تھا اس کے معنی یہ ہوں کہ وہ اردو کا بازار تھا اور اردو سے مقصد غالباً زبان کی زیادہ شائستہ حالت تھی۔

انشار اور قتیل دونوں نے دریائے لطافت لکھی ہے۔ دریائے لطافت ہی ایک ایسی کتاب ہے، جو معلومات کا بہت قیمتی ذریعہ ہے۔ دریائے لطافت میں انشار نے زبان کے بہت سے نمونے پیش کیے ہیں، جن میں علّامہ تفضل حسین وغیرہ کا نمونہ خاص دلچسپی اور اہمیت رکھتا ہے۔

یہی وہ کڑی ہے جہاں قدرتی طور پر شاعری اور تعلیم کے اثر سے یہ زبان فارسی سے بہت متاثر

دیں، جو درحقیقت ملکی زبان تھی، اور اسی زبان میں کارروائی کی جائے۔ دوسری طرف عہدیداروں کے لیے فارسی زبان کو ذریعہ قرار دیا اور انھوں نے اس مضمون کو لازمی طور پر اختیار کرنا شروع کیا۔

## تعلیم کا مسئلہ

تیسری چیز تعلیم کا مسئلہ تھی اور تعلیم کے بارے میں آپ کو معلوم ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی پالیسی کیا تھی!

۱۸۱۵ء میں میکالے نے ہندستان میں تعلیم کا خاکہ کھینچا اور ایک نئی تبدیلی رونما ہوئی۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ مشرقی علوم کو مشرقی زبان میں سیکھنا چاہیے، اور دوسرے گروہ نے کہا کہ نہیں، انگریزی میں۔ میکالے نے دوسرے گروہ کا ساتھ دیا۔ اور اپنی وہ مشہور رپورٹ لکھی، جس میں اس نے لکھا کہ ہندستان کو ایک نئی زبان سیکھنا چاہیے اور نئے علوم و فنون کو اس کے ذریعہ سیکھ کر ترقی کے راستہ میں بڑھنا چاہیے۔

لیکن یہاں میکالے سے ایک زبردست غلطی ہو گئی۔ ملکی زبانوں کو اس نے نہایت حقارت سے دیکھا اور انھیں کسی قابل نہیں سمجھا، جس کی وجہ سے بڑی خرابیاں پیدا ہوئیں۔

مگر ملکی زبانوں کی طرف توجہ نہ دینے کے مسئلہ میں انھوں نے جو غفلت برتی اس کے پیچھے ان کا "سیاسی پس پردہ" تھا۔ جو دروازہ ان کے لیے کھل گیا تھا، وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح اسے محفوظ کر لیا جائے۔ اس لیے کوشش کی کہ تعلیم کا ذریعہ وہ زبان ہو، جو ملک کی مادری، قومی، روایتی، معاشرتی اور تاریخی نہیں، بلکہ ایک سمندر پار کی زبان کو وسیلہ بنایا جائے۔ یہ فیصلہ قطعی مصنوعی تھا۔ کوئی قوم کبھی اجنبی زبان کو اپنی دماغی اور فکری زندگی کا ایک منٹ کے لیے بھی ذریعہ نہیں بنا سکتی۔ اگر وہ بنائے گی بھی، تو کوئی صحیح چیز وہ نہیں بنا سکتی۔ بلکہ اس کی ایک مسخ شدہ صورت البتہ پیدا ہو جائے گی۔ چنانچہ آپ دیکھ لیجیے کہ یہاں ایک سو تیس برس کی تعلیم کے بعد بھی وہ نتائج

اس زمانے یعنی ۱۸۲۱ء میں چند کتابیں فارسی میں لکھی گئیں اور پھر اردو میں ترجمہ ہوئیں۔ یہ ترجمے بہت مستند اشخاص مثلاً قاضی احمد گوپاموی وغیرہ نے کیے اور انھوں نے بھی تسلیم کیا ہے کہ یہ زبان ہندی ہے۔ اس لیے جہاں تک تسمیہ کا تعلق ہے، وہ دونوں نام استعمال کرتے ہیں یعنی ہندی بھی اور اردو بھی۔

وہ زبان جو بہت فارسی آمیز تھی، اسے اردو کے نام سے یاد کیا جانے لگا اور ہندی صاف اور صحیح اردو سمجھی جاتی تھی۔

دو لغت بھی جو انگریزی میں لکھے گئے، اسے ہندوستانی میں لکھا گیا۔ اور متعدد انگریزی چیزیں جو ہمارے سامنے آئیں انھیں بھی ہندوستانی کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جہاں تک اردو زبان کی نثر کا تعلق ہے، اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اس میں بہت بڑا احسان انگریزوں کا ہے۔ مگر یہ احسان اس لیے نہیں تھا کہ انھیں اردو سے کوئی خاص ہمدردی تھی بلکہ ان کا مفاد اور سیاسی اغراض سب کے سب اسی امر پر موقوف تھے کہ اردو کو ترقی دی جائے۔ چنانچہ انگریزوں کے گرد وپیش کوئی دوسری جماعت ہوتی تو وہ بھی یہی کرتے۔ ان کا سیاسی اقتدار اس قدر بڑھ گیا تھا کہ وہ ہر امر میں دخل دینا چاہتے تھے مگر انھیں بڑی دشواریاں پیش آتی تھیں کیونکہ زبان کا مسئلہ فوج میں بھی تھا اور سویلین میں بھی۔

سرکاری اور تعلیمی زبان پہلے ہی سے فارسی تھی، اور انگریزوں نے بھی اسے ہی قائم رکھا تھا۔ جب معاملات آگے بڑھے، تو سب سے پہلے عدالت کا معاملہ درپیش ہوا۔ عدالت کی جو زبان تھی وہ نہ افسروں کی زبان تھی، نہ مدعی کی، اور نہ مدعا علیہ کی۔ اظہارات، شہادات، وغیرہ سب دوسری زبانوں میں تھے۔ چنانچہ ان چیزوں کی بنا پر مقدمات کے فیصل کرنے میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ چونکہ اظہار وشواہد وغیرہ سے افسروں کو کما حقہٗ واقفیت نہیں ہوتی تھی، اس لیے فیصلے اکثر غلط اور بیجا ہوا کرتے تھے۔ یہ وہ دقتیں تھیں جن کی شدت کو قدم قدم پر محسوس کیا گیا، اور آخر کار وہ مجبور ہوئے کہ اردو زبان کو فروغ

پنجاب یونیورسٹی میں جو بحث چھڑی تھی وہ دراصل علوم کی تحصیل کا مسئلہ تھا، نہ کہ ذریعۂ تعلیم کا۔

اس لیے سوال یہ ہے کہ تعلیم زیادہ سے زیادہ اپنی زبان میں حاصل کی جائے۔ جو چیز اس سلسلہ میں آتی ہے، اور جہاں تک قومی زبان کا تعلق ہے، ہم ان پچھلے اشارات کو سامنے رکھ کر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ

ہندستان مختلف ٹکڑوں میں بٹا ہوا ہے۔

ہر ٹکڑے کی ایک زبان ہے۔

ہر زبان کی قومی اور تاریخی و معاشرتی روایات ہیں۔

اگر کسی مصنوعی ذریعہ سے آپ وہ زبان ان سے چھین لیں، تو آپ اس میں کامیاب نہیں ہونگے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ اگر یہ سوال اٹھایا جائے کہ گذشتہ ایک ہزار برس کے مختلف زمانوں میں جو مختلف زبانیں بنی ہیں، ان میں کوئی زبان ایسی آتی ہے جس سے تاریخی حیثیت سے ہم یہ معلوم کرسکیں کہ جغرافیائی حیثیت سے اس کا دائرہ محدود نہ ہو۔ ایسی کوئی زبان ہے یا نہیں؟ تو تاریخ کی روشنی میں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ سترھویں صدی کے اواخر میں ایک زبان ایسی تھی جس سے تمام ملک آشنا ہوگیا تھا، اور وہ یہی زبان جسے آج ہم اردو کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور تاریخ کے فیصلے کی روشنی میں ہم بغیر کسی جھجک کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ یہی اردو زبان تھی، جسے انگریزوں نے بھی معلوم کیا کہ یہ تمام ملک میں پھیلی ہوئی ہے۔ نیز فوج میں بھی یہی بول چال ہے، اور جس کے ذریعہ ہم دلوں پر قبضہ کرسکتے ہیں، اور مطلب نکال سکتے ہیں، وہ یہی اردو ہے۔

یہ زبان جو پیدا ہوئی اور پھیلی، یہ قومی زبان ہے۔ قومی زبان کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص دلی سے گجرات جاکر جو زبان بولتا تھا، اور مہاراشٹر کا باشندہ کرناٹک، مالابار میں جو زبان بولتا تھا، وہ یہی اردو تھی۔ اور یکساں طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی۔

جہاں تک نام کا تعلق ہے، اسے ابتدا میں ہندوی کہتے تھے، بعد میں ہندی اور اردو کا اطلاق

پیدا نہیں ہو سکے، جو دوسرے ممالک میں بہت تھوڑے عرصے میں پیدا ہو گئے۔

مصر و شام کا حال یہ ہے کہ انھوں نے اگرچہ نئے علوم کے آگے سر جھکا دیا، لیکن یاد رہے کہ انھوں نے زبان کے مسئلے میں ہرگز غیر فطری اور غیر قدرتی ذریعہ اختیار نہیں کیا، بلکہ انھوں نے ان علوم کے حاصل کرنے میں وہی قدرتی یعنی مادری زبان کا سہارا لیا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندستان کے اعلیٰ ڈگری پائے ہوئے لوگوں کے مقابلے میں، وہاں کا ایک معمولی طالب علم جس کی تعلیم ہائی اسکول سے زیادہ نہیں ہے، زیادہ "مفکر"، زیادہ زندگی کا مالک اور زیادہ قابل ہے۔ مصر میں اعلیٰ تعلیم کا کوئی انتظام نہیں، بس یہ سمجھ لیجیے کہ یہاں جو معیار ہائی اسکول کا ہے، وہی وہاں بھی ہے۔ لیکن فرقِ نتائج یہ ہے کہ تیس برس کے عرصے میں وہاں جو تغیر اور ترقی ہوئی، اس کا عشرِ عشیر بھی یہاں نہیں ہو سکا۔ تعلیم کے سلسلے میں ہندستان میں تعلیم کو رائج ہوئے مصر سے سو برس زیادہ گذرے۔ لیکن حال یہ ہے کہ ایک مصری جس چیز کو خوش اسلوبی اور دماغی تازگی کے ساتھ پیش کر دے گا، آپ کے ملک میں کوئی بھی ویسا نہیں مل سکتا۔ اس کی وجہ بالکل صاف ہے۔ آپ کی آنکھوں پر جو عینک چڑھی ہوئی ہے، اگر اسے ہٹا دیا جائے، تو آپ کے چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی ہوگی۔ اور بالکل اندھیرا ہو جائے گا۔ آپ کی آنکھوں پر پہلے ہی ایک مصنوعی عینک لگا دی گئی ہے، اور وہ قوت جو قومی زبان کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتی تھی، وہ ایک اجنبی صدا سے مٹا دی گئی ہے اور اب حالت یہ ہے کہ آپ کوئی چیز اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے۔

اس لیے آپ جب کبھی چاہیں گے کہ خود اپنے میں آ کر کچھ سوچیں اور بڑھیں، تو راستہ بند ہو جائے گا۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ آپ کی علمی زندگی ایک اجنبی زندگی ہے، جب تک انگریزی لباس میں ایک علم، ایک جذبہ، ایک خیال موجود ہے، کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ بہت بڑا نقص ہے اور جب تک یہ نقص دور نہ ہو، قومی دماغ پیدا نہیں ہو سکتا۔

بہرکیف وہ چیز غلط ثابت ہوئی اور انگریزوں نے ملکی زبان کی ترویج و اشاعت اور ترقی میں کوشش شروع کر دی۔

۱۱

# انڈین نیشنل کانگریس

رام گڑھ، مارچ ۱۹۴۰ء

دوستو! ۱۹۲۳ء میں آپ نے مجھے اس قومی مجلس کا صدر چُنا تھا۔ اب سترہ برس کے بعد دوسری مرتبہ آپ نے یہ عزت مجھے بخشی ہے۔ قوموں کی جدّوجہد کی تاریخ میں سترہ برس کی مدّت، کوئی بڑی مدت نہیں ہے۔ لیکن دنیا نے اپنی تبدیلیوں کی چال اس قدر تیز کر دی ہے، کہ اب وقت کے پُرانے اندازے کام نہیں دے سکتے۔ اس سترہ برس کے اندر، ایک کے بعد ایک، بہت سی منزلیں ہمارے سامنے آتی رہیں۔ ہمارا سفر دور کا تھا۔ اور ضروری تھا کہ مختلف منزلوں سے گزرے۔ ہم ہر منزل میں ٹھیرے؛ مگر رُکے کہیں نہیں۔ ہم نے ہر مقام کو دیکھا بھالا، مگر ہمارا دل اٹکا کہیں بھی نہیں۔ ہمیں طرح طرح کے اُتار چڑھاؤ پیش آئے، مگر ہر حال میں ہماری نگاہ سامنے ہی کی طرف رہی۔ دُنیا کو ہمارے ارادوں کے بارے میں شک رہے ہوں، مگر ہمیں اپنے فیصلوں کے بارے میں کبھی شک نہیں گزرا۔ ہمارا راستہ مشکلوں سے بھرا تھا۔ ہمارے سامنے قدم قدم پر طاقتور رکاوٹیں کھڑی تھیں۔ ہم جتنی تیزی سے چلنا چاہتے تھے، نہ چل سکے ہوں، لیکن ہم نے آگے بڑھنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ اگر ہم ۱۹۲۳ء اور ۱۹۴۰ء کی درمیانی مسافت

بھی سترھویں صدی کے اواخر میں ہو جاتا ہے۔ جس کی ابتدا میر امن نے کی۔ اس زمانے میں ہندی اور اردو میں کوئی تفریق نہیں تھی، جو اس وقت اردو اور ہندی میں ہے۔ البتہ ریختہ اور اردو میں کافی فرق کیا جاتا تھا، یعنی فارسی آمیز علمی زبان کو ریختہ کہتے تھے اور عام بول چال، ٹھیٹ زبان کو ہندی سے تعبیر کرتے تھے۔

اب تیسرا دور آتا ہے اور یہ دور غدر کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ غدر کے بعد نئے سرے سے سرشتۂ تعلیم بنانا پڑتا ہے، اور یہی زمانہ ہے جب رسم الخط کا سوال اٹھتا ہے۔

## رسم الخط کا مسئلہ

سوال یہ اٹھایا گیا کہ رسم الخط کس قسم کا اختیار کیا جائے، دیوناگری یا فارسی۔ عام تعلیم کے لیے کونسا رسم الخط موزوں اور مناسب ہے۔ ۱۸۷۷ء میں بہار میں اور ۱۹۰۰ء میں یہی سوال یو، پی میں بھی اٹھا۔ اور یہ چیز میں آپ کے سامنے بھی لانا چاہتا ہوں۔ بہار میں جب یہ سوال اٹھا تو اس کی نوعیت بدلی ہوئی تھی۔ اب یہ سوال فارسی اور دیوناگری رسم الخط کا تھا۔ ہندی سے مقصود اردو ہی تھی، مگر یہ پہلی بار تھا کہ ہندی کا اطلاق اس زبان پر کیا گیا جس کی شکل دیوناگری رسم الخط میں ہو، اور اردو وہ سمجھی گئی، جسے فارسی رسم الخط میں لکھا جاتا ہو۔

[ افسوس کہ یہ خطبہ اتنا ہی دستیاب ہوا؛ اور ناکمل
رہ گیا۔ مرتب ]

کے اعلانِ جنگ کے بعد ہم نے جو قدم اُٹھایا ہے، وہ کس طرف جا رہا ہے؟ اور اِس وقت ہم کہاں کھڑے ہیں؟۔

غالباً کانگرس کی تاریخ میں اُس کے ذہنی نقشے کا یہ ایک نیا رنگ تھا، کہ ۱۹۳۶ء کے اجلاس لکھنؤ میں یورپ کی بین القومی (انٹرنیشنل) صورتِ حال پر ایک لمبی تجویز منظور کر کے اُس نے اپنے نقطۂ خیال کا صاف صاف اعلان کر دیا، اور اُس کے بعد سے وہ کانگرس کے سالانہ اعلانوں کا ایک اہم اور ضروری حصہ بن گئی۔ یہ گویا اس بارے میں ہمارا ایک سوچا سمجھا ہوا فیصلہ تھا، جو ہم نے دنیا کے سامنے رکھ دیا۔

ان تجویزوں کے ذریعے ہم نے دنیا کے سامنے ایک ہی وقت میں دو باتوں کا اعلان کیا تھا:

سب سے پہلی بات، جسے میں نے ہندوستانی سیاست کے ایک نئے رنگ سے تعبیر کیا ہے ہمارا یہ احساس ہے کہ ہم اپنی آج کل کی مجبوری کی حالت میں بھی دنیا کی سیاسی صورتِ حال سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتے۔ یہ ضروری ہے کہ اپنے مستقبل کی راہ بناتے ہوئے، ہم صرف اپنے چاروں طرف ہی نہ دیکھیں، بلکہ اس سے باہر کی دنیا پر بھی برابر نظر رکھیں۔ زمانے کی بے شمار تبدیلیوں نے ملکوں اور قوموں کو اس طرح ایک دوسرے سے نزدیک کر دیا ہے، اور فکر اور عمل کی لہریں ایک گوشے میں اُبھر کر اِس تیزی کے ساتھ دوسرے گوشوں پر اپنا اثر ڈالنا شروع کر دیتی ہیں کہ آج کل کی حالت میں ممکن نہیں، ہندوستان اپنے مسئلوں کو صرف اپنی چار دیواری کے اندر ہی بند رہ کر سوچ سکے۔ یہ ناگزیر ہے، کہ باہر کے حالات، ہمارے حالات پر فوری اثر ڈالیں۔ اور ناگزیر ہے کہ ہماری حالتوں اور فیصلوں سے دنیا کی حالتوں اور فیصلوں پر اثر پڑے۔ یہی احساس تھا، جس نے اس فیصلے کی شکل اختیار کی۔ ہم نے ان تجویزوں کے ذریعہ اعلان کیا کہ یورپ میں جمہوریت اور انفرادی اور قومی آزادی کے خلاف فیشسزم اور نازی ازم کی جو ارتجاعی

پر نظر ڈالیں، تو ہمیں اپنے پیچھے بہت دور ایک دھندلا سا نشان دکھائی دے گا۔ ۱۹۲۲ء میں ہم اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھنا چاہتے تھے۔ مگر منزل ہم سے اتنی دور تھی کہ اُس کی راہ کا نشان بھی ہماری آنکھوں سے اوجھل تھا۔ لیکن آج نظر اٹھائیے، اور سامنے کی طرف دیکھیے؛ نہ صرف منزل کا نشان صاف دکھائی دے رہا ہے، بلکہ خود منزل بھی دور نہیں ہے۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ جوں جوں منزل نزدیک آتی جاتی ہے، ہماری جدّوجہد کی آزمایشیں بھی بڑھتی جاتی ہیں۔ آج واقعات کی تیز رفتاری نے جہاں ہمیں پچھلے نشانوں سے دور، اور آخری منزل سے نزدیک کر دیا ہے، وہیں طرح طرح کی نئی نئی اُلجھنیں اور مشکلیں بھی پیدا کر دی ہیں۔ ایک بہت ہی نازک مرحلے سے ہمارا کارواں گزر رہا ہے۔ ایسے مرحلوں کی سب سے بڑی آزمایش اُن کے متضاد امکانوں میں ہوتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ہمارا ایک صحیح قدم ہمیں منزلِ مقصود سے بالکل نزدیک کر دے۔ اور بہت ممکن ہے کہ ایک غلط قدم طرح طرح کی نئی مشکلوں میں اُلجھا دے۔ ایک ایسے نازک وقت میں آپ نے مجھے صدر چن کر اپنے جس بھروسے کا اظہار کیا ہے، وہ یقیناً بڑے سے بڑا بھروسا ہے، جو مُلک کی خدمت کی راہ میں آپ اپنے ایک ساتھی پر کر سکتے تھے۔ یہ بہت بڑی عزّت ہے، اس لیے بہت بڑی ذمّہ داری ہے۔ میں اس عزّت کے لیے شکر گزار ہوں، اور ذمّہ داری کے لیے آپ کی رفاقت کا سہارا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ جس گرمجوشی کے ساتھ آپ نے اس اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ ویسی ہی گرمجوشی کے ساتھ آپ کی رفاقتیں بھی میرا ساتھ دیتی رہینگی۔

## وقت کا اصلی سوال

اب میں سمجھتا ہوں، مجھے بغیر کسی تمہید کے وقت کے اصلی سوال پر آجانا چاہیے۔ ہمارے لیے وقت کا سب سے پہلا اور سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء

"لڑائی کی تجویزوں" کے نام سے مشہور ہیں۔

کانگرس کے یہ تمام اعلان برٹش گورنمنٹ کے سامنے تھے کہ اچانک اگست ۱۹۳۹ء کے تیسرے ہفتے میں لڑائی کے بادل گرجنے لگے۔ اور ۳ ستمبر کو خود لڑائی بھی شروع ہو گئی۔

اب میں اس موقعہ پر ایک لمحہ کے لیے آپ کو آگے بڑھنے سے روکونگا، اور درخواست کرونگا کہ ذرا پیچھے مڑ کر دیکھیے پچھلے اگست کو آپ نے کن حالات میں چھوڑا ہے؟

برطانوی حکومت نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء ہندوستان کے سر جبرًا تھوپا، اور حسبِ معمول دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اُس نے ہندوستان کو اس کے قومی حق کی ایک بہت بڑی قسط دے دی ہے۔ کانگرس کا فیصلہ اس بارے میں دنیا کو معلوم ہے۔

تاہم اُس نے کچھ عرصے کے لیے دم لینے کا ارادہ کیا، اور اس پر آمادہ ہو گئی کہ ایک خاص شرط کے ساتھ وزارتوں کا قبول کرنا منظور کر لے۔ اب گیارہ صوبوں میں سے آٹھ صوبوں میں اس کی وزارتیں کامیابی کے ساتھ کام کر رہی تھیں، اور یہ بات خود برطانوی حکومت کے حق میں تھی کہ اس حالت کو جس قدر زیادہ مدّت تک قائم رکھا جا سکتا ہے، قائم رکھے۔

ساتھ ہی صورتِ حال کا ایک دوسرا پہلو بھی تھا۔ جہاں تک لڑائی کی ظاہری صورت کا تعلق ہے، ہندستان صاف صاف لفظوں میں نازی جرمنی سے اپنی بیزاری کا اعلان کر چکا تھا۔ اُس کی ہمدردیاں جمہوریت پسند کرنے والی قوموں کے ساتھ تھیں، اور صورتِ حال کا یہ پہلو بھی برطانوی حکومت کے حق میں تھا۔ ایسی حالت میں قدرتی دور پر یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ اگر برطانوی حکومت کی پُرانی سامراجی ذہنیت (mentality) میں کچھ بھی تبدیلی ہوئی ہے تو کم از کم ڈپلومیسی (diplomacy) ہی کی خاطر وہ اس کی ضرورت ضرور محسوس کریگی۔ کہ اس موقعہ پر اپنا پُرانا ڈھنگ بدل دے، اور ہندستان کو ایسا محسوس کرنے کا موقع دے کہ اب وہ ایک بدلی ہوئی آب و ہوا میں

(reactionary) (ری ایکشنری) تحریکیں روز بروز طاقت پکڑتی جاتی ہیں،
ہندوستان انھیں دنیا کی ترقی اور امن کے لیے ایک عالمگیر خطرہ تصور کرتا ہے۔ اور اس
کا دل اور دماغ اُن قوموں کے ساتھ ہے، جو جمہوریت اور آزادی کی حفاظت میں اِن
تحریکوں کا مقابلہ کر رہی ہیں۔

لیکن جب فیشی ازم اور نا تسی ازم کے خطروں کے خلاف ہمارا دماغ جا رہا تھا، تو ہمارے
لیے ناممکن تھا کہ ہم اُس پرانے خطرے کو بھلا دیتے۔ جو اِن نئی قوتوں سے کہیں زیادہ قوموں
کے امن اور آزادی کے لیے مہلک ثابت ہو چکا ہے، اور جس نے فی الحقیقت ان نئی
ارتجاعی (reactionary) تحریکوں کی پیدایش کا سارا مواد بہم پہنچایا ہے۔ میرا
اشارہ برطانیہ کی سامراجی قوت کی طرف ہے۔ اسے ہم اِن نئی ارتجاعی (reactionary)
قوتوں کی طرح دور سے نہیں دیکھ رہے، یہ خود ہمارے گھر پر قبضہ جمائے ہمارے سامنے
کھڑی ہے۔ اس لیے ہم نے صاف صاف لفظوں میں یہ بات بھی کھول دی کہ اگر یورپ
کی اس نئی کشمکش نے لڑائی کی شکل اختیار کر لی، تو ہندوستان جو اپنے آزاد ارادے
اور آزاد پسند سے محروم کر دیا گیا ہے، اس میں کوئی حصہ نہیں لیگا۔ وہ صرف اسی حالت
میں حصہ لے سکتا ہے، جب کہ اُسے اپنی آزاد مرضی اور پسند سے فیصلہ کرنے کی حیثیت
حاصل ہو۔ [وہ نا تسی ازم اور فیسشی ازم سے بیزار ہے۔ مگر اُس سے بھی زیادہ برطانوی
شہنشاہیت سے بیزار ہے۔ اگر ہندوستان اپنی آزادی کے قدرتی حق سے محروم رہتا
ہے، تو اس کے صاف معنی یہ ہیں، کہ برطانوی شہنشاہیت اپنی تمام روایتی
خصوصیتوں کے ساتھ زندہ موجود ہے۔ اور ہندوستان کسی حال میں تیار نہیں
کہ برطانوی شہنشاہی کی فتحمندیوں کے لیے مدد دے۔

یہ دوسری بات تھی جس کا یہ تجویزیں لگاتار اعلان کرتی رہیں۔
یہ تجویزیں کانگرس کے اجلاس لکھنؤ سے لے کر اگست ۱۹۳۹ء تک منظور ہوتی رہیں۔ اور

بڑی بننے والی لڑائی میں اچانک ڈھکیل دیا گیا۔ بغیر اس کے کہ اُسے معلوم بھی ہوا ہو کہ وہ لڑائی میں شریک ہو رہا ہے!

صرف یہی ایک واقعہ اس کے لیے کافی ہے کہ برطانوی حکومت کے موجودہ مزاج اور رُخ کو ہم اُس کے اصلی رنگ رُوپ میں دیکھ لیں۔ مگر نہیں، ہمیں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیں اور موقعے بھی پیش آنے والے ہیں۔ وہ وقت دور نہیں جب ہم اُسے اور زیادہ نزدیک سے، اور اَور زیادہ بے پردہ دیکھنے لگیں گے!

۱۹۱۴ء کی لڑائی کی پہلی چنگاری بلقان کے ایک گوشہ میں سُلگی تھی۔ اس لیے انگلستان اور فرانس نے چھوٹی قوموں کے حقوق کا نعرہ لگانا شروع کر دیا تھا۔ پھر یادش بخیر، پریسیڈنٹ ولسن کے چودہ نکتے دُنیا کے سامنے آئے۔ اور ان کا جو کچھ حشر ہوا، دُنیا کو معلوم ہے۔ اس مرتبہ صورتِ حال دوسری تھی۔ پچھلی لڑائی کے بعد انگلستان اور فرانس نے اپنی فتحمندی کے نشے میں مخمور ہو کر جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ ایک نیا ردِّ فعل ( reaction ) شروع ہو جائے۔ وہ شروع ہوا۔ اُس نے اٹلی میں فیشزم اور جرمنی میں نازیزم کا روپ اختیار کیا۔ اور وحشیانہ طاقت کی بنیادوں پر بے روک آمریت دُنیا کے امن اور آزادی کو چیلنج دینے لگی۔ جب یہ صورتِ حال پیدا ہوئی، تو قدرتی طور پر دو نئی صفیں دُنیا کے سامنے آکھڑی ہوئیں۔ ایک جمہوریت اور آزادی کا ساتھ دینے والی، دوسری ارتجاعی ( reactionary ) قوتوں کو آگے بڑھانے والی۔ اور اس طرح لڑائی کا ایک نیا نقشہ بننا شروع ہو گیا۔ مسٹر چیمبرلین کی حکومت جس کے لئے فیشسٹ اٹلی اور نازی جرمنی سے کہیں زیادہ سوویٹ روس کی ہستی ناقابلِ برداشت تھی، اور جو اسے برطانی سامراج کے لیے ایک زندہ چیلنج سمجھتی تھی، تین برسوں تک اس منظر کا تماشا دیکھتی رہی۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ اُس نے اپنے طرزِ عمل سے کھلے طور پر فیشسٹ اور نازی قوتوں کی جرأتیں

سانس لے رہا ہے۔ لیکن ہم سب کو معلوم ہے کہ اس موقع پر برطانوی حکومت کا طرزِ عمل کیسا رہا؟ تبدیلی کی کوئی ذرا سی پرچھائیں بھی اُس پر پڑتی ہوئی دکھائی نہیں دی۔ ٹھیک اسی طرح جیسا کہ اُس کے سامراجی مزاج کا ڈیڑھ صدی سے خاصہ رہا ہے، اُس نے اپنے طرزِ عمل کا فیصلہ کر لیا، اور بغیر اس کے کہ کسی شکل اور کسی درجے تک بھی ہندوستان کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا موقع دیا گیا ہو، لڑائی میں اُس کے شامل ہو جانے کا اعلان کر دیا گیا۔ اس بات تک کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کہ ان نمائندہ اسمبلیوں ہی کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا ایک موقعہ دے دیا جائے، جسے خود برطانوی حکومت نے اپنی سیاسی بخششوں کی نمائش کرتے ہوئے ہندوستان کے سر تھوپا ہے۔

تمام دنیا کی طرح ہمیں بھی معلوم ہے کہ اس موقعہ پر برٹش امپائر کے تمام ملکوں کو اپنے اپنے طرزِ عمل کے فیصلہ کا کس طرح موقعہ دیا گیا تھا۔ کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ، آئرلینڈ، سب نے لڑائی میں شریک ہونے کا فیصلہ اپنی اپنی قانون ساز مجلسوں میں بغیر کسی باہر کی مداخلت کے کیا۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ آئرلینڈ نے شریک ہونے کی جگہ غیر جانبدار رہنے کا فیصلہ کیا، اور اُس کے اِس فیصلہ پر برطانیہ کے کسی باشندے کو تعجب نہیں ہوا۔ مسٹر ڈی ولیرا نے برطانیہ کے ہمسایہ میں کھڑے ہو کر صاف صاف کہہ دیا تھا کہ جب تک آلسٹر ( ulster ) کا سوال قابلِ اطمینان طریقہ پر طے نہیں ہوتا، وہ برطانیہ کی مدد کرنے سے انکار کرتا ہے!

لیکن برطانوی نوآبادیوں ( Dominions ) کے اس پورے مرقع میں ہندوستان کی جگہ کہاں دکھائی دے رہی ہے؟ جس ہندوستان کو آج یہ قیمتی خوش خبری سنائی جا رہی ہے کہ اسے برطانوی حکومت کے فیاض ہاتھوں سے جلد مگر کسی نامعلوم زمانے میں برطانوی نوآبادیوں ( Dominions ) کا درجہ ( status ) ملنے والا ہے، اُس کی ہستی کا کیونکر اعتراف کیا گیا؟ اس طرح، کہ اُسے دنیا کی تاریخ کی شاید سب سے

اپنے کانوں کو بند کر لیا۔ اس نے معاملے کے تمام پہلوؤں پر پورے سکون کے ساتھ غور کر کے وہ قدم اٹھایا، جسے آج ہندوستان سر اٹھا کر دنیا سے کہہ سکتا ہے، کہ اس صورتِ حال میں اس کے لیے وہی ایک ٹھیک قدم تھا۔ اس نے اپنے سارے فیصلے ملتوی کر دیے۔ اس نے برطانوی حکومت سے سوال کیا کہ وہ پہلے اپنا فیصلہ دنیا کے سامنے رکھ دے جس پر نہ صرف ہندوستان کا، بلکہ دنیا کے امن و انصاف کے سارے مقصدوں کا فیصلہ موقوف ہے۔ اگر اس لڑائی میں شریک ہونے کی ہندوستان کو دعوت دی گئی ہے تو ہندوستان کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ لڑائی کیوں لڑی جا رہی ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ اگر انسانی ہلاکت کی اس سب سے بڑی المناکی (tragedy) کا بھی وہی نتیجہ نکلنے والا نہیں ہے، جو پچھلی لڑائی کا نکل چکا ہے، اور یہ واقعی اس لیے لڑی جا رہی ہے کہ آزادی، جمہوریت اور امن کے ایک نئے نظم (order) سے دُنیا کو آشنا کیا جائے، تو پھر یقیناً ہندوستان کو اس مطالبے کا حق حاصل ہے کہ وہ معلوم کرے، خود اس کی قسمت پر ان مقصدوں کا کیا اثر پڑے گا؟

ورکنگ کمیٹی نے اپنے اس مطالبے کو ایک مفصّل اعلان کی صورت میں مرتب کیا۔ اور ۱۴ ستمبر ۱۹۳۹ء کو یہ شائع ہو گیا۔ اگر میں امید کروں کہ یہ اعلان ہندوستان کی نئی سیاسی تاریخ میں اپنے لیے ایک مناسب جگہ کا مطالبہ کرے گا، تو مجھے یقین ہے، میں آنے والے مورّخ سے کوئی بے جا توقع نہیں کر رہا ہوں۔ یہ سچّائی اور معقولیت (reason) کا ایک سادہ مگر ناقابلِ رد نوشتہ (document) ہے، جس کو صرف مسلّح طاقت کا بے پروا گھمنڈ ہی رد کر سکتا ہے۔ اس کی آواز اگرچہ ہندوستان میں اُٹھی، لیکن فی الحقیقت یہ صرف ہندوستان ہی کی آواز نہ تھی؛ یہ عالمگیر انسانیت کی زخمی اُمیدوں کی چیخ تھی۔ پچیس برس ہوئے کہ دُنیا بربادی اور ہلاکت کے ایک سب سے بڑے عذاب میں، جسے تاریخ کی نگاہیں دیکھ سکی ہیں، مبتلا کی گئی۔ اور صرف اس لیے مبتلا

ایک کے بعد ایک بڑھائیں۔ ابے سینیا، اسپین، آسٹریا، چیکوسلاواکیا، اور البانیا، کی ہستیاں ایک کے بعد ایک دُنیا کے نقشے سے مٹتی گئیں۔ اور برطانوی حکومت نے اپنی ڈگمگاتی ہوئی پالیسی سے، انھیں دفن کرنے میں برابر مدد دی۔ لیکن جب اس طرزِ عمل کا قدرتی نتیجہ اپنی انتہائی شکل میں اُبھر آیا، اور نازی جرمنی کا قدم بے روک آگے بڑھنے لگا، تو برطانوی حکومت بالکل بے بس ہوگئی۔ اسے لڑائی کے میدان میں اُترنا پڑا۔ کیونکہ اگر اب نہ اُترتی، تو جرمنی کی طاقت برطانوی شہنشاہی کے لیے ناقابل برداشت ہوجاتی۔ اب چھوٹی قوموں کی آزادی کے پرانے نعرے کی جگہ 'جمہوریت'، آزادی اور عالمگیر امن کے نئے نعروں نے لے لی، اور تمام دُنیا ان صداؤں سے گونجنے لگی۔ ۳ ستمبر کا اعلان جنگ انگلستان اور فرانس نے ان ہی صداؤں کی گونج میں کیا۔ اور دُنیا کی ان تمام بے چین روحوں نے جو یورپ کی نئی ارتجاعی (reactionary) قوتوں کی وحشیانہ زور آزمائیوں اور عالمگیر بد امنی کے عذاب سے حیران اور سراسیمہ ہو رہی تھیں، ان خوشنما صداؤں پر کان لگا دیے!

## کانگرس کا مطالبہ

۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو لڑائی کا اعلان ہوا۔ اور ۷ ستمبر کو آل انڈیا کانگرس ورکنگ کمیٹی واردھا میں اکٹھی ہوئی، تاکہ صورتِ حال پر غور کرے۔ ورکنگ کمیٹی نے اس موقع پر کیا کیا؟ کانگرس کے وہ تمام اعلان اُس کے سامنے تھے جو ۱۹۳۶ء سے لگاتار ہوتے رہے ہیں۔ اعلانِ جنگ کے بارے میں جو طرزِ عمل اختیار کیا گیا تھا، وہ بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں تھا۔ یقیناً اسے ملامت نہیں کی جا سکتی تھی، اگر وہ کوئی ایسا فیصلہ کر دیتی، جو اس صورتِ حال کا منطقی نتیجہ تھا۔ لیکن اس نے پوری احتیاط کے ساتھ اپنے دل و دماغ کی نگرانی کی۔ اُس نے وقت کے اُن تمام جذبوں سے جو تیز رفتاری کا تقاضہ کر رہے تھے،

نہیں ڈھونڈے جاسکتے۔ جہاں تک ہندستان کے مسئلہ کا تعلق ہے، وہ ہمیں بتاتا ہے کہ برطانوی حکومت نے ۱۹۱۹ء کے قانون کی تمہید میں اپنی جس پالسی کا اعلان کیا تھا اور جس کا نتیجہ ۱۹۳۵ء کے قانون کی شکل میں نکلا، آج بھی وہی پالسی اُس کے سامنے ہے۔ اس سے زیادہ اور اس سے بہتر وہ کچھ نہیں سکتی۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو وائسرائے کا اعلان شائع ہوا، اور ۲۲ اکتوبر کو ورکنگ کمیٹی اُس پر غور کرنے کے لیے واردھا میں بیٹھی۔ وہ بغیر کسی بحث کے اس نتیجہ پر پہنچی کہ یہ جواب کسی طرح بھی اسے مطمئن نہیں کرسکتا، اور اب اسے اپنا وہ فیصلہ بلا تامل کر دینا چاہیے جو اس وقت تک اس نے ملتوی کر رکھا تھا۔ جو فیصلہ کمیٹی نے کیا، وہ اُس کی تجویز کے لفظوں میں یہ ہے:

> ان حالات میں کمیٹی کے لیے ممکن نہیں کہ وہ برطانوی حکومت کی سامراجی پالسی کو منظور کر لے۔ کمیٹی کانگرس وزارتوں کو ہدایت کرتی ہے کہ جو راہ اب ہمارے سامنے کھل گئی ہے، اس کی طرف بڑھتے ہوئے بطور ایک ابتدائی قدم کے اپنے اپنے صوبوں کی حکومتوں سے مستعفی ہو جائیں۔"

چنانچہ آٹھوں صوبوں میں وزارتوں نے استعفا دے دیا۔

یہ تو اس سلسلہ کی ابتدا تھی۔ اب دیکھنا چاہیے کہ یہ سلسلہ زیادہ سے زیادہ کہاں تک پہنچتا ہے؟ وائسرائے ہند کا ایک کمیونکے جو ۵ فروری کو دہلی سے شائع ہوا اور جو اُس گفتگو کا خلاصہ بیان کرتا ہے جو مہاتما گاندھی سے ہوئی تھی اور پھر خود مہاتما گاندھی کا بیان جو انھوں نے ۶ فروری کو شائع کیا، اس کی آخری کڑی سمجھی جاسکتی ہے۔ اس کا خلاصہ ہم سب کو معلوم ہے۔ برطانوی حکومت اس بات کی پوری خواہش رکھتی ہے کہ ہندستان جلد سے جلد وقت میں جو صورت حال کے لحاظ سے ممکن ہو، برطانوی نوآبادیوں کا درجہ حاصل کر لے، اور درمیانی زمانے کی مدت جہاں تک ممکن ہو کم کی جائے۔ مگر وہ

کی گئی، تاکہ اس کے بعد اس سے بھی زیادہ ایک سخت عذاب کی تیاریوں میں لگ جائے۔
کمزور قوموں کی آزادی، امن کی ضمانت، خود اختیاری فیصلہ (self-determi nation) ہتھیاروں کی حد بندی، بین القومی (international) پنچایت کا قیام، یہ اور اسی طرح کے سارے اونچے اور خوش نما مقصدوں کی صداؤں سے قوموں کے کانوں پر جادو کیا گیا۔ اُن کے دلوں میں اُمیدیں سُلگائی گئیں۔ مگر بالآخر کیا نتیجہ نکلا؟ ہر صدا فریب نکلی! ہر جلوہ خواب و خیال ثابت ہوا! آج پھر قوموں کے گلوں کو خون اور آگ کی ہولناکیوں میں ڈھکیلا جا رہا ہے۔ کیا معقولیت (reason) اور حقیقت کی موجودگی سے ہمیں اس درجہ مایوس ہو جانا چاہیے کہ ہم موت اور بربادی کے سیلاب میں کودنے سے پہلے یہ بھی معلوم نہیں کر سکتے کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ اور خود ہماری قسمت پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟

## برطانوی حکومت کا جواب اور کانگرس کا پہلا قدم

کانگرس کے اس مطالبہ کے جواب میں برطانوی حکومت کی جانب سے بیانوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا، جو ہندوستان اور انگلستان میں ہوتے رہے۔ اس سلسلے کے لیے پہلی کڑی والیسرائے ہند کا وہ اعلان بہم پہنچاتا ہے جو ۱۷ اکتوبر کو دہلی سے شائع ہوا۔ یہ اعلان جو شاید حکومتِ ہند کے سرکاری علمِ ادب (official literature) کے الجھے ہوئے انداز، اور تھکا دینے والی طوالت کا سب سے زیادہ مکمل نمونہ ہے، صفحوں کے صفحے پڑھ جانے کے بعد بھی اس قدر بتانے پر بمشکل آمادہ ہوتا ہے کہ لڑائی کے مقصد کے لیے برطانوی وزیرِ اعظم کی ایک تقریر پڑھنی چاہیے، جو صرف یورپ کے امن اور بین القومی (international) رشتوں کی درستگی کا ذکر کرتی ہے۔ "جمہوریت" اور "قوموں کی آزادی" کے لفظ اس میں

ذہنیت کی ترجمانی کر رہا ہے، جو تقریباً دو صدیوں سے دنیا کے سامنے رہی ہے۔ اٹھارویں اور اُنیسویں صدی میں انسان کے انفرادی اور جماعتی آزادی کے جس قدر اصول قبول کیے گئے، ان کے مطالبے کا حق صرف یورپی قوموں ہی کے لیے خاص سمجھا گیا، اور یورپ کی قوموں میں بھی مسیحی یورپ کے تنگ دائرے سے کبھی باہر نہ جا سکا۔ آج بیسویں صدی کے درمیانی عہد میں دنیا اس قدر بدل چکی ہے کہ پچھلی صدی کے فکر اور عمل کے نقشے تاریخ کی پرانی کہانیوں کی طرح سامنے آتے ہیں، اور ہمیں ان نشانوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں جنھیں ہم بہت دور پیچھے چھوڑ آئے۔ لیکن ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ کم از کم ایک نشان اب بھی ہمارے پیچھے نہیں ہے، وہ ہمارے ساتھ ساتھ آ رہا ہے۔ وہ انسانی حقوق کے لیے یورپ کا امتیازی نشان ہے۔

ٹھیک ٹھیک معاملہ کا ایسا ہی نقشہ ہندستان کے سیاسی اور قومی حق کے سوال نے بھی ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ ہم نے جب اعلانِ جنگ کے بعد یہ سوال اٹھایا کہ لڑائی کا مقصد کیا ہے، اور ہندستان کی قسمت پر اس کا کیا اثر پڑنے والا ہے؟ تو ہم اس بات سے بے خبر نہ تھے کہ برطانوی حکومت کی پالیسی ۱۹۱۷ء اور ۱۹۱۹ء میں میں کیا رہ چکی ہے۔ ہم معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ۱۹۳۹ء کی اُس دنیا میں جو دلوں کے اندر صدیوں کی چال سے بدلتی اور پلٹتی ہوئی دوڑ رہی ہے، ہندوستان کو برطانوی حکومت کس جگہ سے دیکھنا چاہتی ہے! اس کی جگہ اب بھی بدلی ہے یا نہیں؟ ہمیں صاف جواب مل گیا کہ نہیں بدلی۔ وہ اب بھی سامراجی مزاج میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکی ہے۔ ہمیں یقین دلایا جاتا ہے کہ برطانوی حکومت بہت زیادہ اس کی خواہش مند ہے کہ ہندستان جہاں تک جلد ممکن ہو، نوآبادیات (dominion status) کا درجہ حاصل کر لے۔ ہمیں معلوم تھا کہ برطانوی حکومت نے اپنی یہ خواہش ظاہر کی ہے۔ اب ہمیں یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ وہ

ہندستان کا یہ حق ماننے کے لیے تیار نہیں کہ بغیر باہر کی مداخلت کے وہ اپنا دستورِ اساسی (کانسٹی ٹیوشن) خود اپنے چنے ہوئے نمایندوں کے ذریعہ بنا سکتا ہے، اور اپنی قسمت کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں برطانوی حکومت ہندستان کے لیے خود اختیاری فیصلے (self-determination) کا حق تسلیم نہیں کر سکتی۔
حقیقت کی ایک چھوت (touch) سے دکھاوے کا سارا طلسم کس طرح نابود ہو گیا! پچھلے چار برسوں سے جمہوریت اور آزادی کی حفاظت کے نعروں سے دنیا گونج رہی تھی۔ انگلستان اور فرانس کی حکومتوں کی زیادہ سے زیادہ ذمّہ دار زبانیں اس بارے میں جو کچھ کہتی رہی ہیں، وہ ابھی اس قدر تازہ ہیں کہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں مگر جونہی ہندستان نے یہ سوال اُٹھایا، حقیقت کو بے پردہ ہو کر سامنے آجانا پڑا۔ اب ہمیں بتایا جاتا ہے کہ قوموں کی آزادی کی حفاظت بلا شبہ اس لڑائی کا مقصد ہے، مگر اس کا دائرہ یورپ کی جغرافیائی حدوں سے باہر نہیں جا سکتا۔ ایشیا اور افریقہ کے باشندوں کو یہ جراُت نہیں کرنی چاہیے کہ اُمید کی نگاہ اُٹھائیں۔ مسٹر چیمبرلین نے ۲۴ فروری کو برمنگھم میں تقریر کرتے ہوئے یہ حقیقت اور زیادہ واضح کر دی ہے، اگرچہ ان کی تقریر سے پہلے بھی ہمیں اس بارے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ انھوں نے ہمارے لیے برطانوی حکومت کے صاف طرزِ عمل کے ساتھ صاف قول بھی بہم پہنچا دیا۔ وہ لڑائی کے برطانوی مقاصد کا اعلان کرتے ہوئے دنیا کو یہ یقین دلاتے ہیں:

> ہماری لڑائی اس لیے ہے کہ ہم اس امر کی ضمانت حاصل کرلیں کہ یورپ کی چھوٹی قومیں آیندہ اپنی آزادی کو بے جا زیادتیوں کی دھمکیوں سے بالکل محفوظ پائیں گی۔"

برطانوی حکومت کا یہ جواب اس موقع پر اگرچہ برطانی زبان سے نکلا ہے، مگر فی الحقیقت وہ اپنی قسم میں خالص برطانی نہیں ہے، بلکہ ٹھیک ٹھیک براعظم یورپ کی اُس عام

کا جو قدم ۱۹۴۱ء میں اٹھایا تھا، ہم نے اعلانِ جنگ کے بعد واپس لے لیا۔ اس لیے قدرتی طور پر ہمارا رُخ ترک تعاون (Non cooperation) کی طرف تھا۔ ہم آج اُس جگہ کھڑے ہیں جہاں ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ اس رُخ کی طرف آگے بڑھیں یا پیچھے ہٹیں؟ جب قدم اٹھا دیا جائے تو وہ رُک نہیں سکتا۔ اگر رُکے گا تو پیچھے ہٹے گا۔ ہم پیچھے ہٹنے سے انکار کرتے ہیں۔ ہم صرف یہی کر سکتے ہیں کہ آگے بڑھیں۔ مجھے یقین ہے کہ میں آپ سب کے دلوں کی آواز اپنی آواز کے ساتھ ملا رہا ہوں، جب میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ ہم آگے بڑھیں گے!

## باہمی مفاہمت

اس سلسلے میں قدرتی طور پر ایک سوال سامنے آجاتا ہے۔ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ قوموں کی کشمکش میں ایک طاقت جبھی اپنا قبضہ چھوڑ سکتی ہے، جبکہ دوسری طاقت اسے ایسا کرنے پر مجبور کر دے۔ اور معقولیت اور اخلاق کے اعلیٰ اصول افراد کا طرزِ عمل بدلتے رہے ہیں، مگر غلبہ جمائی ہوئی قوموں کی خود غرضیوں پر کبھی اثر نہیں ڈال سکے۔ آج بھی ہم عین بیسویں صدی کے درمیانی عہد میں دیکھ رہے ہیں کہ یورپ کی نئی ارتجاعی (reactionary) قوموں نے کس طرح انسان کے انفرادی اور قومی حقوق کے تمام عقیدے تہ وبالا کر دیئے، اور انصاف اور معقولیّت (reason) کی جگہ صرف وحشیانہ طاقت کی دلیل فیصلوں کے لیے اکیلی دلیل رہ گئی۔ لیکن ساتھ ہی جہاں دنیا تصویر کا یہ مایوس رُخ ابھار رہی ہے، وہیں امید کا ایک دوسرا رُخ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ بلا امتیاز دنیا کے بے شمار انسانوں کی ایک نئی عالمگیر بیداری بھی ہے۔ جو نہایت تیزی کے ساتھ ہر طرف اُبھر رہی ہے۔ یہ دنیا کے پرانے نظم (order) کی نامرادیوں سے تھک گئی ہے، اور معقولیت، انصاف

اس کی "بہت زیادہ خواہش مند ہے۔" مگر سوال برطانوی حکومت کی خواہش اور اس کی خواہش کے مختلف درجوں کا نہیں ہے۔ صاف اور سادہ سوال ہندستان کے حق کا ہے۔ ہندستان کو یہ حق حاصل ہے یا نہیں کہ وہ اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرے ؟ اسی سوال کے جواب پر وقت کے سارے سوالوں کا جواب موقوف ہے۔ ہندستان کے لیے یہ سوال بنیاد کی اصلی اینٹ ہے۔ وہ اِسے نہیں ہلنے دیگا اگر یہ ہل جائے، تو اس کی قومی ہستی کی ساری عمارت ہل جائیگی۔

جہاں تک لڑائی کے سوال کا تعلق ہے ہمارے لیے صورتِ حال بالکل واضح ہوگئی۔ ہم برطانوی سامراج کا چہرہ اس لڑائی کے اندر بھی اسی طرح صاف صاف دیکھ رہے ہیں، جس طرح ہم نے پچھلی لڑائی میں دیکھا تھا۔ ہم تیار نہیں کہ اس چہرے کی فتحمندیوں کے لیے لڑائی میں حصہ لیں۔ ہمارا مقدمہ بالکل صاف ہے۔ ہم اپنی محکومیت کی عمر بڑھانے کے لیے برطانوی سامراج کو زیادہ طاقتور اور زیادہ فتحمند نہیں دیکھنا چاہتے۔ ہم ایسا کرنے سے صاف صاف انکار کرتے ہیں۔ ہماری راہ یقیناً بالکل اس کے مقابل سمت جارہی ہے۔

## ہم آج کہاں کھڑے ہیں ؟

اب ہم اُس جگہ پہ واپس آجائیں، جہاں سے ہم چلے تھے۔ ہم نے اس سوال پر غور کرنا چاہا تھا کہ ۳ ستمبر کے اعلانِ جنگ کے بعد جو قدم ہم اٹھا چکے ہیں، اس کا رخ کس طرف ہے ؟ اور ہم آج کہاں کھڑے ہیں ؟ میں یقین کرتا ہوں کہ ان دونوں سوالوں کا جواب اس وقت ہم میں سے ہر شخص کے دل میں اس طرح صاف صاف اُبھر آیا ہوگا کہ اب اُسے صرف زبانوں تک پہنچنا ہی باقی رہ گیا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ کے لب ہلیں، میں آپ کے لبوں کو ہلتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ ہم نے عارضی تعاون (cooperation)

یہ ہے کہ باوجود ان اعلانوں کے برطانوی سامراج آج بھی اُسی طرح امن اور انصاف کی راہ روکے کھڑا ہے جس طرح لڑائی سے پہلے تھا۔ ہندستان کا مطالبہ اس طرح کے تمام دعووں کے لیے ایک حقیقی کسوٹی تھی۔ دعوے کسوٹی پر کسے گئے، اور اپنی سچائی کا ہمیں یقین نہ دلا سکے!

# ہندستان کا سیاسی مستقبل اور اقلیتیں

جہاں تک وقت کے اصلی سوال کا تعلق ہے، معاملہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے جو میں نے اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے رکھ دیا۔ گذشتہ ستمبر میں جب اعلان جنگ کے بعد کانگریس نے اپنا مطالبہ ترتیب دیا، تو اُس وقت ہم میں سے کسی شخص کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں گذری تھی کہ اس صاف اور سادہ مطالبہ میں جو ہندستان کے نام پر کیا گیا ہے اور جس سے ملک کے کسی فرقہ اور کسی گروہ کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا، فرقہ وارانہ مسئلہ کا سوال اُٹھایا جا سکیگا۔ بلاشبہہ ملک میں ایسی جماعتیں موجود ہیں جو سیاسی جدوجہد کے میدان میں وہاں تک نہیں جا سکتیں، جہاں تک کانگریس کے قدم پہنچ گئے ہیں اور براہِ راست اقدامِ عمل (ڈائرکٹ ایکشن) کے طریقہ سے جو سیاسی ہندستان کی اکثریت نے اختیار کر لیا ہے، متفق نہیں ہیں۔ لیکن جہاں تک ملک کی آزادی اور اُس کے قدرتی حق کے اعتراف کا تعلق ہے، ہندستان کی ذہنی بیداری اب اُن ابتدائی منزلوں سے بہت دور نکل چکی کہ ملک کا کوئی گروہ بھی اس مقصد سے اختلاف کرنے کی جرأت کر سکے۔ وہ جماعتیں بھی جو اپنے طبقہ (کلاس) کے خاص مفاد کے تحفظ کے لیے مجبور ہیں کہ موجودہ سیاسی صورتِ حال کی تبدیلی کے خواہش مند نہ ہوں، وقت کی عام آب و ہوا کے تقاضہ سے بے بس ہو رہی ہیں اور اُنھیں بھی ہندستان کی سیاسی منزلِ مقصود کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ تاہم جہاں وقت کے آزمایشی سوال نے صورتِ حال کے دوسرے گوشوں پر سے پردے اٹھا دیے،

اور امن کے ایک نئے نظم کے لیے بے قرار ہے۔ دنیا کی یہ نئی بیداری جس نے پچھلی لڑائی کے بعد سے انسانی روحوں کی گہرائیوں میں کروٹ بدلنا شروع کر دیا تھا، اب روز بروز دماغوں اور زبانوں کی سطح پر اُبھر رہی ہے؛ اور اس طرح اُبھر رہی ہے کہ شاید تاریخ میں کبھی نہیں اُبھری۔ ایسی حالت میں کیا یہ بات وقت کے امکانوں کے دائرے سے باہر تھی کہ تاریخ میں ان کے پرانے فیصلوں کے خلاف ایک نئے فیصلے کا اضافہ ہوتا؟ کیا ممکن نہیں کہ دنیا کی دو بڑی قومیں جنھیں حالات کی رفتار نے حکومت اور محکومیت کے رشتے سے جمع کر دیا تھا، آیندہ کے لیے معقولیت، انصاف اور امن کے رشتوں سے اپنا نیا تعلق جوڑنے کے لئے تیار ہو جائیں؟ عالمگیر جنگ کی مایوسیاں کس طرح امیدوں کی ایک نئی زندگی میں بدل جاتیں، معقولیت اور انصاف کے دور کی ایک نئی صبح کس طرح دنیا کو ایک نئے سورج کا پیام دینے لگتی۔ انسانیت کی کیسی بے مثال اور عالمگیر فتحمندی ہوتی، اگر آج برطانی قوم سر اٹھا کر دنیا سے کہ سکتی کہ اس نے تاریخ میں ایک نئی مثال بڑھانے کا کام انجام دیا ہے!

یقیناً یہ ناممکن نہیں ہے، مگر دنیا کی تمام دشواریوں سے کہیں دشوار ہے!

وقت کی ساری پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں انسانی نطرت کا یہی ایک روشن پہلو ہے، جو مہاتما گاندھی کی عظیم روح کو کبھی تھکنے نہیں دیتا۔ وہ باہمی مفاہمت کے دروازے میں جو ان پر کھولا جاتا ہے، بغیر اس کے کہ اپنی جگہ کو ذرا بھی کمزور محسوس کریں، بلا تامل قدم رکھنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

برطانوی کابینہ (Cabinet) کے متعدد ممبروں نے لڑائی کے بعد دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ برطانوی سامراج کا پچھلا دور اب ختم ہو چکا، اور آج برطانوی قوم صرف امن اور انصاف کے مقصدوں کو اپنے سامنے رکھتی ہے۔ ہندوستان سے بڑھ کر اور کونسا ملک ہو سکتا ہے جو آج کسی ایسے اعلان کا استقبال کرتا! لیکن واقع

کہ وہ اس مسئلہ کی موجودگی کا اعتراف نہیں کرے گی۔ یہ مسئلہ موجود ہے اور اگر ہم آگے بڑھنا چاہتے ہیں، تو ہمارا فرض ہے کہ اس کی موجودگی مان کر قدم اٹھائیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہر قدم جو اس کی موجودگی سے بے پرواہ کر اٹھے گا، یقیناً ایک غلط قدم ہوگا۔ لیکن فرقہ وارانہ مسئلہ کی موجودگی کے اعتراف کے معنی صرف یہی ہونے چاہییں کہ اس کی موجودگی کا اعتراف کیا جائے۔ یہ معنی نہیں ہونے چاہییں کہ اسے ہندستان کے قومی حق کے خلاف بطور ایک آلہ کے استعمال کیا جائے۔ برطانوی شہنشاہی ہمیشہ اس مسئلہ کو اسی غرض سے کام میں لاتی رہی۔ اگر اب وہ اپنی ہندستانی تاریخ کا پچھلا دور ختم کرنے پر مائل ہے، تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے پہلا گوشہ جس میں ہم قدرتی طور پر اس تبدیلی کی جھلک دیکھنی چاہیں گے، وہ یہی گوشہ ہے۔

کانگرس نے فرقہ وارانہ مسئلہ کے بارے میں اپنے لیے جو جگہ بنائی ہے، وہ کیا ہے؟ کانگرس کا اوّل دن سے دعوا رہا ہے کہ وہ ہندستان کو بہ حیثیتِ مجموعی اپنے سامنے رکھتی ہے، اور جو قدم بھی اٹھانا چاہتی ہے، ہندستانی قوم کے لیے اٹھانا چاہتی ہے۔ ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ کانگرس نے یہ دعوا کرکے دنیا کو اس بات کا حق دے دیا ہے کہ وہ جس قدر بے رحم نکتہ چینی کے ساتھ چاہے، اس کے طرزِ عمل کا جائزہ لے، اور کانگرس کا فرض ہے کہ اس جائزہ میں اپنے کو کامیاب ثابت کرے۔ میں چاہتا ہوں کہ معاملہ کا یہ پہلو سامنے رکھ کر ہم آج کانگر کے طرزِ عمل پر نئے سرے سے ایک نگاہ ڈال لیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی آپ سے کہا ہے، اس بارے میں قدرتی طور پر تین باتیں ہی سامنے آسکتی ہیں: فرقہ وارانہ مسئلہ کی موجودگی، اس کی اہمیت، اس کے فیصلے کا طریقہ۔

کانگر کی پوری تاریخ اس کی گواہی دیتی ہے کہ اس نے اس مسئلہ کی موجودگی کا ہمیشہ اعتراف کیا۔ اس نے اس کی اہمیت کو گھٹانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اس نے اس کے فیصلہ کے لیے وہی طریقہ تسلیم کیا، جس سے زیادہ قابلِ اطمینان طریقہ اس بارے میں کوئی نہیں بتا دیا

وہیں اس گوشے کو بھی بے نقاب کر دیا۔ ہندستان اور انگلینڈ، دونوں جگہ یکے بعد دیگرے اس طرح کی کوششیں کی گئیں کہ وقت کے سیاسی سوال کو فرقہ وارانہ مسئلہ کے ساتھ خلط ملط کر کے سوال کی اصلی حیثیت مشتبہ کر دی جائے۔ بار بار دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی گئی کہ ہندستان کے سیاسی مسئلہ کے حل کی راہ میں اقلیتوں کا مسئلہ حارج ہو رہا ہے۔

اگر پچھلے ڈیڑھ سو برس کے اندر ہندستان میں برطانوی شہنشاہی کا یہ طرزِ عمل رہ چکا ہو کہ ملک کے باشندوں کے اندرونی اختلافات کو اُبھار کر نئی نئی صفوں میں تقسیم کیا جائے، اور پھر ان صفوں کو اپنی حکومت کے استحکام کے لیئے کام میں لائے، تو یہ ہندستان کی سیاسی محکومیت کا ایک قدرتی نتیجہ تھا، اور ہمارے لیے اب بے سود ہے کہ اِس کی شکایت سے اپنے جذبات میں کڑواہٹ پیدا کریں۔ ایک اجنبی حکومت یقیناً اس ملک کے اندرونی اتحاد کی خواہش مند نہیں ہو سکتی جس کی اندرونی پھوٹ ہی اُس کی موجودگی کے لیے سب سے بڑی ضمانت ہے۔ لیکن ایک ایسے زمانہ میں جبکہ دنیا کو یہ باور کرانے کی کوششیں کی جارہی ہیں کہ برطانوی شہنشاہیت کی ہندستانی تاریخ کا پچھلا دور ختم ہو چکا، یقیناً یہ کوئی بڑی توقع نہ تھی اگر ہم برطانوی مدبروں سے امید رکھتے تھے کہ کم از کم اِس گوشے میں وہ اپنے طرزِ عمل کو پچھلے عہد کی دماغی وراثت سے بچانے کی کوشش کریں گے۔ لیکن پچھلے پانچ مہینوں کے اندر واقعات کی جو رفتار رہ چکی ہے اُس نے ثابت کر دیا کہ ابھی ایسی امیدوں کے رکھنے کا وقت نہیں آیا، اور جس دور کی نسبت دنیا کو یقین دلایا جارہا ہے کہ ختم ہو گیا، اسے ابھی ختم ہونا باقی ہے۔

بہر حال اسباب خواہ کچھ ہی رہے ہوں لیکن ہم تسلیم کرتے ہیں کہ دنیا کے تمام ملکوں کی طرح ہندستان بھی اپنے اندرونی مسائل رکھتا ہے، اور ان مسئلوں میں ایک اہم مسئلہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا ہے۔ ہم برطانوی حکومت سے یہ توقع نہیں رکھتے، اور ہمیں رکھنی بھی نہیں چاہیے

ہوا، جس کے ترتیب دینے میں مجھے شریک رہنے کی عزت حاصل نہ رہی ہو۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس انیس برس میں ایک دن بھی ایسا کانگرس کے دماغ پر نہیں گزرا، جب اس نے اس مسئلہ کا فیصلہ اس کے سوا کسی طریقہ سے بھی کرنے کا خیال کیا ہو۔ یہ صرف اس کا اعلان ہی نہ تھا اس کا مضبوط اور طے کیا ہوا طرزِ عمل تھا۔ پچھلے پندرہ برسوں کے اندر بار بار اس طرزِ عمل کے لیے سخت سے سخت آزمائشیں پیدا ہوئیں، مگر یہ چٹان اپنی جگہ سے کبھی نہ ہل سکی۔

آج بھی اس نے دستور ساز مجلس (کانسٹی ٹوانٹ اسمبلی) کے سلسلے میں اس مسئلہ کا جس طرح اعتراف کیا ہے، وہ اس کے لیے کافی ہے کہ ان دونوں اصولوں کو ان کی زیادہ سے زیادہ صاف شکل میں دیکھ لیا جائے۔ تسلیم شدہ اقلیتوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ چاہیں تو خالص اپنے ووٹوں سے اپنے نمایندوں کو چن کر بھیجیں۔ اُن کے نمایندوں کے کاندھوں پر اپنے فرقہ کی رایوں کے سوا اور کسی کی رائے کا بوجھ نہ ہوگا۔ جہاں تک اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کے مسائل کا تعلق ہے، فیصلہ کا ذریعہ مجلس (اسمبلی) کی کثرتِ رائے نہیں ہوگی، خود اقلیتوں کی رضامندی ہوگی۔ اگر کسی مسئلہ میں اتفاق نہ ہوسکے، تو کسی غیر جانبدار پنچایت کے ذریعہ فیصلہ کرایا جا سکتا ہے، جسے اقلیتوں نے بھی تسلیم کر لیا ہو۔ آخری تجویز محض ایک احتیاطی بیش بندی ہے۔ ورنہ اس کا بہت کم امکان ہے کہ اس طرح کی صورتیں پیش آئیں گی۔ اگر اس تجویز کی جگہ کوئی دوسری قابلِ عمل تجویز ہو سکتی ہے تو اُسے اختیار کیا جا سکتا ہے۔

اگر کانگرس نے اپنے طرزِ عمل کے لیے یہ اصول سامنے رکھ لیے ہیں، اور پوری کوشش کر چکی ہے اور کر رہی ہے کہ ان پر قائم رہے، تو پھر اس کے بعد اور کونسی بات رہ گئی ہے جو برطانوی مدبّروں کو اس پر مجبور کرتی ہے کہ اقلیتوں کے حقوق کا مسئلہ ہمیں بار بار یاد دلائیں اور دُنیا کو اس غلط فہمی میں مبتلا کریں کہ ہندستان کے مسئلہ کی راہ میں اقلیتوں کا مسئلہ راستہ

جاسکتا، اور اگر بتلایا جاسکتا ہے، تو اس کی طلب میں اس کے دونوں ہاتھ ہمیشہ بڑھے رہے اور آج بھی بڑھے ہوئے ہیں!

اس کی اہمیت کا اعتراف اس سے زیادہ ہمارے تخیل پر کیا اثر ڈال سکتا ہے کہ اسے ہندستان کے قومی مقصد کی کامیابی کے لیے سب سے پہلی شرطِ یقین کریں؟ میں اس واقعہ کو بطور ایک ناقابلِ انکار حقیقت کے پیش کردوں گا کہ کانگرس کا ہمیشہ ایسا ہی یقین رہا۔

کانگرس نے ہمیشہ اس بارے میں دو بنیادی اصول اپنے سامنے رکھے، اور جب کبھی کوئی قدم اٹھایا تو ان دونوں اصولوں کو صاف صاف اور قطعی شکل میں مان کر اُٹھایا:

۱۔ ہندستان کا جو دستورِ اساسی (کانسٹی ٹیوشن) بھی آیندہ بنایا جائے، اس میں اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کی پوری ضمانت ہونی چاہیے۔

۲۔ اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کے لیے کن کن تحفظات (سیف گارڈز) کی ضرورت ہے؟ اس کے لیے جج خود اقلیتیں ہیں، نہ کہ اکثریتیں۔ اس لیے تحفظات کا فیصلہ ان کی رضامندی سے ہونا چاہیے، نہ کہ کثرت رائے سے۔

اقلیتوں کا مسئلہ صرف ہندستان ہی کے حصے میں نہیں آیا ہے۔ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی رہ چکا ہے۔ میں آج اس جگہ سے دنیا کو مخاطب کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا اس سے بھی زیادہ کوئی صاف اور بے لاگ طرزِ عمل اس بارے میں اختیار کیا جاسکتا ہے؟ اگر کیا جاسکتا ہے تو وہ کیا ہے؟ کیا اس طرزِ عمل میں کوئی بھی ایسی خامی رہ گئی ہے جس کی بنا پر کانگرس کو اس کا فرض یاد دلانے کی ضرورت ہو؟ کانگرس اپنے ادائے فرض کی خامیوں پر غور کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہی ہے اور آج بھی تیار ہے۔

میں انیس برس سے کانگرس میں ہوں۔ اس تمام عرصے میں کانگرس کا کوئی اہم فیصلہ ایسا نہیں

اور اس لیے انھیں ایک جمہوری ہندستان میں اپنے حقوق و مفاد کی طرف سے اندیشہ ناک رہنا چاہیے۔ اس ایک بنیادی غلطی نے بے شمار غلط فہمیوں کی پیدائش کا دروازہ کھول دیا۔ غلط بنیادوں پر غلط دیواریں چُنی جانے لگیں۔ اس نے ایک طرف تو خود مسلمانوں پر ان کی حقیقی حیثیت مشتبہ کر دی۔ دوسری طرف دنیا کو ایک ایسی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا، جس کے بعد وہ ہندستان کو اس کی صحیح صورتِ حال میں نہیں دیکھ سکتی۔

اگر وقت ہوتا تو میں آپ کو تفصیل کے ساتھ بتلاتا کہ معاملہ کی یہ غلط اور بناوٹی شکل گذشتہ ساٹھ برس کے اندر کیونکر ڈھالی گئی اور کن ہاتھوں سے ڈھلی؟ دراصل یہ بھی اسی پھوٹ کی پیداوار ہے جس کا نقشہ انڈین نیشنل کانگریس کی تحریک کے شروع ہونے کے بعد ہندستان کے سرکاری دماغوں میں بننا شروع ہو گیا تھا، اور جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو اس نئی سیاسی بیداری کے خلاف استعمال کرنے کے لیے تیار کیا جائے۔ اس نقشہ میں دو باتیں خاص طور سے ابھاری گئی تھیں۔ ایک یہ کہ ہندستان میں دو مختلف قومیں آباد ہیں: ایک ہندو قوم ہے، اور ایک مسلمان قوم ہے۔ اس لیے متحدہ قومیت کے نام پر یہاں کوئی مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری یہ کہ مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلہ میں بہت کم ہے، اس لیے یہاں جمہوری اداروں کے قیام کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے گی، اور مسلمانوں کی ہستی خطرہ میں پڑ جائے گی۔ میں اس وقت اور زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ میں صرف اتنی بات آپ کو یاد دلا دوں گا کہ اگر اس معاملہ کی ابتدائی تاریخ آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو ایک سابق وائسرائے ہند، لارڈ ڈفرن اور ایک سابق لفٹنٹ گورنر مغربی و شمالی (اب یونائیٹڈ پراونسز) سر آکلینڈ کالون کے زمانے کی طرف لوٹنا چاہیے۔

برطانوی سامراج نے ہندستان کی سرزمین میں وقتاً فوقتاً جو بیج ڈالے، ان میں سے ایک بیج یہ تھا۔ اس نے فوراً پھول پتے پیدا کیے۔ اور گو پچاس برس گزر چکے ہیں، مگر ابھی تک اس

روکے کھڑا ہے؟ اگر فی الحقیقت اسی مسئلہ کی وجہ سے رکاوٹ پیش آرہی ہے تو کیوں برطانوی حکومت ہندستان کی سیاسی قسمت کا صاف صاف اعلان کر کے ہمیں اس کا موقع نہیں دے دیتی کہ ہم سب مل کر بیٹھیں اور باہمی رضامندی سے اس مسئلہ کا ہمیشہ کے لیے تصفیہ کر لیں؟
ہم میں تفرقے پیدا کیے گئے اور ہمیں الزام دیا جاتا ہے کہ ہم میں تفرقے ہیں۔ ہمیں تفرقوں کے مٹانے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہمیں تفرقے مٹانے چاہییں۔ یہ صورتِ حال ہے جو ہمارے چاروں طرف پیدا کر دی گئی ہے۔ یہ بندھن ہیں جو ہمیں ہر طرف سے جکڑے ہوئے ہیں۔ تاہم اس حالت کی کوئی مجبوری بھی ہمیں اس سے باز نہیں رکھ سکتی کہ سعی اور ہمت کا قدم آگے بڑھائیں، کیونکہ ہماری راہ تمام تر دشواریوں کی راہ ہے اور ہمیں ہر دشواری پر غالب آنا ہے۔

## ہندستان کے مسلمان اور ہندستان کا مستقبل

یہ ہندستان کی اقلیتوں کا مسئلہ تھا۔ لیکن کیا ہندستان میں مسلمانوں کی حیثیت ایک ایسی اقلیت کی ہے جو اپنے مستقبل کو شک اور خوف کی نظر سے دیکھ سکتی ہے اور وہ تمام اندیشے اپنے سامنے لا سکتی ہے جو قدرتی طور پر ایک اقلیت کے دماغ کو مضطرب کر دیتے ہیں؟
مجھے نہیں معلوم، آپ لوگوں میں کتنے آدمی ایسے ہیں جن کی نظر سے میری وہ تحریریں گزر چکی ہیں جو آج سے اٹھائیس برس پہلے میں الہلال کے صفحوں پر لکھتا رہا ہوں۔ اگر چند اشخاص بھی ایسے موجود ہیں تو میں اُن سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنا حافظہ تازہ کر لیں۔ میں نے اس زمانے میں بھی اپنے اس عقیدے کا اظہار کیا تھا اور اسی طرح آج بھی کرنا چاہتا ہوں کہ ہندستان کے سیاسی مسائل میں کوئی بات بھی اس درجہ غلط نہیں سمجھی گئی ہے، جس درجہ یہ بات کہ ہندستان کے مسلمانوں کی حیثیت ایک سیاسی اقلیت کی حیثیت ہے۔

اس کی مجموعی تعداد ملک میں آٹھ نو کروڑ کے اندر ہے۔ وہ ملک کی دوسری جماعتوں کی طرح معاشرتی اور نسلی تقسیموں میں بٹی ہوئی نہیں ہے۔ اسلامی زندگی کی مساوات اور برادرانہ یک جہتی کے مضبوط رشتے نے اُسے معاشرتی تفرقوں کی کمزوریوں سے بہت حد تک محفوظ رکھا ہے۔ بلا شبہہ یہ تعداد ملک کی پوری آبادی میں ایک چوتھائی سے زیادہ نسبت نہیں رکھتی۔ لیکن سوال تعداد کی نسبت کا نہیں ہے، خود تعداد اور اس کی نوعیت کا ہے کیا انسانی مواد کی اتنی عظیم مقدار کے لیے اس طرح کے اندیشوں کی کوئی جائز وجہ ہوسکتی ہے کہ وہ ایک آزاد اور جمہوری ہندستان میں اپنے حقوق و مفاد کی خود نگہداشت نہیں کرسکے گی؟

یہ تعداد کسی ایک ہی رقبہ میں سمٹی ہوئی نہیں ہے، بلکہ ایک خاص تقسیم کے ساتھ ملک کے مختلف حصّوں میں پھیل گئی ہے۔ ہندستان کے گیارہ صوبوں میں سے چار صوبے ایسے ہیں، جہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے، اور دوسری مذہبی جماعتیں اقلیت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر برٹش بلوچستان کا بھی اس میں اضافہ کر دیا جائے تو چار کی جگہ مسلم اکثریت کے پانچ صوبے ہوجائیں گے۔ اگر ہم ابھی مجبور ہیں کہ مذہبی تفریق کی بنا پر ہی "اکثریت" اور "اقلیت" کا تصور کرتے رہیں، تو بھی اس تصوّر میں مسلمانوں کی جگہ محض ایک "اقلیّت" کی دکھائی نہیں دیتی۔ وہ اگر سات صوبوں میں اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں تو پانچ صوبوں میں انھیں اکثریت کی جگہ حاصل ہے۔ ایسی حالت میں کوئی وجہ نہیں کہ انھیں کو ایک اقلیت گروہ ہونے کا احساس مضطرب کرسکے۔

ہندستان کا آیندہ دستورِ اساسی (Constitution) اپنی تفصیلات میں خواہ کسی نوعیت کا ہو، مگر اس کی ایک بات ہم سب کو معلوم ہے۔ وہ کامل معنوں میں ایک آل انڈیا وفاق (Federations) کا جمہوری دستور ہوگا، جس کے تمام حلقے (Units) اپنے اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار ہوں گے، اور فیڈرل

کی جڑوں میں نمی خشک نہیں ہوئی !
سیاسی بول چال میں جب کبھی "اقلیت" کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ ریاضی کے عام حسابی قاعدے کے مطابق انسانی افراد کی ہر ایسی تعداد جو ایک دوسری تعداد سے کم ہو، لازمی طور پر "اقلیت" ہوتی ہے اور اسے اپنی حفاظت کی طرف سے مضطرب ہونا چاہیے۔ بلکہ اس سے مقصود ایک ایسی کمزور جماعت ہوتی ہے جو تعداد اور صلاحیت، دونوں اعتباروں سے اپنے کو اس قابل نہیں پاتی کہ ایک بڑے اور طاقتور گروہ کے ساتھ رہ کر اپنی حفاظت کے لیے خود اپنے اوپر اعتماد کر سکے۔ اس حیثیت کے تصور کے لیے صرف یہی کافی نہیں کہ ایک گروہ کی تعداد کی نسبت دوسرے گروہ سے کم ہو، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ بجائے خود کم ہو، اور اتنی کم ہو کہ اس سے اپنی حفاظت کی توقع نہ کی جا سکے۔
ساتھ ہی اس میں تعداد (Number) کے ساتھ نوعیت (kind) کا سوال بھی کام کرتا ہے۔ فرض کیجیے، ایک ملک میں دو گروہ موجود ہیں۔ ایک کی تعداد ایک کروڑ ہے۔ دوسرے کی دو کروڑ ہے۔ اب اگرچہ ایک کروڑ، دو کروڑ کا نصف ہوگا اور اس لیے دو کروڑ سے کم ہوگا، مگر سیاسی نقطۂ خیال سے ضروری نہ ہوگا کہ صرف اس نسبتی فرق کی بنا پر ہم اسے ایک اقلیت فرض کر کے اس کی کمزور ہستی کا اعتراف کر لیں۔
اس طرح کی اقلیت ہونے کے لیے تعداد کے نسبتی فرق کے ساتھ دوسرے عوامل (factors) کی موجودگی بھی ضروری ہے۔
اب ذرا غور کیجیے کہ اس لحاظ سے ہندستان میں مسلمانوں کی حقیقی حیثیت کیا ہے؟ آپ کو دیر تک غور کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ آپ صرف ایک ہی نگاہ میں معلوم کر لینگے کہ آپ کے سامنے ایک عظیم گروہ اپنی اتنی بڑی اور پھیلی ہوئی تعداد کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا ہے کہ اُس کی نسبت "اقلیت" کی کمزوریوں کا گمان بھی کرنا اپنی نگاہ کو صریح دھوکا دینا ہے۔

ضروری ہے کہ اپنے طرزِ عمل کا ایک صاف اور قطعی فیصلہ کرلیں۔ یہ فیصلہ ہم کیونکر کر سکتے ہیں؟ صرف اس طرح کہ معاملہ کی سطح پر نہ رہیں۔ اُس کی بنیادوں تک اُتریں، اور پھر دیکھیں کہ ہم اپنے آپ کو کس حالت میں پاتے ہیں۔ میں نے ایسا کیا، اور دیکھا کہ سارے معاملے کا فیصلہ صرف ایک سوال کے جواب پر موقوف ہے۔ ہم ہندستانی مسلمان ہندستان کے آزاد مستقبل کو شک اور بے اعتمادی کی نظر سے دیکھتے ہیں، یا خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے؟ اگر پہلی صورت ہے، تو بلا شبہ ہماری راہ بالکل دوسری ہو جاتی ہے۔ وقت کا کوئی اعلان، آیندہ کا کوئی وعدہ، دستورِ اساسی کا کوئی تحفظ، ہمارے شک اور خوف کا اصلی علاج نہیں ہو سکتا۔ ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ کسی تیسری طاقت کی موجودگی برداشت کریں۔ یہ تیسری طاقت موجود ہے اور اپنی جگہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں، اور ہمیں بھی خواہش رکھنی چاہیئے کہ وہ اپنی جگہ نہ چھوڑ سکے۔ لیکن اگر ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے لیے شک اور خوف کی کوئی وجہ نہیں، ہمیں خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے مستقبل کو دیکھنا چاہیے، تو پھر ہماری راہِ عمل بالکل صاف ہو جاتی ہے۔ ہم اپنے آپ کو بالکل ایک دوسرے عالم میں پانے لگتے ہیں۔ شک، تذبذب، بے عملی اور انتظار کی درماندگیوں کی یہاں پرچھائیں بھی نہیں پڑ سکتی۔ یقین، جماؤ، عمل اور سرگرمی کا سورج یہاں کبھی نہیں ڈوب سکتا۔ وقت کا کوئی الجھاؤ، حالات کا کوئی اتار چڑھاؤ، معاملوں کی کوئی چبھن، ہمارے قدموں کا رخ نہیں بدل سکتی۔ ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہندستان کے قومی مقصد کی راہ میں قدم اُٹھائے بڑھے جائیں!

مجھے اس سوال کا جواب معلوم کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی۔ میرے دل کے ایک ایک ریشے نے پہلی حالت سے انکار کیا۔ میرے لئے نا ممکن تھا کہ اس کا تصوّر بھی کر سکوں۔ میں کسی مسلمان کے لیے بشرطیکہ اس نے اسلام کی روح اپنے دل کے ایک ایک کونے سے ڈھونڈ کر نکال نہ پھینکی ہو، یہ ممکن نہیں سمجھتا کہ اپنے کو پہلی حالت میں دیکھنا برداشت

مرکز کے حصے میں صرف وہی معاملات رہیں گے جن کا تعلق ملک کے عام اور مجموعی مسائل سے ہوگا۔ مثلاً بیرونی تعلقات، دفاع کسٹم وغیرہ۔ ایسی حالت میں کیا ممکن ہے کہ کوئی دماغ جو ایک جمہوری دستور کے پوری طرح عمل میں آنے اور دستوری شکل میں چلنے کا نقشہ تھوڑی دیر کے لیے بھی اپنے سامنے لا سکتا ہے، اُن اندیشوں کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائے جنھیں اکثریت اور اقلیت کے اس پُر فریب سوال نے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے؟ میں ایک لمحہ کے لیے یہ باور نہیں کر سکتا کہ ہندستان کے مستقبل کے نقشے میں ان اندیشوں کے لیے کوئی جگہ نکل سکتی ہے۔ دراصل یہ تمام اندیشے اس لیے پیدا ہو رہے ہیں کہ ایک برطانی مدبّر کے مشہور لفظوں میں جو اس نے آئرلینڈ کے بارے میں کہے تھے:

ہم ابھی تک دریا کے کنارے کھڑے ہیں، اور گو تیرنا چاہتے ہیں مگر دریا میں اُترتے نہیں۔

ان اندیشوں کا صرف ایک ہی علاج ہے۔ ہمیں دریا میں بے خوف وخطر کود جانا چاہیے جوں ہی ہم نے ایسا کیا، ہم معلوم کر لیں گے کہ ہمارے تمام اندیشے بے بنیاد تھے!

## مسلمانانِ ہند کے لیے ایک بنیادی سوال

تقریباً تیس برس ہوئے جب میں نے بحیثیت ایک ہندستانی مسلمان کے اس مسئلہ پر پہلی مرتبہ غور کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت سیاسی جدوجہد کے میدان سے یک قلم کنارہ کش تھی، اور عام طور پر وہی ذہنیت ہر طرف چھائی ہوئی تھی جو ۱۸۸۸ء میں کانگرس سے علیحدگی اور مخالفت کی اختیار کر لی گئی تھی۔ وقت کی یہ آب وہوا میرے غور وفکر کی راہ نہ روک سکی۔ میں بہت جلد ایک آخری نتیجہ تک پہنچ گیا اور اس نے میرے سامنے یقین اور عمل کی راہ کھول دی۔ میں نے غور کیا کہ ہندستان اپنے تمام حالات کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہے، اور اپنے مستقبل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہم بھی اسی کشتی میں سوار ہیں، اور اس کی رفتار سے بے پروا نہیں رہ سکتے۔ اس لیے

میرے جن ہم مذہبوں نے ۱۹۱۲ء میں میری صداؤں کو قبول کیا تھا، مگر آج انھیں مجھ سے اختلاف ہے، میں اُنھیں اس اختلاف کے لیے ملامت نہیں کروں گا، مگر میں ان کے اخلاص اور سنجیدگی سے اپیل کروں گا یہ قوموں اور ملکوں کی قسمتوں کا معاملہ ہے؛ ہم اسے وقتی جذبات کی رو میں بہ کر طے نہیں کر سکتے۔ ہمیں زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی بنا پر اپنے فیصلوں کی دیواریں تعمیر کرنی ہیں۔ ایسی دیواریں روز بنائی اور ڈھائی نہیں جاسکتیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ بدقسمتی سے وقت کی فضا غبار آلود ہو رہی ہے۔ مگر انھیں حقیقت کی روشنی میں آنا چاہیے۔ وہ آج بھی ہر پہلو سے معاملے پر غور کرلیں، وہ اس کے سوا کوئی راہِ عمل اپنے سامنے نہیں پائیں گے۔

## مسلمان اور متّحدہ قومیّت

میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روائتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم وفنون، اسلام کی تہذیب، میری دولت کا سرمایہ ہے۔ اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں۔ اور میں برداشت نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی، وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندستانی ہوں۔ میں ہندستان کی ایک اور ناقابلِ تقسیم متّحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ میں اس متّحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں، جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا

کرے!

میں نے ۱۹۱۱ء میں "الہلال" جاری کیا اور اپنا یہ فیصلہ مسلمانوں کے سامنے رکھا۔ آپ کو یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ میری صدائیں بے اثر نہیں رہیں ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۶ء تک کا زمانہ مسلمانانِ ہند کی نئی سیاسی کروٹ کا زمانہ تھا۔ ۱۹۲۰ء کے اواخر میں جب چار برس کی نظربندی کے بعد میں رہا ہوا، تو میں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی سیاسی ذہنیت۔ اپنا پچھلا سانچا توڑ چکی ہے اور نیا سانچا ڈھل رہا ہے۔ اس واقعہ پر بیس برس گزر چکے۔ اس عرصے میں طرح طرح کے اتار چڑھاؤ ہوتے رہے۔ حالات کے نئے نئے سیلاب بہے۔ خیالات کی نئی نئی لہریں اٹھیں۔ تاہم ایک حقیقت بغیر کسی تبدیلی کے اب تک قائم ہے۔ مسلمانوں کی عام رائے پیچھے لوٹنے کے لیے تیار نہیں۔

ہاں، وہ اب پیچھے لوٹنے کے لیے تیار نہیں۔ لیکن آگے بڑھنے کی راہ اُس پر پھر مشتبہ ہو رہی ہے۔ میں اس وقت اسباب میں نہیں جاؤں گا۔ میں صرف اثرات دیکھنے کی کوشش کروں گا۔ میں اپنے ہم مذہبوں کو یاد دلاؤں گا کہ میں نے ۱۹۱۲ء میں جس جگہ سے انھیں مخاطب کیا تھا، آج بھی میں اسی جگہ کھڑا ہوں۔ اس تمام مدت نے حالات کا جو انبار ہمارے سامنے کھڑا کر دیا ہے، اُن میں سے کوئی حالت ایسی نہیں جو میرے سامنے سے نہ گزری ہو۔ میری آنکھوں نے دیکھنے میں اور میرے دماغ نے سوچنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ حالات میرے سامنے سے صرف گزرتے ہی نہ رہے، میں اُن کے اندر کھڑا رہا اور میں نے ایک ایک حالت کا جائزہ لیا۔ میں مجبور ہوں کہ اپنے مشاہدے کو نہ جھٹلاؤں، میرے لیے ممکن نہیں کہ اپنے یقین سے لڑوں۔ میں اپنے ضمیر کی آواز کو نہیں دبا سکتا۔ میں اس تمام عرصے میں ان سے کہتا رہا ہوں، اور آج بھی اُن سے کہتا ہوں کہ ہندستان کے نو کروڑ مسلمانوں کے لیے صرف وہی راہِ عمل ہو سکتی ہے جس کی میں نے ۱۹۱۲ء میں انھیں دعوت دی تھی۔

کے باشندوں کا مذہب چلا آتا ہے۔ جس طرح آج ایک ہندو فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندستانی ہے، اور ہندو مذہب کا پیرو ہے، ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندستانی ہیں اور مذہبِ اسلام کے پیرو ہیں۔ میں اس دائرے کو اس سے زیادہ وسیع کروں گا۔ میں ہندستانی مسیحی کا بھی یہ حق تسلیم کروں گا کہ وہ آج سر اُٹھا کے کہہ سکتا ہے کہ میں ہندستانی ہوں، اور باشندگانِ ہند کے ایک مذہب یعنی مسیحیت کا پیرو ہوں۔

ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک (ملی جُلی) تاریخ نے ہماری ہندستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ گئی ہو۔ ہماری بولیاں الگ الگ تھیں، مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے۔ ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے، مگر انھوں نے مِل جُل کر ایک نیا سانچا پیدا کر لیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پُرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے، اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے، جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ ہیں، جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی واپس لائیں، تو اُنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں، اور وہ کبھی پورا ہونے والا نہیں۔ اسی طرح اگر ایسے مسلمان دماغ موجود ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنی اُس گزری ہوئی تہذیب و معاشرت کو پھر تازہ کریں، جو وہ ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسطِ ایشیا سے لائے تھے، تو میں اُن سے بھی کہوں گا کہ اس خواب سے جس قدر جلد بیدار ہو جائیں بہتر ہے۔ کیونکہ یہ ایک غیر قدرتی تخیل ہے۔ اور حقیقت کی زمین

رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (factor) ہوں، میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔

ہندستان کے لیے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اُس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں، اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے۔ ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہو گئی اور پھر ایک کے بعد ایک سلسلہ جاری رہا۔ اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی، اور اس کی فیاض گود نے سب کے لیے جگہ نکالی۔ ان ہی قافلوں میں ایک آخری قافلہ ہم پیروانِ اسلام کا بھی تھا۔ یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشانِ راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا۔ اور ہمیشہ کے لیے بس گیا۔ یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملان تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ الگ بہتے رہے، لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے، دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا۔ جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا، اُسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے، پرانے ہندستان کی جگہ ایک نئے ہندستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔

ہم اپنے ساتھ اپنا ذخیرہ لائے تھے، یہ سرزمین بھی اپنے ذخیروں سے مالا مال تھی۔ ہم نے اپنی دولت اس کے حوالے کر دی اور اس نے اپنے خزانوں کے دروازے ہم پر کھول دیے۔ ہم نے اُسے اسلام کے ذخیرے کی وہ سب سے زیادہ قیمتی چیز دے دی جس کی اُسے سب سے زیادہ احتیاج تھی۔ ہم نے اسے جمہوریت اور انسانی مساوات کا پیام پہنچا دیا۔

تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعے پر گزر چکی ہیں۔ اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعوا رکھتا ہے جیسا دعوا ہندو مذہب کا ہے۔ اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس سرزمین کے باشندوں کا مذہب رہا ہے، تو اسلام بھی ایک ہزار برس سے اس

## ۱۲

# عربی نصاب کمیٹی

لکھنؤ، ۲۲ فروری ۱۹۴۷ء

۲۲ فروری ۱۹۴۷ء کو ۲ بجے دن سے ۴ بجے دن تک کمرہ نمبر ۸ لکھنؤ کونسل ہاؤس میں عربی و فارسی نصاب تعلیم کی اصلاحی کمیٹی کا جلسہ زیر صدارت مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم، حکومت ہند منعقد ہوا۔ مولانا موصوف نے حسب ذیل تقریر فرمائی۔

اگر آپ حضرات اجازت دیں، تو مجھے جو کچھ عرض کرنا ہے، وہ بیٹھے بیٹھے عرض کردں۔ میں کمیٹی کی طرف سے آپ تمام حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے کمیٹی کی دعوت منظور کی اور اس موقع کے لیے وقت نکالا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی بات جس پر میں آپ حضرات کی توجہ دلاؤں گا، وہ اس کمیٹی کے کاموں کی نوعیت ہے۔ یہ کمیٹی جس کام کے لیے مقرر کی گئی ہے، وہ کام اپنے دائرے کے لحاظ سے، نہ تو کوئی بڑا وسیع دائرہ رکھتا ہے، نہ اس کی ویسے کوئی خاص اہمیت ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ کمیٹی اس غرض سے بنی تھی کہ اس صوبے کے جو عربی فارسی کے قدیم مدارس ایسے ہیں، جن کو گورنمنٹ امداد

میں ایسے خیالات اُگ نہیں سکتے۔ میں اُن لوگوں میں ہوں جن کا اعتقاد ہے کہ تجدید (revival) کی مذہب میں ضرورت ہے، مگر معاشرت میں یہ ترقی سے انکار کرنا ہے۔

ہماری اس ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچا ڈھال دیا ہے ایسے سانچے بنائے نہیں جاسکتے۔ وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچا ڈھل چکا۔ اور قسمت کی مہر اُس پر لگ چکی۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں، مگر اب ہم ایک ہندستانی قوم، اور ناقابلِ تقسیم ہندستانی قوم بن چکے ہیں۔ علیٰحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا دے سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہیے، اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیے۔

## خاتمہ

حضرات! میں اب آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ میں اب اپنی تقریر ختم کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن قبل اس کے کہ ختم کروں، مجھے ایک بات کے یاد دلانے کی اجازت دیجیے۔

آج ہماری ساری کامیابیوں کا دارومدار تین چیزوں پر ہے: اتحاد، ڈسپلن (discipline) اور مہاتما گاندھی کی رہنمائی پر اعتماد۔ یہی ایک تنہا رہنمائی ہے جس نے ہماری تحریک کا شاندار ماضی تعمیر کیا، اور صرف اسی سے ہم ایک فتحمند مستقبل کی توقع کرسکتے ہیں۔

ہماری آزمایش کا ایک نازک وقت ہمارے سامنے ہے۔ ہم نے تمام دنیا کی نگاہوں کو نظارے کی دعوت دے دی ہے۔ کوشش کیجیے کہ ہم اس کے اہل ثابت ہوں۔

ہندستان میں بلکہ تمام اسلامی ممالک اس خواب کی تعبیر ڈھونڈنے میں بیزار ہو چکے ہیں، اور میں نے یہ محسوس کیا کہ اگر نصاب کے پہلو سے میں قدم اٹھا سکتا ہوں اصلاح کا، تو یہ ایک عظیم الشان خدمت ہوگی۔ یہ چیز میرے سامنے آئی۔ اور قدرتی طور پر یہ کمیٹی اس وقت جو سفارشیں کرے گی، وہ صرف ان مدرسوں کے لیے کرے گی جن کو سرکاری امداد مل رہی ہے۔ وہ مدرسے مجبور ہیں جو گورنمنٹ سے امداد لیتے ہیں کہ تعلیم کی اصلاح کے متعلق گورنمنٹ جو بھی نقشہ ان کے سامنے رکھے وہ اسے منظور کرلیں کیونکہ امداد کی ضرورت ان کو مجبور کرے گی۔ لیکن اگر کسی طرح یہ گتھی ایک مرتبہ سلجھائی جاسکتی ہے اور کم از کم محدود میدان میں اگر ایک بہتر نمونہ ہم پیش کرسکتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس کے اثرات پھیلیں گے اور وہ تمام دائرے کو اپنے اندر لے سکتے ہیں۔ یہ چیزیں میرے سامنے آئیں۔ اور اس وجہ سے میں نے خود یہ تجویز پیش کی کہ میں اس کمیٹی میں رہوں گا اور صدر کی حیثیت سے کام کروں گا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ ملک کے حالات نے اس طرح کروٹیں لیں کہ وزارت مستعفی ہوگئی اور یہ تمام کام ملتوی ہوگیا۔ اب پچھلے سال پھر جب نیا نقشہ بنا اور کانگرس نے فیصلہ کیا کہ وہ وزارتوں کو قبول کرے گی اور اس سلسلے میں میں لکھنؤ آیا اور آپ کے وزیر تعلیم سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے ملتے ہی باوجود اس کے کہ اس وقت تک کوئی منسٹری نہیں بنی تھی اور صرف گفتگو ہی ہو رہی تھی، انھوں نے سب سے پہلی بات یہی یاد دلائی جس سے پتا چلتا ہے کہ خود ان کی طبیعت اس بات پر لگی ہوئی تھی انھوں نے کہا کہ وہ کمیٹی پورے طور پر بنی نہیں تھی کچھ نام تجویز کیے گئے تھے اور اس وقت وہ چیز ادھوری رہ گئی تھی، تو سب سے پہلے اس کام کو ہاتھ میں لینا چاہیے۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ چیز خود میرے سامنے ہے اور میں کوشش کروں گا کہ جلد سے جلد اس کام کو شروع کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ کمیٹی بنی اور اس نے کام شروع کر دیا اور اس کا ابتدائی جلسہ بھی ہو چکا ہے اور اس سلسلے میں کچھ

دے رہی ہے ان مدارس کے نصاب تعلیم کے اصلاح کے مسئلہ پر غور کیا جائے۔ یہ دائرہ بہت محدود ہے۔ گورنمنٹ جن مدرسوں کو امداد دے رہی ہے، ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے۔ جو امداد دی جا رہی ہے، اس کی مقدار بھی بہت محدود ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سالانہ ۶۰ یا ۷۰ ہزار کی رقم نہیں ہے جو کہ دی جا رہی ہے۔ اس اعتبار سے در اصل کوئی بڑا کاموں کا دائرہ نہیں آتا کہ جس کے لیے یہ کمیٹی مقرر کی گئی ہوتی۔ اگر یہ کمیٹی مقرر کرنا تھی، تو بہرحال اس کی نوعیت ایسی نہ تھی کہ میں اپنے کو مجبور پاتا کہ اس کے لیے وقت نکالوں۔ لیکن میں نے وقت نکالا۔ جب آپ کے صوبے کے قابل وزیر تعلیم سمپورنانند جی نے پچھلی مرتبہ اس بات کی تحریک کی۔ انھوں نے سنسکرت کی تعلیم کی اصلاح کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی تھی، اس کمیٹی کی رپورٹ میں نے راستے میں ہوائی جہاز میں پڑھی۔ اس کمیٹی نے قابلِ قدر طریقہ سے اپنا کام پورا کیا۔ مجھے اس کمیٹی کی رپورٹ پڑھ کر تعجب ہوا کہ علمی حقیقت کا میدان کس طرح ایک دوسرے سے جڑتا ہوا چلتا ہے۔ سنسکرت کی تعلیم، اس کا طریقہ تعلیم، نصابِ تعلیم کے جو نقائص تھے، اور اصلاح کے جو طریقے تجویز کیے گئے، مجھے یہ محسوس ہوا کہ اگر وہاں سنسکرت کے بجائے عربی کا لفظ رکھ دیا جائے تو معاملہ بالکل یکساں ہے۔ بہرحال وہ کمیٹی مقرر کی گئی اور اس سلسلے میں یہ چیز سامنے آئی کہ عربی مدارس کی اصلاح کے لیے بھی ایک کمیٹی مقرر ہونی چاہیے۔ یہ میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ ۱۹۴۸ء کی بات ہے۔ خط کتابت ہوئی یہ کمیٹی تو مقرر ہو جاتی، مگر چیزیں کچھ ایسی میرے سامنے آئیں کہ خود میں نے ایسی تحریک کی کہ اس کمیٹی کا کام میری نگرانی میں ہونا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے محسوس کیا کہ اگرچہ اس کمیٹی کا کام محدود ہے، صرف ان مدرسوں کے لیے، جنھیں سرکاری مدد مل رہی ہے، لیکن تاہم جو اس کمیٹی کا مقصد ہے یا جس کام کو یہ انجام دینا چاہتی ہے، وہ کام اپنی نوعیت میں اتنا اہم ہے اور اس درجہ اہمیت رکھتا ہے کہ نہ صرف

آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے ایک اہم مقصد کے لیے زحمت گوارا فرمائی اور مجھے امید ہے کہ یہ زحمت سود مند ہوگی۔ اب مجھے آپ بزرگوں سے جو کچھ بھی عرض کرنا ہے، ابھی ہوائی جہاز میں راستہ میں آتے ہوئے کوشش کی کہ میں اپنے خیالات میں ترتیب پیدا کروں۔ معاملہ بہت وسیع ہے۔ یہ ایک طول طویل داستان ہے؛ علومِ عربیہ کی تعلیم کا مسئلہ، اس کی پچھلی تاریخ، درمیانی عہد کے تغیرات اور اصلاح کی تحریک۔ اس تحریک کے سلسلے میں جو قدم اٹھائے گئے ہیں ان کی کہانی اور پھر آج جو معاملہ منزل پر پہنچ کر رکا ہوا ہے، اس کی سرگذشت۔ یہ ایک بڑی کہانی ہے۔ نہ تو اس کانفرنس کے حصے میں اتنا وقت آیا ہے جو اس کا متحمل ہو سکتا ہے؛ اور نہ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے جو بہت سے پہلو ہیں، آپ حضرات علم کے سامنے ان کو پیش کر کے وقت کو ضائع کیا جائے میں کوشش کروں گا کہ جو اہم نکات ہیں، جو اہم پوائنٹس (points) ہیں، جن پر ہمیں جلد سے جلد پہنچ جانا چاہیے ان کی طرف آپ دوستوں کی توجہ دلاؤں گا۔ لیکن تاہم مشکل یہ ہے کہ وہ داستان ایسی ہے کہ اس کو شروع کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی ابتدائی مقدمہ سامنے لانا پڑتا ہے۔ اور اس لیے چند منٹ ضرور اس میں صرف ہوں گے۔ یہ چیز تو آپ حضرات کے سامنے ہے کہ قدرتی طور سے ہر علم تین مختلف دوروں سے، تین مختلف منزلوں سے گذرتا ہے۔ پہلا دور جو اس کی پیدائش کا ہوتا ہے، جس کو عربی میں کہیں گے تدوین کا دور۔ تو علم کا بحیثیت علم مدون ہونا؛ وہ اینٹیں جو فی الواقع متفرق دماغوں میں پڑی تھیں، ان اینٹوں کا ایک کے اوپر ایک رکھا جانا اور ایک دیوار بننا؛ اس کو کہتے ہیں تدوین۔ تو پہلا دور تو علم کی تدوین کا ہوتا ہے، اس کی بناوٹ کا ہوتا ہے۔ لیکن اس پر کام ختم نہیں ہو جاتا۔ دیوار چن دی گئی، لیکن ابھی اس کے نقش و نگار بہت کچھ باقی ہیں۔ تب دوسرا دور آتا ہے، جس کو ترقی کی منزل کہنا چاہیے، تنقیحِ علوم کا۔ پہلا دور تدوین کا ہے،

سب کمیٹیاں بنی ہیں۔ کاموں نے قدم آگے بڑھایا ہے۔ لیکن پھر بھی جو چیز ہمارے سامنے آئی وہ یہ تھی کہ اس کمیٹی نے اپنا کام شروع کردیا اور بہرحال کسی نہ کسی شکل میں یہ اپنا کام پورا کرے گی۔ اپنی رپورٹ پیش کرے گی اور گورنمنٹ اس رپورٹ کو یقیناً منظور کرے گی۔ اس سلسلے میں جو بھی اصلاح کے مقاصد سامنے ہیں ان کا نقشہ بنے گا اور اس کی امید کی جاسکتی ہے کہ اس نقشہ کا اثر دوسرے حلقوں پر بھی پڑے گا اور آئندہ مزید اصلاح کے دروازے کھلیں گے۔ لیکن پھر بھی یہ بہت دور کی چال ہے۔ اور نتیجے میں کافی انتظار کرنا پڑے گا۔ کیوں نہ اس امر کی کوشش کی جائے کہ براہ راست اس میں ایسا قدم اٹھے کہ جس کی وجہ سے بجائے اس کے کہ اس دھیمی چال سے کسی نتیجے کا انتظار کیا جائے ہم فوراً کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔ تب مجھے یہ خیال ہوا کہ میں آپ حضرات کو دعوت دوں اور زحمت دوں؛ اور ایک ایسی کانفرنس بلائی جائے کہ اس صوبے کے جو اہم اور قدیم ترین مدارس موجود ہیں، اور جن کے حلقۂ اثر میں سیکڑوں نہیں، بلکہ ہزاروں انسانوں کے دماغ ہیں، انھیں زحمت دی جائے اور ان کے آگے یہ مسئلہ رکھا جائے اور اس امر پر غور کیا جائے کہ یہ کمیٹی جس غرض سے بنی ہے اس کو ہم اور پھیلائیں اور خود کمیٹی میں مزید اضافہ کریں۔ اور جو طریقہ بھی گفتگو اور مشورے کے بعد قرار پائے اور جس سے اس معاملے میں اصلاحی صورت ہونا چاہیے یعنی بجائے اس کے کہ اس کو کسی محدود دائرے میں پکڑا جائے اور معاملے کی جو اصلی نوعیت ہے یعنی نصابِ تعلیم کی اصلاح کی مستقلاً ضرورت کا مسئلہ، اس مسئلے کو ہم کسی نہ کسی طرح از سرِ نو اٹھا سکیں اور اس کے متعلق کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔ چنانچہ بعض دوستوں سے میں نے اس بات میں مشورہ کیا اور انھوں نے اس سے اتفاق کیا اور آپ حضرات کو زحمت دی گئی۔ یہ زحمت دہی موثر ثابت ہوئی تو میں شکرگذار ہونگا۔ اور امید ہے کہ یہ زحمت دہی موثر ثابت ہوگی۔ میں پھر

کا تھا لیکن اس میں شبہہ نہیں ہے کہ بہت سے تہذیب کے کام تھے جن کو انھوں نے پورا کیا۔ نام ان کے میری زبان پر ہیں، مگر میں اس کے آگے نہیں بڑھنا چاہتا ہوں اور اس ٹکڑے کو جلد سے جلد ختم کرنا چاہتا ہوں۔ ساتویں صدی کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اچانک اسلامی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے، ایک نیا ورق الٹتا ہے، اور یکایک آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ پچھلی چند صدیاں جن علوم کی تدوین میں، ان کی تہذیب میں، اور ان کی درس و تدریس میں اور بلوغ و تکمیل میں صرف ہو چکی ہیں، اچانک اب ایک نئے دور سے آشنا ہوتی ہیں۔ اب ایک نئے دور سے دوچار ہوتی ہیں۔ اس دور کو میں دورِ تنزل اور ذہنی تنزل کا دور قرار دیتا ہوں۔ علم و فن کے ہر گوشے میں یہ چیز آپ کو نظر آئے گی کہ جو درخت تہذیب و تدوین کا پھل پھول رہا تھا، اس کی شاخیں ساتویں صدی تک کمال مرتبہ تک پہنچ گئیں اور بجائے اس کے کہ پھلتا پھولتا، اچانک آپ کو نظر آئے گا کہ اب پت جھڑ شروع ہو گئی اور درخت بڑھنے کی جگہ گھٹ رہا ہے۔ چنانچہ ساتویں صدی ہجری کے بعد اسلامی علوم پر ایک عالمگیر تنزل کا دور شروع ہو گیا۔ سب سے پہلی چیز جو نمایاں نظر آتی ہے، وہ یہ ہے کہ علم کی ترقی کے لیے جو بنیادی چیز ہے، جس کو عربی میں نظر و اجتہاد سے تعبیر کیا جاتا ہے، اچانک غائب ہو جاتی ہے۔ اور ساتویں صدی کے بعد جمود ہر گوشے پر چھا گیا۔ چنانچہ اس کے بعد سے کسی علم و فن میں الّا یہ کہ کسی گوشے میں کبھی کبھی کوئی نادر شخصیت پیدا ہو گئی، جیسے علّامہ ابن تیمیہ پیدا ہوئے ساتویں صدی ہجری میں۔ مگر عام رفتار تنزّل کی شروع ہو چکی تھی اور اب کوئی قوت ایسی باقی نہیں رہی کہ علم کے کسی زاویے میں کسی نئے گوشے کو اُبھارے۔ اب جو کچھ بھی سرمایہ رہ گیا ہے، وہ یہ ہے کہ جو دیواریں اُٹھ چکی ہیں، اُن کی لیپ پوتی کی جائے۔ چنانچہ یہ دور وہ پیدا ہوتا ہے، جس کو شروح کا دور کہا جا سکے لیکن اس سے پہلے بھی شرحیں لکھی گئی تھیں جو علمی جگہ رکھتی تھیں۔ مگر اب

دوسرا دور تہذیب کا ہے۔ اب اس کی کاٹ چھانٹ کرنا، اس کو سنوارنا اس کو بڑھانا، اس کی نوک و پلک کا بنانا، یہ تہذیب ہے۔ تو قدرتی طور پر پہلے دور کے بعد ہر علم پر دوسرا دور جو گذرتا ہے، وہ اس کی تنقیح و تہذیب کا ہوتا ہے۔ تنقیح کا لفظ زیادہ موزوں نہیں ہے۔ بلکہ تہذیب کا لفظ زیادہ موزوں ہے۔ تہذیب کے معنی چھانٹنا، سنوارنا ہیں، تو دوسرا دور تہذیب کا ہوتا ہے۔ تو اب نہ صرف دیوار بن گئی بلکہ اس دیوار کے نقش و نگار بھی بن گئے۔ نوک و پلک درست ہو گئے۔ تب تیسرا دور آتا ہے، جس کو کہ آپ بلوغ اور تکمیل کا دور کہتے ہیں۔ یعنی وہی چیز اب اپنے کمال تک پہنچ گئی۔ اور اب اس میں کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہ گئی ہے، جس کی نوک و پلک درست کی جائے۔ اب اس کی اشاعت، اس کا پھیلانا اور بڑھانا ہے۔ درس و تدریس سے اس کو زیادہ استوار کرنا ہے۔ تو تیسرا دور بلوغ و تکمیل کا آتا ہے۔ قدرتی طور پر یہ تین دور اسلامی علوم پر بھی گزرے۔ پہلا دور تدوین کا تھا۔ دوسرا تہذیب کا۔ اور تیسرا بلوغ و تکمیل کا۔ اگر ان تین دوروں اور زمانوں کی جستجو کی جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ تیسری صدی ہجری کا زمانہ تدوین علوم کا زمانہ تھا۔ تیسری صدی ہجری کے بعد سے پانچویں صدی تک کا زمانہ اگر آپ تاریخ کے اوراق الٹیں گے تو معلوم ہوگا کہ پانچویں صدی کا زمانہ تہذیب علوم کا زمانہ ہے۔ ان دو صدیوں کے اندر جو علوم پچھلی تین صدیوں کے اندر مدوّن ہو چکے تھے، ان کی تہذیب، ان کی مزید نقش آرائی ان کی ترتیب یہ داستان ہوئی، آپ کو پانچویں صدی ہجری تک نمایاں دکھائی دے گی۔ اس کے بعد کا زمانہ اسلامی علوم کے بلوغ و تکمیل کا اور ان کی اشاعت کا زمانہ تھا۔ یہ اگر دقتِ نظر کے ساتھ تاریخ کے صفحات پر نظر ڈالی جائے تو میں سمجھتا ہوں، ساتویں صدی ہجری تک پہنچتا ہے۔ یعنی ساتویں صدی ہجری تک، ہم کو ایسے ائمۂ فن نظر آتے ہیں جن کا کام اگرچہ بنیادی طور پر نہیں کہا جاسکتا ہے کہ وہ علوم کی تہذیب

ایک خاص ڈھنگ تھا۔ وہ طریقہ تعلیم آہستہ آہستہ بدلنے لگا۔ ساتویں صدی کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بالکل مبدّل ہو گیا۔ متقدمین کے طریقۂ تعلیم میں آپ کو معلوم ہے کہ علوم و فنون عالیہ کے درس میں ایک قسم ہے آلات کی اور ایک قسم ہے نفسِ علوم کی۔ عربی میں دو قسمیں کر دی گئی ہیں: ایک ہے فنونِ عالیہ اور ایک ہے نفسِ علوم۔ تو پچھلوں کا جو طریقۂ تعلیم تھا وہ آپ کو معلوم ہے کہ وہ طریقہ تھا املا کا۔ املا عربی کی خاص اصطلاح ہے۔ تعلیم کی وجہ سے یہ اصطلاح اس شکل میں اُبھری۔ املا کے جو طریقے متقدمین کے تھے وہ آپ کو معلوم ہے کہ کیا ہوئے؟ آج کچھ کتابوں کی نقل نکل آئی ہے۔ اور اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ املا کسے کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً شریف مرتضیٰ کی کتاب ہے امالی۔ املا کے معنی ٹھیک وہی ہیں، جیسے آج آپ کسی کالج میں چلے جائیں، وہاں پروفیسر جس طریقے پر تقریر کرتا ہے لکچر دیتا ہے، ٹھیک اسی معنی میں املا ہے۔ ایک صاحبِ علم کوئی خاص کتاب اپنے سامنے نہیں رکھتا تھا، وہ بیٹھتا تھا اور طالب علم اس کے سامنے بیٹھتے تھے۔ طالب علم کاغذ رکھ لیتے تھے اور جو موضوع اس کے پیشِ نظر ہوتا تھا مثلاً اس نے علم ادب، حدیث، تفسیر لے لیا، اس کے اوپر وہ زبانی تقریر کرتا تھا اور جو طلّاب اس کے حلقۂ درس میں بیٹھے ہوتے تھے وہ سنتے تھے، اور اس کے نوٹس (Notes) لیتے تھے اور یہ نوٹس جمع کر لیتے تھے جو کتابیں آج آپ کو مل گئی ہیں مثلاً قاری کی کتاب، شریف مرتضیٰ کی کتاب، یہ وہی نوٹس ہیں جو لکچر کے وقت مستعد طالب علموں نے لیے ہیں۔ اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس طریقۂ تعلیم کی بلندی کتنی تھی اور آج کل کا جو موجودہ سسٹم ہے، وہ ٹھیک اسی کے مطابق چلتا تھا، لیکن بنیادی فرق آپ کو ساتویں صدی کے بعد نظر آئے گا، اگرچہ یہ اس سے پہلے شروع ہو چکا تھا اور اگر ہم اس کی کھوج میں نکلیں تو معلوم ہو گا کہ ساتویں صدی ہجری کے بعد کا جو زمانہ آتا ہے تو املا کا طریقہ عربی اور اسلامی مدرسوں میں بالکل مفقود اور ناپید ہو جاتا ہے اور کہیں اس کی پرچھائیں نظر نہیں آتی اور بدقسمتی

دماغی قوت ختم ہو چکی تھی۔ چنانچہ آپ کو معلوم ہوگا کہ بڑے سے بڑے ائمۂ فن جو پیدا ہوتے ہیں، ان کی زندگی کن کاموں میں ختم ہوتی ہے؟ وہ تلخیص میں مصروف ہوتے ہیں، وہ خلاصہ کرتے ہیں، یا شرح نویسی۔ لیکن کسی علم وفن میں نظر و اجتہاد کے ساتھ قدم اٹھے یہ چیز ختم ہو چکی تھی۔ اور لازمی طور پر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی علم وفن کے جو کارخانے قائم ہوئے تھے، وہ ایک بنیادی انقلاب سے زائل ہو گئے اور درس وتدریس بجائے اس کے کہ اس ڈھنگ پر چلے جس ڈھنگ پر چھ صدیوں تک چلا تھا، ایک نیا ڈھنگ شروع ہو گیا۔ یہ ڈھنگ دورِ تنزّل کی پیداوار تھا اور روز بروز یہ تنزّل بڑھتا گیا۔ اب یہ جو انقلاب ہوا، میں اس کی تفصیل میں نہ جاؤں گا۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ حضراتِ علم وفضل کے لیے اس کی ضرورت بھی نہیں ہے کہ میں تفصیل میں جاؤں۔ اس تنزّل کا نتیجہ جو کچھ نکلا، اس نے علم وفضل کے مختلف صیغوں پر کیا اثر ڈالا، اس کی داستان بہت طول طویل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں ایسے اربابِ نظر موجود تھے کہ جنھوں نے اس چیز کو محسوس کیا۔ اس چیز کو جسے چھ صدیاں گذرنے کے بعد آج ہم محسوس کر رہے ہیں اور اس پر ہم ماتم کر رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایسی گہری نظریں جو باہر کی تمام سطحوں سے گذر کر حقیقت کے اندرونی گوشوں تک پہنچنے والی تھیں۔ ایسی نظریں اس وقت پیدا ہوئیں جنھوں نے اس صدی میں اس حقیقت کو محسوس کیا جیسے علامہ ابن خلدون۔ معلوم ہوتا ہے کہ علّامہ ابن خلدون نے یہ حقیقت محسوس کی جیسا کہ اس نے اپنے مقدمے میں اشارہ کیا۔ بہر حال یہ خال خال نظریں تھیں، ان کا اثر وقت کی عام رفتار پر نہیں پڑا۔ تنزّل کا دور شروع ہو چکا تھا اور وہ برابر آگے بڑھتا گیا۔ اب اس دور میں آ کر ہمیں جو تبدیلیاں معلوم ہوئیں، وہ بھی اتنی مختصر نہیں ہیں کہ میں چند منٹوں میں سمجھانے کی کوشش کرسکوں۔ سب سے بڑا بنیادی انقلاب جو پڑھنے پڑھانے کے طریقے میں ہم کو نظر آتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس وقت تک قدما یعنی پچھلوں کے طریقۂ تعلیم کا

کے اوراق میں بند کرنا چاہیے، مقفل کرنا چاہیے۔ یا کہ ایک کتاب سے مدد لیتے ہوئے پڑھنے والے کا دماغ اور پڑھانے والے کا دماغ علم و فن کی وادیوں میں کھلے طور پر پڑھ سکے۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں ہے کہ تعلیم کے لیے ایک خاص حد تک کسی معیّن کتاب کا رکھنا ضروری ہے۔ وہ پڑھنے والے کو مدد دیتی ہے۔ وہ اس کے دماغ کو عبارت کے حل کرنے کی مشق کراتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہر حقیقت اس وقت تک حقیقت ہے جب تک اعتقاد کے درجے میں ہو وہاں سے جہاں وہ ادھر ادھر ہوئی اس کے بعد وہ گر گئی۔ یہ چیز اس حد تک صحیح تھی جس حد تک اسے جانا چاہیے تھا لیکن جب کتابوں کا راستہ کھل گیا تو اب تمام تر دار و مدار ہو گیا کتاب پر۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۲ برس سے ۱۴ برس تک آپ اپنا دماغ صرف کرتے ہیں، مگر نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ مجھے معاف کیا جائے؟ یہ کہنے کی میں جرأت کروں کہ چند کتابوں کا علم حاصل ہو جاتا ہے اور علوم حاصل نہیں ہوتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ چند کتابوں کا علم حاصل کرنے میں اور نفسِ علم حاصل کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس تبدیلی سے روز بروز تمام تر اعتماد کتابوں پر ہوتا گیا۔ اور وہ جو پچھلا طریقہ املا کا تھا اور زبانی درس کا تھا وہ روز بروز ختم ہوتا گیا۔ یہ ایک عجیب مصیبت ہے کہ دنیا ان منزلوں سے گزر چکی اور صدیوں کا فرق ہو گیا۔ آپ کو تعجب ہوگا اگر اب آپ کے سامنے اس چیز کو پیش کروں۔ مثلاً آپ علمِ تفسیر کا درس لے رہے ہیں اور آپ کا دار و مدار بیضاوی اور جلالین پر ہے۔ کیا ہوگا کہ بیضاوی اور جلالین کی لفظی عبارت، اس کے مرجع اور ضمائر کا علم حاصل ہو جائے گا، نہ کہ علمِ تفسیر کا، بلکہ اس کی پرچھائیں تک نظر نہ آئے گی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ درس و تدریس میں علمی قوت کمزور ہو گئی۔ یہ داستان بہت طویل ہے۔ میں اس کے پھیلاؤ کو سمیٹ نہیں سکتا۔ اس لیے کچھ چیزیں نظر انداز کرنا پڑینگی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ روز بروز تعلیم کا ڈھانچا بگڑتا گیا۔ تعلیم گرتی گئی۔ ایک بڑی غلط چیز جو پیدا ہوئی، وہ تھا متون و شروح کا حدِ اعتدال سے آگے بڑھ جانا۔ متن و شرح لکھنے کا طریقہ فی نفسہٖ صحیح تھا۔ یہ چیز ہر علم و فن میں

سے املا کی جگہ کتابیں لے لیتی ہیں۔ یاد رکھیے کہ قدماء کے طریقۂ تعلیم میں کیا تھا! ان کا اعتماد املا کے اوپر تھا نہ کہ کتابوں کے اوپر حتی کہ اگر میں آپ سے کہوں کہ علومِ عالیہ اور صرف ونحو یعنی گرامر ایسی چیز ہے کہ آپ اس کے لیے کہینگے کہ کتابیں ہونا چاہییں آج بھی طریقۂ تعلیم یہ ہے کہ ان چیزوں کا دار و مدار کتابوں پر ہے لیکن آپ کو تعجب ہوگا کہ متقدمین اور مسلمانوں کا جو طریقہ رہا تھا اسلامی علوم اور صرف ونحو اور ادب یا اسی قسم کی جو چیزیں ہیں اس میں اعتماد املا پر تھا۔ کتابیں بن چکی تھیں، دوسری صدی ہجری سے کتابیں مرتّب ہو چکی تھیں، وہ کتابیں اس زمانہ میں مل سکتی تھیں۔ لیکن اعتماد جو کچھ تھا، وہ املا پر تھا۔ آپ غور کیجیے کہ کتنی مسافت اس تنزل کے دور میں اسلامی دماغ نے طے کی ہے۔ اس نکتے سے جہاں اعلیٰ علوم کی تعلیم ہی نہیں بلکہ علومِ عالیہ یعنی صرف ونحو گرامر وغیرہ کی تعلیم بھی زبانی درس کے ذریعے سے ہوتی تھی جس کو املا کہتے ہیں۔ وہاں سے تنزل کے کارواں کا سفر شروع ہوتا ہے۔ ساتویں صدی میں آپ یہاں تک پہنچ گئے۔ جو اعلیٰ علوم ہیں جیسے کہ حدیث، تفسیر اور فلسفہ، ان کی تعلیم تمام تر کتاب پر ہوتی ہے، کتابوں کے ورق پڑھنے والے کے سامنے ہیں اور دماغ کے سارے دروازے جو اس موقع پر کھلنا چاہییں، ایک صاحبِ نظر و علم کے، وہ اس موقع پر بند ہو گئے اور قفل چڑھا دیا گیا۔ اس طریقۂ تعلیم کو رائج کیا گیا تھا۔ بظاہر آپ کہینگے کہ یہ ایک نہایت معصوم تبدیلی ہے، جس میں کوئی حرج نہیں، قدماء کے پاس اتنی کتابیں کہاں تھیں! قدماء کے پاس یہ عجیب وغریب طریقہ متون و شروح کا کہاں تھا! متن نویسی کا طریقہ نکلا اور شرحیں لکھی گئیں اور حواشی لکھے گئے۔ یہ تمام سرمایہ پچھلوں کے پاس کہاں تھا! وہ محض تقریر کے ذریعے اپنا کام چلاتے تھے۔ کتابیں بن گئی تھیں۔ وہ مرتّب اور مدوّن ہو گئی تھیں۔ لیکن نہیں۔ کاش معاملہ اس تک ہوتا۔ لیکن معاملہ یہاں تک نہیں ہے۔ بلکہ اس کے پیچھے، اس ظاہری پردے کے پیچھے، ایک بڑی دماغی تبدیلی بیٹھی ہوئی ہے۔ چیز یہ تھی کہ جس علم کو آپ حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس علم کے لیے آپ کے دماغ کو کسی ایک معیّن کتاب

بلکہ وہ بیکار کی بحث میں خرچ ہو۔ آپ غور کیجیے کہ ایک شخص کو منطق پڑھا رہے ہیں۔ آپ کے لیے جو چیز ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ آپ منطق میں اس شخص کے دماغ میں زیادہ سے زیادہ جو براہِ راست رشتہ پیدا کر سکتے ہیں پیدا کریں۔ یہ رشتہ جتنا زیادہ مضبوط ہوگا اتنا ہی زیادہ دماغ اس کے لیے تیار ہوگا اور منطق اور لاجک (Logic) کو پکڑ میں لیگا۔ لیکن آپ نے طریقہ کیا اختیار کیا ہے؟ وہ ایک کتاب شروع کرتا ہے۔ اس کے دماغ کی ساری قوت اس کتاب میں صرف ہوتی ہے۔ دماغ کو صرف کیا جاتا ہے منطق کے مبادیات، مسائل، مباحثہ مقاصد کے اوپر۔ کس چیز پر جو ایک خاص نام کی کتاب ہے، اس کا ایک خاص نام کا مصنف ہے، اس نے ایک متن لکھا ہے، اس کی جو ایک خاص سطر ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟ آپ خیال کیجیے کہ اس کے اصلی موضوع سے، آپ اس کے دماغ کو بھٹکا کر کہاں سے کہاں لے گئے! یہ سب کچھ آپ اس لیے کر رہے ہیں کہ عبارت کے حل کرنے کی اسے مشق ہو۔ مگر یہاں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ آپ اس کے دماغ کو غارت کرتے ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ ہر علم کے لیے گرامر بہت زیادہ ضروری ہے اور بیک وقت آپ دو بوجھ اس پر لادتے ہیں اور ہندستان میں تین بوجھ۔ پہلا بوجھ ہے اصل علم کا۔ دوسرا حل عبارت کا۔ اس کی ساری قوت عبارت کے حل کرنے میں صرف ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دماغ کی پکڑ میں چیز نہیں آتی ہے۔ پھر آپ شکایت کرتے ہیں کہ لوگ کوڑھ مغز ہیں لیکن جو طریقہ ہم نے اختیار کیا ہے وہ ان کو کوڑھ مغز بنانے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ میں اس چیز میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ طریقۂ درس میں جو تبدیلی ہوئی اس سے اسلامی علوم کو بہت سخت نقصان پہنچا۔ قدماء کے طریقۂ املا کو ترک کر دیا۔ اعلیٰ علوم کی تعلیم زبانی درس کے ذریعے سے اور لکچرس (Lectures) سے دی جاتی تھی یہ بالکل ناپید ہو گیا۔ اور تمام تر کتابوں پر اعتماد ہو گیا۔ اور جو طریقہ اختیار کیا

اور ہر زبان میں اچھی ہوتی ہے لیکن یہ چیز جب حد سے زائد بڑھ جائے گی تب ظاہر ہے کہ اس سے نفس علم کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ بجائے اس کے آپ کسی علم میں کوئی ایک کتاب اچھی تلی زبان میں، وضاحت کے ساتھ مرتّب کریں اور وہ ایک طالب علم کے آگے رکھیں تاکہ اس کو موقع ملے کہ وہ پورے طور پر اس کتاب پر چھا جائے آپ نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ آپنے ایک چیز لکھی کہ جس کا نام متن ہے اور گن گن کر اتنے الفاظ رکھ دیے کہ کم سے کم الفاظ ہوں اور وہ ایک معما اور چیستاں بن سکے۔ جو شرح جو لکھنی چاہیے تو اس شرح میں مبحث آگئے، مثلاً اس نیک بخت نے ایک متن لکھا اور اس امر کی کوشش کی کہ عبارت کو سخت بنانے میں کوئی بھی دروازہ اور کھڑکی کھلی نہ چھوڑی جائے، جس سے دماغ اپنی راہ پر آجائے۔ اگر اس کو عبارت میں اشارہ کرنا تھا، تو وہ ان ذریعوں سے کام لیتا۔ اگر وہ ان ذریعوں کو یعنی مرجع اور ضمائر کو اس عبارت میں رکھ دیتا تو معاملہ صاف ہے۔ مثلاً اس کو یہ کہنا ہے کہ ایسی صورت میں اس سے نتیجہ یہ نکلے۔ اگر وہاں وہ اس چیز کا نام بھی رکھ دے تو یہ بحث غیر ضروری ہو جاتی ہے مگر وہ نیک بخت نہیں رکھتا ہے۔ اور یہ ناممکن ہے۔ اب اس سے ایک اہم بحث پیدا ہوئی کہ "اس سے" جو لفظ آیا ہے، وہ کس طرف جاتا ہے۔ چنانچہ اس پر بحث چلی۔ قیاس یہ چاہتا ہے کہ یہ طریقہ جو اختیار کیا گیا، تو یہ اس لیے اختیار کیا گیا کہ اس سے دماغ کو عبارت کے حل کرنے اور سمجھنے کی قوت پیدا ہو۔ حلِ عبارت بہرحال ضروری چیز ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک طالب علم کے لیے تو یہ بہت ہی ضروری ہے کہ وہ کسی کتاب کو پڑھنے اور اس کی عبارت کو سمجھنے میں اور مباحث کو قابو میں لانے کے لیے اپنے اندر صلاحیت پیدا کر سکے۔ لیکن اس کے لیے آپ بہت سے طریقے اختیار کر سکتے ہیں۔ اس کی کیا ضرورت ہے کہ تمام علوم و فنون کی جو آپ تعلیم دیں، ان کی تمام کتابوں کو آپ اسی طریقے سے غارت کریں اور دماغی قوت کا بڑا حصہ اصلی علم کو حاصل نہ کرسکے

اور تنزل کا معاملہ ایک عجیب معاملہ ہے۔ کتنی کھلی ہوئی اس تنزل کی باتیں ہوں، یا ترقی کی باتیں ہوں، ان کو آپ یا آپ کا زمانہ فوراً نہیں پکڑ سکتا یا محسوس نہیں کر سکتا۔ ترقی اور تنزل حقیقتاً دونوں بڑی دھیمی چال چلتے ہیں۔ ایسی دھیمی چال چلتے ہیں کہ آپ کو پتا ہی نہیں چلتا کہ کوئی چل رہا ہے۔ لیکن کافی وقت گزر جاتا ہے اور کافی مسافت جب زمانہ طے کر لیتا ہے، تب آپ چونکتے ہیں، مورخ چونکتا ہے، اور لکھتا ہے کہ حقیقت یہاں سے یہاں آگئی۔ لیکن وہ اچانک نہیں آئی ہے۔ پچاس ساٹھ یا سو برس میں یہاں آئی ہے۔ لیکن اس سو برس میں اس کی چال اتنی دھیمی تھی کہ اس چال کو کوئی پکڑ نہیں سکتا تھا۔ منٹوں کو آپ پکڑ سکتے ہیں، گھنٹوں کو آپ پکڑ سکتے ہیں کیونکہ ساٹھ منٹ کا گھنٹہ ہوتا ہے، مگر اس کو آپ نہیں پکڑ سکتے۔ اس کی چال اتنی دھیمی ہے کہ اس کو آپ کی آنکھ بھی نہیں پکڑ سکتی۔ اسی طرح دنیا کی تمام حقیقتیں دھیمی چال چلتی ہیں، اور یہ دھیمی چال پکڑ میں نہیں آتی ہے۔ جب زمانہ بہت کافی مسافت طے کر لیتا ہے اور جب ایک نقطے کو چھوڑ کر دوسرے نقطے تک پہنچتا ہے تب آپ چونکتے ہیں کہ کتنی مسافت طے کر لی۔ تو اس طریقہ پر دماغی ترقی اور تنزل کا افسانہ ہے۔ ترقی شروع ہوتی ہے تو کوئی مورخ اس کو پکڑ نہیں سکتا کہ فلاں سنہ، فلاں برس یہ ترقی شروع ہوئی۔ یا بجائے اس کے تنزل کے کارواں کا سفر شروع ہو جاتا ہے، لیکن آنکھ اس کو پکڑ نہیں سکتی کہ وہ بتلا سکے کہ فلاں سنہ میں اتنے بجے اسلامی علوم کے کارواں کے تنزل کا سفر شروع ہوا۔ لیکن وہ چیز شروع ہو جاتی ہے، اور پھر ایک لمبی مسافت طے کر لیتی ہے، تب مورخ کا قلم آشنا ہوتا ہے۔ اس لیے اگر آپ کوشش کریں گے کہ ساتویں صدی ہجری کا زمانہ تخمیناً مقرر کر دیا ہے تو ساتویں صدی ہجری کے بعد دماغی تنزل کا زمانہ کھلے طور پر کھڑا ہر جگہ نظر آجائے۔ تنزل اس طرح شروع نہیں ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ اس نے سر اٹھایا اور ساری نگاہوں نے دیکھ لیا کہ وہ تنزل کھڑا ہے۔ وہ تو اس طرح آتا ہے کہ لوگوں کو پتہ بھی نہیں چلتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم

گیا،وہ اصولی تعلیم کے لحاظ سے بالکل غلط طریقہ اختیار کیا گیا۔ اب اس سلسلے میں جو بہت سی چیزیں ہیں، ان سب کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی، آپ سب حضراتِ علم وفضل کی موجودگی میں۔ برسوں سے میرا خیال یہ ہے، تیس برس سے میرا خیال ہے کہ علامہ تفتازانی ایک غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے اور تیس برس سے میری یہ رائے ہے کہ انھوں نے جو متن وشرح لکھے، وہ ان کی زندگی میں بہت مقبول تھے اور ان کے علم وفضل کا سکّہ سب پر جما ہوا تھا اور جو چیز ان کے قلم سے نکلتی تھی، وہ تمام ملک میں چھا جاتی تھی اور بعض تصنیفات ان کی زندگی میں داخل درس ہوگئیں اور آج تک ہم سب منّت گزار ہیں، ان کی تصنیفات کے۔ کوئی صاحب یہاں پر ایسے نہ ہونگے جنھوں نے علامہ موصوف کی تصنیفات نہ پڑھی ہوں۔ علامہ تفتازانی کی کتابوں کی مقبولیت اس زمانے میں اس لیے ہونے لگی تھی کہ اسلامی علوم کا دماغی تنزّل شروع ہو چکا تھا اور ترقی کا دور ختم ہوگیا تھا۔ اور ان کتابوں سے بجائے اس کے کہ آگے چل کر ترقی کے دروازے کھلے ہوں، ایک حد تک نقصان پہنچا۔ یہ میں ڈرتے ڈرتے ایک لفظ آپ حضرات سے کہہ رہا ہوں تا کہ آپ حضرات کو گراں نہ گزرے۔ یہ بھی میرا عقیدہ کہ ادب عربی اور عربی بلاغت کو مطوّل نے سخت نقصان پہنچایا۔ قدمار کی کتابیں نکل آئی ہیں، جیسے دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغت۔ اس کے علاوہ اور بھی چیزیں نکل آئی ہیں، جن سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ بلاغتِ عربی کی تعلیم کہاں تک تھی۔ ہم بدقسمتی سے کہاں سے گر کر کہاں آ گئے۔ جرجانی کی تصنیفات کو چھوڑ دیجیے، سکاکی اس دور کی پیداوار تھا۔ دراصل ترقی کا دور ختم ہو چکا تھا، اس نے مفتاح لکھی۔ کاش وہ اصلی شکل میں رہتی لیکن نہیں رکھی گئی۔ بہرحال یہ داستان طولانی ہے۔ میں جس چیز کی طرف آپ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ ساتویں صدی ہجری میں ایک بنیادی تبدیلی ہوئی اور اس نے اسلامی علوم اور اس کی بنیاد کو ہلا دیا۔ اس سلسلے میں یہ بات آپ یاد رکھیے کہ ترقی

عربی علوم کا طریقہ سلسلہ جاری ہے، اس میں اصلاح ہونا چاہیے۔ موجودہ زمانے میں اس کا احساس کب شروع ہوا، یہ بھی کہنا مشکل ہے۔ لیکن میری نظر سے جو چیز گذری ہے۔ اسے میں یہاں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ شاید سب سے پہلے ایک شخص بیرن توسی نے انیسویں صدی میں ممالکِ اسلامیہ کا سفر کیا اور گیارہ جلدوں میں اپنا سفرنامہ مرتّب کیا اور خاص اہتمام سے اسے مصر میں چھپوایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ دور کو آپ لے لیں اس صدی میں ایک مسیحی عالم یہ کہتے ہوئے نظر آتا ہے کہ جن طریقوں پر اسلامی اور عربی علوم کا ڈھانچا چل رہا ہے، وہ کامیاب نہیں ہے۔ یہ عالم بیرن توسی ہے۔ اس کے بعد پھر جو شخص اس کے خلاف پوری قوت سے اٹھا وہ مرحوم شیخ عبدہٗ[1] تھا۔ یہ جب مصر سے جلا وطن کیے گئے ، تو بیروت گئے۔ اور پھر سید جمال الدین[2] سے مل کر بیروت میں ۱۸۹۲ء میں ایک لائحہ، ایک اسکیم (Scheme) تیار کی اور یہ مرتب کرکے ترکی کے شیخ الاسلام کے پاس بھیجی۔ ان کا خیال ہوا کہ یہ ایک اہم مسئلہ ہے، اور اگر اس مسئلے کو چھیڑا جا سکتا ہے، تو اس کے لیے شیخ الاسلام موزوں ہیں کہ وہ اس مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ اس کی بنیاد یہ ہے کہ عربی اور اسلامی علوم کا جو سلسلہ اس وقت قائم ہے، وہ غلط ہے، اور اس سے امید نہیں ہے کہ صحیح نتائج پیدا ہو سکیں۔ اس لیے اس میں اصلاح ہونا چاہیے اور اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ ترکی کے شیخ الاسلام ایک نیا مدرسہ اور کالج قسطنطنیہ یا استنبول میں میں قائم کریں۔ چنانچہ شیخ رشید رضا[3] کے مضامین میں یہ اسکیم موجود ہے۔ یہ نہایت قیمتی تحریک تھی۔ لیکن اس کو اس قابل نہیں سمجھا گیا کہ شیخ محمد عبدہ کے خط کا کوئی جواب دیا جائے اور ظاہر ہے کہ ترکی میں یہ سلسلہ جس شکل میں قائم تھا اور جو لوگ اس عہدے پر مقرر کیے جاتے تھے، ان سے کسی تبدیلی کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ لیکن وہ اسکیم ایک قیمتی چیز ہے۔ اس کے بعد سید جمال الدین نے عربی میں ایک اخبار نکالا جس کا نام "العروۃ الوثقیٰ"

ترقی کے میدان میں ہیں، مگر وہ آہستہ آہستہ اپنا کام کرتا جاتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ساتویں صدی ہجری میں اسلامی اور عربی علوم کے مدارس آباد ہیں۔ ہر جگہ علماء و فضلاء درس دے رہے ہیں، جن کے حلقۂ درس سے سیکڑوں عالم و فاضل فیضیاب ہو کر زندگی کے بلند سے بلند مرتبے تک پہنچتے ہیں۔ لیکن تنزل کے کارواں کا جو بیج تھا وہ زمین پکڑ چکا تھا اور اس نے اپنے برگ و بار پیدا کرنا شروع کر دیے تھے اب کافی وقت تھا کہ وہ درخت جو پیدا ہوا تھا، وہ جب اس حد تک پہنچا اور بلند ہوا، تو اس کی پھیلی ہوئی شاخیں ہر ایک کو نظر آنے لگیں۔ اگر آپ تاریخ کا مطالعہ کریں، تو یہ بنیادی حقیقت سامنے اُبھر گئی۔ میں اس چیز کی طرف آپ کی توجہ دلا رہا تھا کہ ساتویں صدی ہجری کے بعد اسلامی علوم کے تنزل کا دور شروع ہوا۔ اب جب ہم نے اس زمانے کو ایک حد تک معین کر لیا، تو ہمارے لیے یہ چیز صاف ہو گئی کہ ہندستان میں مسلمانوں کے درس و تدریس کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا، تو وہ کس خمیر سے پیدا ہوا تھا۔ ترقی کے خمیر سے یا تنزل کے خمیر سے۔ ہندستان میں اول ہی روز سے اسلامی علوم کے درس و تدریس کی بنیاد جو قائم ہوئی تھی، وہ تنزل کے دور کا نتیجہ تھی، ترقی کے دور کا نتیجہ نہیں تھی۔ اس کے خمیر میں تنزل کا مواد موجود تھا۔ ساتویں صدی ہجری سے پہلے اسلامی علوم کی ترقی کا دور ختم ہو چکا تھا۔ چھٹی صدی میں تاتاریوں کی بغاوت، خلافت کا خاتمہ اور بغداد کا قتلِ عام ان تمام چیزوں کا جو عالمگیر اثر پڑا علومِ اسلامیہ اور نیز ان کے دماغی اور علمی حالت پر، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر گوشے میں خرابیاں پیدا ہوئیں اور قدرتی طور سے یہ جو ایک گوشہ تھا درس و تدریس علوم کا وہ بھی اس سے متاثر ہوا۔ لیکن بہر حال اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہیے۔ لیکن سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ اب موجودہ حالت میں جو معاملہ ہمارے پاس موجود ہے اس کو کس شکل میں حل کرنا چاہیے۔ میں چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد وہاں تک پہنچوں۔ یہ چیز کہ جس ڈھنگ پر اسلامی اور

ذمہ داریاں بہت ہیں۔ وہ نہ صرف ملک کے سامنے، بلکہ تمام عالمِ اسلام کے آگے جوابدہ ہیں۔
کیا اب بھی وقت نہیں آیا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں اور اس عظیم الشان
خدمت کو انجام دیں! اس خواب کو جو سو برس سے لوگوں نے دیکھا ہے اور جو آج تک
شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا ہے کم از کم آج تو اس کی تعبیر عالمِ اسلامی کے سامنے آئے۔ اس
سلسلے میں اس پر غور کرنا چاہیے کہ جو طریقے اصلاح کے ہیں ان کی اہم باتیں کیا ہیں۔
اور مہمات کیا ہیں۔ سب سے پہلی چیز مختصراً میں آپ سے کہوں گا کہ وہ فنونِ آلیہ
کے متعلق ہے۔ میں نے فنونِ آلیہ کے متعلق آپ سے کہا وہ فن خود مقصود نہ ہو بلکہ
وسیلہ ہو کچھ ایسی چیزوں کا جو مقصود ہوں، تو اس لیے وہ بھی ضروری ہو گئے۔ کچھ
چیزیں تو بطور وسیلے کے ہیں اور کچھ چیزیں بطور مقصود کے ہیں۔ اس سے بڑھ کر
کوئی غلطی نہیں ہو سکتی، علم و نظر کے کسی صیغے میں کہ ہم وسیلے کو مقصد بنا دیں۔ بدقسمتی
یہ ہے کہ ہر گوشے میں سب سے پہلی ٹھوکر جو انسانی دماغ لیتا ہے، وہ یہ ہے کہ جس چیز کو
اس نے بطور وسیلے کے پکڑا تھا، اس نے اسے مقصود بنا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے
کہ علم و حقیقت کے ہر صیغے میں ہم مقصد سے اتنا دور جا پڑے ہیں کہ ہم کسی حالت
میں بھی اس کے نزدیک نہیں پہنچ سکتے ہیں۔ یہاں دیکھنا یہ ہے کہ کون سی چیز
وسیلہ ہے، اور کون سی چیز مقصود ہے۔ اگر ہم نے وسیلہ کو مقصود بنا لیا اور اسی
وسیلہ کو سمجھ لیا کہ یہ ہمارا مقصود ہے، تب ہم نے شیرازے کو درہم برہم کر دیا۔ تو
اس کو ڈھونڈنا پڑے گا کہ وہ فنونِ آلیہ کون کون ہیں! صرف و نحو اگرامر ہے تو صرف و
نحو ایک بنیادی چیز ہے کہ جس کے بغیر عربی زبان کو ہم نہیں سیکھ سکتے ہیں۔ آپ جس
چیز کو ڈھونڈنے نکلے ہیں، وہ عربی گرامر نہیں ہے، بلکہ وہ اسلامی علوم و فنون ہیں، جو
صندوق میں بند ہیں، اور ان پر قفل چڑھا ہوا ہے۔ آپ کو کنجی کی تلاش ہے۔ جو چیز آپ
کو ڈھونڈنا ہے اور جو صندوق کے اندر ہے، اس کو بغیر کنجی کے آپ نہیں پا سکتے۔ اور

تھا۔ ۱۴ نمبر اس اخبار کے نکلے۔ یہ اخبار پیرس سے نکلتا تھا۔ مہینے میں دو نمبر نکلتے تھے۔ حقیقتاً یہ ایک انقلاب انگیز چیز تھی۔ وہ اسکیم اس اخبار میں بھی شائع ہوئی۔ عربی بولنے والی دنیا پر اس اخبار نے اور اس اسکیم نے ایک انقلاب انگیز اثر ڈالا۔ بہرحال وہ مضامین کتاب کی شکل میں چھپ چکے ہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ایک سے زیادہ مضامین شیخ محمد عبدہ نے اس موضوع پر لکھے، مگر ان کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

آج جب ہم اس وقت لکھنؤ میں اکٹھا ہوئے ہیں، اس کی یاد دلانا بہت آسان ہے۔ اگر اس مسئلے کو کسی انجمن نے پوری قوت کے ساتھ اٹھایا تو وہ ندوۃ العلماء تھا۔ ندوۃ العلماء کے مدرسے کا قیام ۱۳۱۱ھ میں ہوا۔ بلکہ اس کے بعد ندوۃ العلماء علم کی تحریکوں کا مرکز بن گیا، اور آج بھی وہ بہت سے امتیازات رکھتا ہے۔ ندوۃ العلماء نے پوری قوت کے ساتھ یہ مسئلہ اٹھایا جس میں اربابِ فہم حضرات موجود تھے جو اس مسئلے کی گہرائی کو سمجھ سکتے تھے۔ ندوۃ العلماء نے اپنا بنیادی مقصد اصلاحِ نصابِ تعلیم قرار دیا تھا۔ مگر میں اس کی تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔ اس کے مختلف وجوہ تھے کہ ندوۃ العلماء اس معاملے میں قدم آگے نہ بڑھا سکا اور یہ گتھی سلجھ نہ سکی۔ اور ابھی تک الجھی ہوئی ہے۔ حالاں کہ بارہا ندوۃ العلماء نے اس سلسلہ میں جو قیمتی خدمات انجام دی ہیں، وہ ہمیشہ اس مسئلے کو سلجھانے میں مدد دیں گی۔ مجھے بہت جلد اپنی داستان کو ختم کرنا ہے۔ جہاں تک اس چیز کا تعلق ہے کہ عربی اور اسلامی علوم کی تعلیم جس ڈھنگ پر دی جارہی ہے، اس کی اصلاح ہو، اس کے بارے میں اہم اور بنیادی چیزیں کہی گئی ہیں۔ وہ چیزیں سرسری طور پر ہمارے سامنے ہیں۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ۔ اور اس کے بعد ہم کو موقع ملے گا کہ ہم غور کر سکیں کہ کیا واقعی ان اصلاحوں کی ضرورت ہے! کیا اب بھی وقت نہیں آیا ہے کہ جو حضرات مسلمانوں کی تعلیم کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں، اسلامی علوم کی تعلیم کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں، وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں؟ ان کی

اوپر ایک وقت میں تین بوجھ ڈالے۔ پہلا بوجھ خود عربی زبان کا ہے۔ دوسرا بوجھ کتاب کا اور جو اس میں عبارت لکھی گئی ہے اور تیسرا بوجھ یہ کہ اس زبان کو سیکھیے جو اس کی مادری زبان نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارا پرانا طریقہ یہ تھا کہ عربی صرف و نحو اور گرامر، میزان اور منشعب سے شروع ہوتی تھی۔ اور صرف میر اور نحو میر پڑھائی جاتی تھی۔ یہ کتابیں جس زمانے کے لیے لکھی گئی تھیں، اس زمانے کے لیے صحیح تھیں کیونکہ فارسی زبان اس زمانے میں عام طور پر پھیلی ہوئی تھی۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے یہاں فارسی اجنبی زبان ہے۔ ہندوستان میں کبھی ایسا دور نہیں گذرا کہ فارسی مادری زبان ہوئی ہو۔ لیکن اس میں شبہہ نہیں ہے کہ فارسی زبان کی تعلیم اتنی عام تھی کہ لوگوں کو اس سے توحش نہ تھا۔ اس لیے عربی صرف و نحو کی کتابیں فارسی زبان میں لکھی گئی تھیں۔

جو چیز میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں، وہ ایک گہری چیز ہے۔ مگر بہت صاف ہے، اور وہ بغیر کسی کد و کاوش کے آپ کے سامنے ابھر آئیگی۔ ایک شخص عربی زبان سے ناآشنا ہے۔ ایک بچہ آٹھ برس کا عربی زبان کو شروع کرتا ہے۔ آپ میزان اور منشعب سے شروع کراتے ہیں۔ فارسی زبان اس کے لیے اجنبی زبان ہے، اس کی مادری زبان اردو ہے۔ آپ ایک ہی وقت میں اس پر تین بوجھ ڈالتے ہیں۔ پہلا بوجھ یہ ہے کہ وہ فارسی عبارت کو حل کرے جو اس کے لیے بالکل بیگانہ زبان ہے۔ دوسرا بوجھ یہ ہے کہ وہ کتابیں اور وہ رسائل اس ڈھنگ پر لکھے گئے ہیں کہ فنِ تعلیم کے لحاظ سے جو سہل آسان اور سمویا ہوا ڈھنگ ہونا چاہیے اس ڈھنگ پر وہ نہیں لکھے گئے۔ تیسرا بوجھ ہے عربی صرف و نحو کے سمجھنے کا۔ تو اب آپ غور کیجیے کہ اس کا دماغ ایک ہی وقت میں آپ کتنی قوتوں میں ضائع کر رہے ہیں! اس کی ساری دماغی قوت تین خانوں میں بٹ رہی ہے۔ فارسی زبان کا سمجھنا، عبارت کا حل کرنا اور عربی گرامر

صرف و نحو وہ کنجی ہے جس سے اس صندوق کا قفل کھل سکتا ہے۔ اس طرح علم ادب، عربی علم ادب ہے۔ جب تک آپ کی قابلیت پورے طور پر نہیں ہوتی ہے اور وہ قابلیت صحت کے ساتھ پیدا ہوتی ہے، اس وقت تک آپ اپنے مقصود سے آشنا نہیں ہو سکتے۔ اس طریقے سے لاجک (logic) اور منطق بھی ضروری ہے۔ منطق بجائے خود مقصود نہیں ہے۔ اصلی مقصد تو آپ کا ہے کسی نتیجے تک پہنچنا کسی بحث کو اس طریقے سے ترتیب دینا کہ صحیح نتیجے تک آپ پہنچیں۔ یہ چیز آپ کو حاصل نہیں ہو سکتی، جس کی آپ کو ضرورت ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ منطق بھی بہرحال وسیلہ ہوئی اور مقصود نہیں ہوئی۔ اور وہ فنونِ آلیہ میں داخل ہوئی۔ آپ کو توجہ دلاؤں گا کہ اگر آپ تھوڑی دور تک بھی میرے ساتھ چلیں میں زیادہ دور تک آپ کو لے جانے کی ہمت نہیں کروں گا۔ چند قدم آپ میرے ساتھ چلیں، اور مجھے یقین ہے کہ آپ میری طرح مطمئن ہو جائیں گے کہ ان فنونِ آلیہ کی تعلیم جو ہمارے مدرسوں میں دی جا رہی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ اور جو کام تھوڑے وقت میں کیا جاتا ہے اس کام کو ہم زیادہ وقت میں کر رہے ہیں۔ اور بہتر نتیجہ نہیں نکل رہا ہے، تو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ابھی میں نے آپ سے کہا تھا کہ طالب علموں پر دوسری جگہ دو بوجھ ڈالے جاتے ہیں مگر ہمارے یہاں ہندستان میں طالب علم پر بیک وقت تین بوجھ پڑ رہے ہیں۔ سب سے پہلی بات جو میں آپ کو یاد دلاؤں گا، وہ یہ ہے کہ نہ عربی ہماری مادری زبان ہے اور نہ فارسی ہماری مادری زبان ہے۔ جو طالب علم تیار کیا جاتا ہے اس کے سامنے یہ اجنبی زبانیں ہوتی ہیں۔ اور اس کو ایک لمبی چوڑی مسافت عربی زبان میں طے کرنا پڑتی ہے۔ آپ ایک طالب علم کو ایک مدرسے میں بٹھاتے ہیں اور اس کے سامنے عربی کتابیں رکھتے ہیں۔ آپ یہ چیز محسوس نہیں کرتے ہیں کہ عربی زبان میں آپ نے اس کے

نحو کی پہلی کتاب اردو میں ہونی چاہیے۔ اسی طرح سے منطق کی پہلی کتاب اردو میں ہونی چاہیے۔ اس طریقے سے جتنے فنونِ آلیہ ہیں، ان کی پہلی کتاب مادری زبان میں ہونی چاہیے، تاکہ بیک وقت حلِ زبان، حلِ عبارت، حلِ موضوع کا بوجھ اس کے اوپر نہ پڑے۔ اس میں بھی بال و پر ہیں، مگر میں اس کو ختم کرتا ہوں۔

دوسری چیز جس کی تفصیل میں میں نہ جاؤں گا، وہ متون و شرح کی بابت ہے۔ اس کا طریقہ حدِ اعتدال سے گذر گیا۔ جس حد تک یہ معاملہ پہنچ گیا ہے، وہ ہماری تعلیمی قوت کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ تو بہرحال یہ چیز بھی پیشِ نظر رکھیے۔ ایک اور اہم چیز یہ ہے کہ متون و شروح کے جو طریقہ اختیار کیے گئے ہیں، ان میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے۔ تیسری چیز جو آپ سے میں کہوں گا، وہ یہ ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے ہندستان میں عربی علم و ادب کی تعلیم ہمیشہ کمزور رہی۔ آپ کو معلوم ہے کہ عربی علم ادب میں اسلامی علوم کا خزانہ مدفون ہے اور بغیر اس سے آشنا ہوئے ہم اسلامی علوم سے آشنا نہیں ہو سکتے۔ ہندستان میں ادبِ عربی کی تعلیم کا سلسلہ ہمیشہ کمزور رہا ہے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندستان کی ایک ہزار برس کی زندگی میں، جو یہاں اسلامی علوم کو آئے ہوئے ہو گئے، اس ایک ہزار برس کی زندگی میں اگر آپ معلوم کرنا چاہیں کہ کون کون اشخاص ایسے پیدا ہوئے، جن کو یہ قدرت تھی کہ وہ ایک عرب کی طرح سلیس اور فصیح عربی لکھ سکیں۔ جتنے اشخاص پیدا ہوئے ہیں، میں ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گن سکتا ہوں، اور پانچوں انگلیوں کا شمار نہیں ختم ہوگا کہ نام ختم ہو جائیں گے۔ یہ چیز ہمیشہ کمزور رہی۔ اس کے کیا اسباب تھے! آپ اگر اس میں جائیں گے، تو یہ ایک بڑی داستان معلوم ہوگی۔ اس داستان کا ایک حصّہ اس بنیادی غلطی پر مبنی ہے جو اس کے بارے میں ہوئی۔ آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ ایک چیز فنِ بدیع ہے اور ایک فنِ کتابت

یعنی صرف ونحو کے مسائل کو سمجھنا اور حل کرنا ہے۔ ان تینوں خانوں میں اس کا دماغ بٹ جاتا ہے۔ اگر آپ نے یہ طریقہ اختیار کیا ہوتا کہ اس کا دماغ ایک ہی چیز میں صرف ہوتا یعنی صرف ونحو حاصل کرنا، تو کیا وہ عربی زبان کے صرف ونحو کو زیادہ مضبوطی کے ساتھ اپنے دماغ میں جگہ نہ دیتا؟ اور عربی زبان کا صرف ونحو اس کے دماغ میں راسخ نہ ہوجاتا؟ لیکن آپ ایک ہی وقت میں اس کے دماغ پر تین بوجھ ڈالتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کی دماغی قوت منتشر ہوجاتی ہے۔ اور جو چیز آپ اس کو سکھا رہے ہیں یعنی صرف ونحو اس کی دماغی قوت اس کو مرکز بنا کر سامنے نہیں رکھتی۔ دماغ بھٹکتا ہے۔ چونکہ فارسی ایک اجنبی زبان ہے۔ فارسی کی عبارت کا مطلب اوّل سمجھے۔ عبارت پیچیدہ ہے، اس کے حل کرنے میں اسے دقّت ہوتی ہے، اور عربی صرف و نحو کے حاصل کرنے میں مزید مشکل پڑتی ہے۔ بہرحال اب مجھے جلد ختم کرنا ہے۔ ایک بنیادی غلطی جو عربی تعلیم میں ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس چیز کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی ہے کہ اگر ہم اصلاح چاہتے ہیں، تو بہرحال ہمیں تسلیم کرنا ہے کہ ہندستان میں عربی علم اور تعلیم میں جس فن کی تعلیم بھی شروع کی جائے، اس کی پہلی رونمائی مادری زبان میں ہونا چاہیے، تاکہ وہ اس کو فوراً پکڑ لے۔ اور اگر پہلی رونمائی مادری زبان میں نہیں ہوتی ہے اور ایک اجنبی رُوپ اس کے سامنے آتا ہے، جسے وہ پہچانتا نہیں ہے، تو پھر کافی وقت اس کے دماغ کو لگ جاتا ہے کہ وہ اپنے دماغ کو اس اجنبی صورت سے آشنا کرے۔ آپ اس کو فارسی پڑھانا چاہتے ہیں، اس کی کیا ضرورت ہے کہ عربی صرف ونحو کی تعلیم کے پیچ وخم سے اس کے دماغ کو متوحّش کریں۔ بلکہ بنیادی اصول یہ ہونا چاہیے کہ ہر فن کی ابتدائی رُونمائی مادری زبان میں ہوا کرے۔ کوئی علم جو اس کے سامنے آئے، پہلی مرتبہ جو اپنا گھونگھٹ ہٹائے، اپنے چہرہ سے تو وہ یہ سمجھے کہ یہ جانی بوجھی ہوئی صورت ہے۔ تو نتیجہ یہ نکلا کہ عربی کے صرف و

رکھ کر آپ نمونہ پیش کرنا چاہتے ہیں کہ عربی میں اونچی سے اونچی ترقی جو ہو سکتی ہے، وہ یہ ہے؟ اس طرح سے آپ طالب علم کا وقت خراب کرتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو لکھنا تک نہیں آتا ہے۔ لیکن کوشش یہ کی جاتی ہے کہ اس کے سامنے نمونہ فن بدیع کا رکھا جائے، لفظی کاریگری کا جس کا کتابت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر آپ ایک صفحہ لکھیں جس میں قاف (ق) کا لفظ نہ آئے، یا ایسا صفحہ لکھیں کہ جس میں ہر لفظ میں یا ہر سطر میں قاف (ق) آئے، اگر آپ کی عمر کا دامن بہت پھیلا ہوا ہے تو کیجیے، چشم ما روشن دلِ ما شاد۔ لیکن آپ نمونہ خطوط لکھنے کا نہیں بنا سکتے ہیں۔ اگر ایک شخص کو خط لکھنا ہے جس میں کہ (ص) نہ آئے، (ب) نہ آئے، اگر اس طریقہ سے کوئی خط لکھنے لگے گا، تو اس کو لوگ مجنون سمجھنے لگیں گے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فنِ بدیع الگ ہے اور فنِ کتابت الگ ہے۔

حضرات! مجھے معاف کیا جائے کہ ۱۴ یا ۱۵ برس تک لڑکے پڑھتے ہیں، اور دس سطریں عربی کی صلاحیت کے ساتھ نہیں لکھ سکتے۔ اگر لکھینگے تو ایسی عربی ہوگی جس کو ایک عرب پہچان نہ سکیگا۔ تو یہ ایک بہت بڑا نقص ہے جو ہندستان میں پیدا ہوا۔ ضرورت ہے کہ عربی کی تعلیم کی نیو نئے سرے سے قائم کریں۔ بہترین کتابیں موجود ہیں، بہترین مواد موجود ہے، ایسی کتابیں موجود ہیں کہ عربی ادب کے معجزات میں جن کا شمار ہو سکے۔ مقامات قطعاً درس میں داخل نہ ہونا چاہییے۔ افسوس یہ ہے کہ ایسی اہم چیز کی طرف آتے ہوئے مجھے دیر لگ گئی۔ بہرحال یہ معاملہ اتنا اہم ہے اور اتنا کم وقت مجھے ملا، جس کا مجھے افسوس ہے۔ لیکن زیادہ سے زیادہ زور جواب میرے دماغ میں باقی ہے، وہ میں کوشش کروں گا کہ اس میں صرف ہو۔

حضرات! اب میں آتا ہوں معقولات پر۔ آپ کی تعلیم کا بہت بڑا حصہ ان چیزوں پر مشتمل ہے، جن کو عام بول چال میں معقولات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جہاں تک

یہ کتنی بڑی بنیادی غلطی تھی کہ لوگوں نے فنِ بدیع اور فنِ کتابت میں فرق نہیں کیا۔ بدیع کیا ہے، یہ آپ سے کہنے کی ضرورت نہیں۔ جہاں جدید تعلیم یافتہ احباب موجود ہیں فنِ بدیع ایک طرح کی صنعت گری ہے، جو ابھرتی ہے تنزّل کے زمانے میں۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ لفظوں کا گورکھ دھندا بنانے میں بڑے سے بڑا کمال دکھایا جاتا ہے۔ ہر زبان میں پہلا دور معانی کا دور ہوتا ہے اس کے بعد جو لوگ آئیں گے، تو محسوس کریں گے کہ معانی کی جھولی خالی ہو چکی ہے۔ لہٰذا وہ لفظوں کے گورکھ دھندے میں پھنس جائیں گے۔ اگر گرمی کا لفظ پہلے مصرع میں آیا، تو سردی کا لفظ دوسرے مصرع میں آنا ضروری ہے۔ اس طرح کی جو لفظی کاریگریاں ہیں ان کو عربی میں کہتے ہیں فنِ بدیع۔ یہ تو آپ سمجھ گئے کہ فنِ بدیع یعنی لفظی صنعت گری کا فن، یہ ایک الگ چیز ہے، اس کو آپ نثر میں بھی لا سکتے ہیں اور نظم میں بھی۔ صحیح ادبی ڈھنگ پر لکھنا، یہ چیز ہے فنِ کتابت۔ کتابت میں اگر آپ فنِ بدیع کو جوڑ دیں گے، تو وہ کتابت نہیں رہے گی۔ اور یہ لفظوں کی صنعت گری، لفظوں کا گورکھ دھندا اور کتابت کا معمّا اور چیستان اور تماشا بن جائے گا، لیکن فنِ کتابت نہ ہوگی۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ فنِ بدیع کا زیادہ تعلق نثر سے ہے یہ چیز وہ ہے جو عربی میں نثر سے پیدا ہوئی ہے۔ اسے مقامات کا طریقہ کہہ سکتے ہیں۔ اور اس کے لکھنے والے کو اصحابِ مقامات کہتے ہیں۔ مثلاً حریری کے مقامات، بدیع الزمان کے مقامات۔ بہر حال یہ فنِ بدیع میں لکھے گئے تھے۔ اور ان کی وجہ سے ان کی شہرت ہوئی۔ لیکن خود حریری اور بدیع الزمان کے ذہن میں ایک منٹ کے لیے بھی یہ بات نہیں آئی کہ کوئی زمانہ لفظی صنعت گری کا ایسا آئے گا کہ وہ فنِ کتابت کا نمونہ سمجھا جائے گا۔ لیکن ہندستان میں عربی کی تعلیم کا جب خیال پیدا ہوا تو مقاماتِ حریری طالبعلموں کے سامنے رکھ دیے گئے۔ خدارا انصاف کیجیے کہ فنِ کتابت سے اس کا کیا تعلق ہے! اور کیا اس کو درس میں

جہاں تک معقولات کا تعلق ہے آپ اس حقیقت پر غور کریں کہ معقولات کا جو کچھ ذخیرہ ہے وہ سب بیکار ہے سوائے اس کے کہ دماغ کو اس سے بیکار کریں اور کوئی نتیجہ نہیں ہے۔ بہر حال اب میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ لیکن اس پر توجہ دلاؤں گا کہ اس میں شک نہیں ہے کہ فلسفہ اور تاریخ میں ایک عہد متوسط ہے اور آج کل کی بول چال میں فلسفۂ تاریخ کے جو خاص حصے کیے گئے ہیں اس میں ایک زمانہ ہے دورِ وسطیٰ کا۔ یہ درمیانی عہد حقیقتاً ایک کڑی ہے جو یونانی فلسفے کو موجودہ زمانے کے فلسفے سے قریب کرتی ہے اور یہ کڑی دراصل عربوں کا فلسفہ ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ عربوں نے اپنے فلسفیانہ جدوجہد کے زمانہ میں جو یادگاریں چھوڑی ہیں وہ فلسفہ کے مختلف صیغوں پر چھائی ہوئی ہیں۔ کہ ان کو دیکھ کر ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ یونان نے، ہندستان نے، معاملات کو جس حد تک پہنچایا تھا اب اس کے بعد عربوں نے آج کل کے فلسفہ کو جس جگہ پہنچایا ہے اس کے بیچ کی ایک جگہ ہے تو پچھلی جگہ سے ہٹتی ہوئی، آنے والی جگہ سے جڑتی ہوئی۔ یہ عربوں کا فلسفہ ہے۔ اگر یہ کڑی بیچ کی نہ ہوتی تو شاید نئے دور میں جو اٹھان ہوئی ہے وہ اٹھان اس شکل میں نہ ہوتی۔ بہر حال یہ وہ دور ہے، جسے موجودہ زمانے کے لوگوں نے تسلیم کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ وہ نہایت عظیم اور بلند چیز ہے۔ لیکن وہ اس لیے نہیں ہے کہ اس فلسفہ کی تعلیم میں وقت صرف کریں، اور فائدہ اٹھائیں۔ وہ ایک قیمتی میراث ہے اور ہمارا فرض ہے کہ اس کو محفوظ رکھیں، اس کی بلندی اور عظمت کو نمایاں رکھیں اس لیے زمانے کو اس کی ضرورت ہے کہ کوئی ایک کتاب ایسی ہو کہ جس سے اہلِ علم کو معلوم ہو سکے کہ فلسفہ عربوں نے جو یونانیوں سے لیا اس کو انھوں نے کس طریقہ سے محفوظ رکھا اور آنے والی نسلوں تک پہنچایا۔ نیز اس کے مباحث میں انھوں نے کتنے نئے قدم اٹھائے۔ بلاشبہہ کوئی نہ کوئی ایسی چیز ضرور ہونا چاہیے کہ جس کے ذریعہ سے

درسِ نظامیہ کا تعلق ہے، اول روز سے اس کی بنیاد اس پر رکھی گئی ہے کہ زیادہ سے زیادہ عنصر معقولات کا رکھا جائے۔ خود ملا نظام الدین نے جو کتابیں رکھی ہیں، وہ محدود تھیں۔ ہمارے درسِ نظامیہ میں معقولات کا عنصر بہت چھا گیا ہے۔ اب میں اس کی مقدار کے متعلق آپ کو متوجہ نہیں کرنا چاہتا۔ بہرحال میں اس چیز کی طرف آپ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ ۱۹۴۷ء میں کیا اس کا وقت نہیں آیا ہے کہ آپ اس حقیقت کو تسلیم کریں کہ جو حقیقت آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے دنیا نے تسلیم کرلی تھی، کب تک آپ اس سے انکار کرتے رہیں گے؟ کب تک آپ اس کو جھٹلائیں گے؟ کیا آپ نے اس کو محسوس کیا ہے کہ دنیا کہاں جارہی ہے اور اب کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے؟ میں نے بھی پھٹی ہوئی چٹائیوں پر بیٹھ کر ان کتابوں کو پڑھا ہے اور میری ابتدائی تعلیم کا وہ سرمایہ ہیں۔ ایک منٹ کے لیے بھی میرے اندر مخالفت کا خیال نہیں پیدا ہوسکتا ہے۔ مگر اس بارے میں میرا دل زخمی ہے۔ یہ معاملہ تو ایسا تھا کہ آج سے ایک سو برس پہلے ہم نے اس چیز کو محسوس کیا ہوتا اور اس حقیقت کو تسلیم کیا ہوتا کہ اب دنیا کہاں سے کہاں آگئی ہے اور اس کے بارے میں کیا تبدیلی ہمیں کرنا ہے۔ لیکن اگر سو برس پہلے ہم نے تبدیلی نہیں کی، تو کم از کم یہ تبدیلی ہم کو پچاس برس پہلے کرنا چاہیے تھی۔ لیکن آج ۱۹۴۷ء میں اپنے مدرسوں میں جن چیزوں کو ہم معقولات کے نام سے پڑھا رہے ہیں، وہ وہی چیزیں ہیں، جن سے دنیا کا دماغی کارواں دو سو برس پہلے گذر چکا۔ آج ان کی دنیا میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اگر میں اس معاملے کی تفصیل میں جاؤں اور میں آپ کو توجہ دلاؤں، تو کم از کم تین چار گھنٹے چاہییں کہ حقیقتاً معاملات کی نوعیت کیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کم از کم جس زمانہ میں ندوۃ العلماء قائم ہوا تھا، آج سے چالیس برس پہلے، اس وقت شاید یہ دقتیں ہوں۔ لیکن اب یہ حقیقت اتنی کھل چکی ہے کہ اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ

یہ تعلیم اور اس تعلیم کا طریقہ غلط تھا، تو کیونکر ممکن تھا کہ اس کے پڑھے ہوئے ایسا انقلاب پیدا کر سکتے، اور شہنشاہی امور میں اونچے سے اونچے عہدہ پر پہنچ سکتے۔ ابوالفضل[4] اور فیضی[5] کہاں کے پڑھے ہوئے تھے؟ نظام الملک طوسی[6] کہاں کے پڑھے ہوئے تھے؟ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے ملک کے انتظام کی باگیں اپنے ہاتھ میں لیں اور اپنے نقوش اور یادگار ہمیشہ کے لیے چھوڑے۔ آپ کو معلوم ہے کہ زمین کی پیمائش اور اس کے بندوبست کا خیال، اور بندوبست کے لفظ کی اصطلاح آپ کو معلوم ہے کہ بنیادی طور پر بندوبست آج بھی ان ہی کھمبوں پر قائم ہے جن کھمبوں پر اکبر کے زمانے میں قائم ہوا تھا۔ پہلی بنیاد توشیر شاہ[8] کے زمانے میں پڑی لیکن اکبر کے زمانے میں اس کی تنقیح کی گئی اور ٹوڈرمل[9] نے اس کو مکمل کر دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کا نقشہ کس نے بنایا تھا؟ حکیم فتح اللہ شیرازی[10] ایک شخص تھا، وہ شیراز کا ایک پروفیسر تھا۔ وہ ہندستان آیا، اکبر کے زمانے میں۔ یہ پیمائش کا معاملہ اس کے سپرد کیا گیا۔ فتح اللہ نے ایک رسالہ اس کے اوپر لکھا اور راجہ ٹوڈرمل نے مل کر اس کام کو انجام دیا۔ آخر یہی تو تعلیم تھی جس تعلیم سے ایسے لوگ پیدا ہوئے۔ نہ صرف علوم و فنون کے صیغے میں، بلکہ ملک کے انتظامی معاملات میں بھی ان کا ہمیشہ دخل رہا۔ آج میں کہوں گا کہ کبھی اونچے عہدے پر کسی مولوی کو رکھ دیجیے تو لوگ ہمیں پریشان کریں گے۔ لیکن یہی مولوی تھے، جن کے ہاتھ میں سیول (Civil) اور دیوانی کے انتظامات تھے۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، وہی لوگ تھے جو ان ہی مدرسوں سے تعلیم حاصل کر کے آئے تھے اور جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے، وہ پاٹھ شالاؤں کے پڑھے ہوئے تھے۔ مگر ایک چیز آپ بھول گئے۔ وہ چیز ہے تعلیم۔ اور وقت اور زندگی کی چال کے متعلق کوئی تعلیم کامیاب نہیں ہو سکتی، اگر وہ وقت اور زندگی کی چال کے ساتھ نہ ہو۔ جو تعلیم ہو وہ ایسی ہونی چاہیے کہ زمانہ کی جو چال ہے،

ہم اس چیز کو محفوظ رکھ سکیں۔ آج جو طریقہ ہے فلسفہ کا۔ مثلاً انھوں نے گریک فلسفہ کو لیا، یونانی فلسفہ کو لیا۔ اس کے خاص مسائل پر روشنی ڈالی۔ بیچ کا جو دور آیا اس کی کہانی سنائی۔ اس کے بعد ماڈرن زمانہ آیا جسے عہدِ حاضر کہتے ہیں۔ اب یہ دماغ اس کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس کے آگے جو ایک تصویر آجاتی ہے، فلسفہ کے مختلف عہدوں کی، مختلف دوروں کی، وہ اس کے لیے کفایت کرتا ہے کہ دماغ آگے بڑھنے کے لیے تیار ہو جائے۔ اب ہمیں کوئی نہ کوئی چیز اس طریقے کی رکھنا ہے کہ جو قدیم ذخیرہ موجود ہے اس کو ہم پورے طور پر محفوظ رکھ سکیں اور نمایاں رکھیں، کہ ایک طالب علم جو ہمارے مدرسے میں آیا ہے، وہ اس سے بیخبر نہ رہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کے ضرورت ہے کہ یہ حقیقت مان لی جائے کہ دراصل جو فلسفہ آپ کو پڑھانا ہے، وہ مختلف مسائل ہیں جو کہ اس وقت منقّح ہو چکے ہیں۔ اگر یہ چیز آپ نہیں کرتے تو میں آپ سے کہوں گا کہ آپ زمانہ سے واقف نہیں ہیں۔ بلکہ آپ زمانے سے لڑ رہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ تاریخ کی ایک لمبی چوڑی داستان ہمارے سامنے ہے، جو ہم کو یقین دلاتی ہے کہ قدامت پرستی نے جب ہتھیار اٹھایا، تو نتیجہ یہ نکلا کہ کش مکش ہوئی۔ مگر اس کشمکش کا یہ نتیجہ نکلا کہ قدامت پرستی کو ہارنا پڑا اور وقت کو جیتنا پڑا۔ اب اس کشمکش کی عمر بڑھ سکتی ہے۔ لیکن آخر میں ہار ماننا پڑے گی، قدامت پرستی کو۔ تو اس سلسلے میں جیسا میں نے کہا کہ آپ وقت سے لڑ نہیں سکتے۔ ایک چیز میں نے آپ سے کہی کہ آپ وقت سے نہیں لڑ سکتے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے اتنی لمبی چوڑی کہانی سنائی اور یہ کہہ دیا کہ ساتویں صدی کے بعد سے جو دور رہا، وہ تنزّل کا دور رہا۔ لیکن اس ساتویں صدی کے بعد یہی مدرسے تھے، یہی تعلیم گاہیں تھیں، اور یہی نصابِ تعلیم تھا، یہی پڑھانے والے تھے، جن سے ایسے لوگ پیدا ہوئے، جن کی قابلیت کا یہ حال تھا کہ علوم و فنون تو چھوڑ دیجیے، ملک کے انتظام کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ اگر

جو انگریزی تعلیم کے حاصل کیے ہوئے اور پڑھے ہوئے لوگوں کے لیے کھلے ہوئے ہیں؟ کون سی وجہ ہے کہ جو تعلیم ہمارے ملک کی اصلی تعلیم مدرسوں اور پاٹھ شالاؤں میں دی جاتی تھی، اور جس تعلیم کو حاصل کر کے فتح اللہ شیرازی اور ٹوڈرمل پیدا ہوتے تھے، آج اس تعلیم سے جو لوگ نکلے ہیں، ان پر ملک کے انتظامی دروازہ بند ہوں؟ مجھے ان کے جواب دینے کی مہلت نہیں ہوئی۔

لیکن میں آپ سے کہتا ہوں کہ اس کا جواب اسی میں موجود ہے۔ آپ نے کبھی اس کی کوشش نہیں کی کہ آپ اپنے مدرسوں کو زمانہ کی چال کے ساتھ جوڑ سکیں۔ زمانہ چلتا رہا اور ترقی پر پہنچ گیا۔ اور آپ وہیں رہے جہاں تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی تعلیم کو زمانہ کی مانگوں سے کوئی رشتہ نہیں رہا۔ اور زمانہ نے آپ کے خلاف آپ کو نکما سمجھ کر فیصلہ کر دیا۔ زمانہ نے آپ کو بیکار سمجھا ہے، آپ کو نکما سمجھا ہے۔ مدرسہ میں عربی آن کر پڑھنا ہے، تو یہ مجبوری ہے کہ کسی نہ کسی مولوی کو رکھ لیا لیکن کوئی حقیقی وقعت آپ کے دل میں مولوی کی نہیں ہے۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے آپ کے دل میں اس کی عزت ہونا چاہیے۔ تو میں آپ سے کہتا ہوں کہ اس کی تہ میں جو چیز ہے وہ زمانے کی ناقدر شناسی ہے۔

ہم کو اپنی جگہ اس کے ساتھ یہ بھی ماننا چاہیے کہ ہمارا فرض تھا کہ ہم زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دیتے۔ مگر ہم نے زمانے کا ساتھ نہیں دیا۔ بہرحال تقریباً آدھے سے زیادہ باتیں باقی رہ گئی ہیں۔ چار بجنے میں چھ منٹ باقی ہیں، لیکن اب میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ اب مجھے آپ سے یہ عرض کرنا ہے کہ کام تو اس وقت ادھورا رہ گیا ہے، مگر میں آپ سے امید کرتا ہوں کہ آپ کل بھی میرا ساتھ دینگے، اور جس طرح سے آپ نے آج کے لیے وقت نکالا ہے کل بھی وقت ـــــ نکالیں گے۔ کام ابھی بہت کرنے کا ہے میں چاہتا تھا کہ اگر آپ متفق ہوں تو کل بجائے دو کے ایک بجے کا وقت رکھا جائے۔ اگر یہ

وہ اس کے ساتھ جُڑ سکتی ہو۔ اگر آپ دونوں ٹکڑوں کو الگ الگ رکھیں گے، تو وہ تعلیم کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہی عربی کی اور فارسی کی تعلیم تھی، لیکن اس وقت زمانہ ۱۹۴۷ء کا نہ تھا۔ اس تعلیم میں اور وقت میں رشتہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جُڑے ہوئے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ ان مدرسوں سے جو لوگ پیدا ہوئے زمانہ ان کا استقبال کرتا تھا۔ بہر طور وہ زمانہ گزر گیا۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوا کہ زمانہ تو اپنی پوری تیز رفتاری کے ساتھ چلتا رہا اور آپ وہیں بیٹھے رہے۔ آپ ان ہی مدرسوں میں بیٹھے رہے، جن مدرسوں میں آپ نے آج سے پانچ سو برس پہلے قدم رکھا تھا۔ اس پانچ سو برس کے اندر دنیا بیٹھی نہیں رہی۔ زمانہ بھی چلتا رہا۔ وہ پانچ سو برس کی مسافت طے کر چکا ہے اور آپ وہیں کے وہیں بیٹھے ہوئے ہیں۔ آج جو تعلیم آپ ان مدرسوں میں دے رہے ہیں، آپ وقت کی چال سے اسے کیسے جوڑ سکتے ہیں؟ نہیں جوڑ سکتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ زمانہ میں اور آپ میں ایک اونچی دیوار کھڑی ہو گئی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ تعلیم کہ جس تعلیم سے ملک کے بہترین مدبّر، ملک کے بہترین منتظم، اور ملک کے بہترین عہدہ دار پیدا ہوتے تھے، آج ان ہی مدرسوں کو یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ یہ لوگ بالکل نکمّے ہیں، ان مدرسوں سے نکلنے کے بعد مسجدوں میں بیٹھ کر یہ لوگ بس خیرات کی روٹیاں توڑ لیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں، انھوں نے حقیقت کو نہیں سمجھا ہے۔ لیکن ہمیں یہ ماننا پڑیگا اور اس میں کوئی شبہہ نہیں ہے کہ ہم زمانے سے دور ہو گئے ہیں۔ میرے پاس ایک بہت ہی جچی تُلی بہتر طریقے سے لکھی ہوئی ایک تحریر آئی، کہ چونکہ آپ گورنمنٹ آف انڈیا کے صیغۂ تعلیم میں موجود ہیں، تو کیا یہ توقع کی جائے کہ جو عربی فارسی علوم کے مدرسے موجود ہیں، جہاں سے بہتر سے بہتر مستعد طلبا فارغ ہو کر ڈگریاں حاصل کر کے نکلتے ہیں، کونسی وجہ ہے کہ ان کے لیے ملک کی انتظامی زندگی میں وہ دروازے کھلے نہ ہوں

۱۳

# روابط - بین ایشیائی کانفرنس

نئی دلّی، مارچ ۱۹۴۷ء

صدیوں کا سویا ہوا ایشیا عروسِ نو کی طرح انگڑائی لے کر بیدار ہو رہا ہے ہر طرف آزادی کی لہر پیدا ہو چکی ہے۔ چین نے سالہا سال کی بہادرانہ جنگ کے بعد جاپانی غلبہ سے نجات حاصل کی، انڈونیشیا آزاد ہو گیا ہے، فلپائن آزاد ہو گیا ہے، ویٹ نام آزادی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے، برما سے آزادی کا وعدہ کیا گیا ہے، ہندستان کی آزادی کی تاریخ مقرر ہو گئی ہے، فلسطین آزادی کا عزم کر چکا ہے، مصر سے برطانویوں کا انخلا ہو رہا ہے۔

ہندستان کو ابھی نیم آزادی ہی حاصل ہوئی تھی کہ اس نے اپنے ایشیائی بھائیوں کو دعوت دی کہ آؤ مل بیٹھیں اور مستقبل کے امن و امان، اتحاد و اخوت، باہمی میل جول کی ایک بنیاد رکھیں اور الحمدللہ کہ ہمارے ایشیائی بھائیوں نے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی، اس صدا پر لبیک کہا وہ سب پروانہ وار آئے کہ آئندہ زندہ رہنے کے لیے ایک لائحہ عمل مرتب کریں۔ ایشیا کے ۳۲ ممالک سے تقریباً ۲۵۰ نمایندے آئے ہیں اور ان میں سے تقریباً

آپ حضرات کے ناپسند نہ ہو تو بہتر ہے۔ اصلی کام ابھی باقی ہے۔ میں اس لیے نہیں آیا تھا کہ کچھ کہوں، بلکہ میں اس لیے آیا تھا کہ آپ حضرات سے سنوں۔ مجھے اس کا افسوس ہے میرا ارادہ تھا کہ میں کچھ عرض کر کے درخواست کروں گا کہ آپ حضرات اپنے مشورے سے مدد دیں۔ لیکن تمام وقت میری تقریر میں خراب ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہمارا کام کچھ آگے بڑھے گا اور ہم کامیابی کی حد تک پہنچے، تو زیادہ بہتر ہو گا۔ اس لیے ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم معاملات کو ترتیب کے ساتھ سوچیں اور اس کے بعد طے کر کے ایک سب کمیٹی اس کانفرنس کی بنا لی جائے۔ میری پریشان گوئی نے چونکہ سارا وقت لے لیا ہے، اس لیے ڈیڑھ بجے کل پھر یہ کانفرنس ہو گی۔

کرنے کو جمع ہوئی ہیں، جو کہ ان کے مشترکہ مسائل ہیں۔ وہ قومی آزادی کے مطالبہ کے باطنی مقاصد اور ظاہر صورت پر غور کریں گے۔ وہ اپنے مشترکہ کلچر کی الجھنوں کو سلجھانے کی کوشش اور رفعِ اختلافات و باہمی میل جول کے ذرائع تلاش کرینگے وہ اقتصادی مسائل کو سمجھنے کی سعی کریں گے، جس نے سوشل طریقوں میں اختلاف کی صورت پیدا کی ہے۔ اور ایسے سوشل طریقوں کو وضع کرنے کی کوشش کریں گے، جن کی رُو سے عوام مکمل اور آزاد زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

مندوبین میں مختلف ممالک کی عورتیں بھی شامل ہیں۔ اور اب تک کی تاریخ میں پہلی بار وہ بحیثیت ایشیا کی عورتوں کے اپنے مسائل پر غور کریں گی۔

اس سے قبل کبھی ایسا اجتماع نہیں ہوا ہے۔ اور یہ بڑی بدقسمتی ہوگی اگر کانفرنس لوگوں کے مستقبل اور باہمی اتحاد کے خاکہ کی بنیاد رکھے بغیر ناکامی کے ساتھ ختم ہوگئی۔ اس قسم کی آرگنائزیشن کی بنیاد شاید اب اور یہاں نہیں رکھی جا سکتی، بلکہ مستقبل میں کام کرنے کی تجاویز پر اس کانفرنس میں بحث ہونی چاہیے۔

میں یہ چاہتا ہوں کہ اس میں شریک ہونے والے تمام ممالک کے نمایندوں کی اسٹینڈنگ کمیٹی[1] کی ایک انسٹیٹیوٹ[2] ہونی چاہیے۔ اس انسٹیٹیوٹ کا کام صرف یہی نہ ہونا چاہیے کہ وہ وقتاً فوقتاً مختلف ممالک میں کانفرنسیں منعقد کرے۔ بلکہ لائبریریاں بھی بنائے، جہاں پر ان ممالک کی تازہ ترین کتب فراہم کی جائیں۔ انسٹیٹیوٹ اگر ماہنامہ نہیں، تو کم از کم ایک سہ ماہی جریدہ بھی جاری کرے جس میں مشرقی ممالک کے عوام سے متعلقہ سوالات اتحاد اور سوچنے سمجھنے کے جذبہ سے بحث کی جائے۔

## سیاسیات کو دخل نہ ہو

ہم سب کو مسرت ہونی چاہیے کہ ایشیائی اقوام کے اس عظیم کام میں رہنمائی کا شرف

۱۵ ممالک کے نمائندے اسلامی ملکوں کے نمائندے ہیں۔
اس موقعہ پر امام الہند مولانا آزاد نے اپنی بے مثال تاریخی بصیرت کی روشنی میں اس اجتماع پر ایک بیان دیا، جو حسب ذیل ہے۔

بین الایشیائی کانفرنس جس کا اجلاس آج کل دہلی میں ہو رہا ہے تاریخ میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ اس میں شک نہیں کہ بدھوں کے عہد میں ہندستان میں بھکشوؤں کے زبردست اجتماع ہوئے ہیں۔ اس میں برما، سیلون اور دور انڈونیشیا سے نمائندے شریک ہوئے ہیں۔ مگر وہ اجتماع خالص مذہبی مقاصد کے پیشِ نظر ہوئے ہیں۔ اور صرف بدھ مت کے حامیوں کے لیے مخصوص تھے۔ ان میں نہ وسعتِ مفاد پایا جاتا تھا نہ دہلی کی اس کانفرنس کی سی مختلف قوموں اور مذہبوں اور تمدنوں کی نمائندگی ہوتی تھی۔
اٹھارھویں صدی میں، نادر شاہ کو بھی مسلم عقائد کی ایک زبردست کانفرنس بلانے کا خیال ہوا۔ شیعیوں اور سنّیوں کے اختلافات سے اسلام کے اتحاد کو خطرہ لاحق تھا۔ خود شیعیوں اور سنّیوں میں دھڑے بندی اور اختلاف تھا۔ اس مجادلہ کے وقت ان اختلافات کو مٹانے کی کوشش میں بغداد میں علماء کا ایک زبردست اجتماع کیا گیا۔
اس میں عراق، ایران، بخارا، سمرقند اور دوسرے مسلمان مذہبی خیال کے مراکز سے نمائندے جمع ہوئے تھے۔ قدیم ہندستان کے بدھ مت کے پیروؤں کی یہ کانفرنس بھی ایک عقیدے کے حامیوں تک محدود تھی۔ اس میں بین الایشیائی کانفرنس کی طرح انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نظر نہ ہونے کی خامی بھی تھی۔

## عام مسائل

اس طرح یہ پہلا موقع ہے کہ جب اقوامِ ایشیا ایک پلیٹ فارم پر ان مسائل پر غور

۱۴

# مسلمانانِ دلّی کا اجتماع

جامع مسجد، دلّی اکتوبر ۱۹۴۷ء

میرے عزیزو! آپ جانتے ہیں کہ وہ کون سی چیز ہے جو مجھے یہاں لے آئی ہے۔ میرے لیے شاہ جہان کی اس یادگار مسجد میں یہ اجتماع کوئی نئی بات نہیں۔ ہے میں نے اُس زمانہ میں جس پر لیل و نہار کی بہت سی گردشیں بیت چکی ہیں، تمھیں یہیں سے خطاب کیا تھا۔ جب تمھارے چہروں پر اضمحلال کی بجائے اطمینان تھا اور تمھارے دلوں میں شک کی بجائے اعتماد۔ آج تمھارے چہروں کا اضطراب اور دلوں کی ویرانی دیکھتا ہوں، تو مجھے بے اختیار پچھلے چند برسوں کی بھولی بسری کہانیاں یاد آجاتی ہیں۔ تمھیں یاد ہے، میں نے تمھیں پکارا تم نے میری زبان کاٹ لی، میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر دیے۔ میں نے چلنا چاہا تم نے میرے پاؤں کاٹ دیے۔ میں نے کروٹ لینی چاہی، تم نے میری کمر توڑ دی۔ حتّٰی کہ پچھلے سات برس کی تلخ نوا سیاست جو تمھیں آج داغِ جدائی دے گئی ہے اس کے عہدِ شباب میں بھی میں نے تمھیں خطرے کی شاہراہ پر جھنجھوڑا، لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف احتراز کیا بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنّتیں تازہ کریں۔ نتیجہ معلوم کہ آج ان ہی خطروں نے تمھیں گھیر لیا ہے جن کا اندیشہ تمھیں صراطِ مستقیم سے دور لے گیا تھا۔

ہندستان کو حاصل ہے۔ بہرحال اب وقت آگیا ہے کہ آگے قدم بڑھایا جائے۔ اب عرصہ تک ہماری دنیا خوابوں اور تصوّرات تک محدود نہیں ہوگی بلکہ حقائق کی ایک زندہ تصویر بنے گی۔ انسانی اتحاد کے مقاصد کے لیے وقت اور فاصلہ کا سوال ختم ہوگیا ہے لہذا یہ ایشیائی کانفرنس ایک عالمگیر کلچر کانفرنس کا نمونہ تیار کرے جس میں صرف مشرقی ہی نہیں بلکہ مغربی اقوام بھی شرکت کریں۔

میں کانفرنس کے رہنماؤں کو کانفرنس کو غیر سیاسی اور ناطرفدار بنانے پر ان کی فہم و نظر پر مبارک باد دیتا ہوں۔ ایسی کلچرل کانفرنس میں تنگ نظر سیاست کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اور نہ فرقہ وارانہ اور جماعتی تعصّبات پیدا کرنے کی گنجایش ہے۔ مجھے اس بات میں قطعاً شبہہ نہیں ہے کہ شرکائے کانفرنس کے دلوں میں وسیع انسانی اور کلچرل نظریہ پیدا کرنے اور سمجھنے اور باہمی میل جول پیدا کرنے کا جذبہ موجود ہے۔

ہم ان لوگوں کے ممنون ہیں جنھوں نے ہندستان کا دعوت نامہ قبول کیا وہ دُور دراز ممالک سے آئے ہیں اور مجھے امید ہے کہ جب وہ واپس جائیں گے تو اپنے ساتھ ہندستان کی دوستی اور خیر سگالی کا پیغام لے کر جائیں گے۔

جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے روک نہیں سکتی۔ ہندستان کی تقدیر میں سیاسی انقلاب لکھا جا چکا ہے اور اس کی غلامانہ زنجیریں بیسویں صدی کی ہوائے حریت سے کٹ کر گرنے والی ہیں۔ اگر تم نے وقت کے پہلو بہ پہلو قدم اٹھانے سے پہلو تہی کی اور تعطّل کی موجودہ زندگی کو اپنا شعار بنائے رکھا، تو مستقبل کا مورّخ لکھے گا کہ تمھارے گروہ نے جو سات کروڑ انسانوں کا ایک غول تھا، ملک کی آزادی کے بارے میں وہ رویّہ اختیار کیا، جو صفحۂ ہستی سے محو ہو جانے والی قوموں کا شیوہ ہوا کرتا ہے۔ آج ہندستان کا جھنڈا اپنے پورے شکوہ سے لہرا رہا ہے۔ یہ وہی جھنڈا ہے جس کی اڑانوں سے حاکمانہ غرور کے دل آزار قہقہے تمسخر کیا کرتے تھے۔"

یہ ٹھیک ہے کہ وقت نے تمھاری خواہشوں کے مطابق انگڑائی نہیں لی، بلکہ اس نے ایک قوم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی۔ اور یہی وہ انقلاب ہے جس کی ایک کروٹ نے تمھیں بہت حد تک خوفزدہ کر دیا ہے۔ تم خیال کرتے ہو کہ تم سے کوئی اچھی شے چھن گئی ہے اور اس کی جگہ بری شے آگئی ہے۔ ہاں، تمھاری بیقراری اسی لیے ہے کہ تم نے اپنے تئیں اچھی شے کے لیے تیار نہیں کیا تھا۔ اور بری شے کو ملجا و ماویٰ سمجھ رکھا تھا۔ میری مراد غیر ملکی غلامی سے ہے۔ جس کے ہاتھوں تم نے مدتوں حاکمانہ طمع کا کھلونا بن کر زندگی بسر کی ہے۔ ایک دن تھا کہ جب ہماری قوم کے قدم کسی جنگ کے آغاز کی طرف تھے، اور آج تم اس جنگ کے انجام سے مضطرب ہو۔ آخر تمھاری اس عجلت پر کیا کہوں، کہ ادھر سفر کی جستجو ختم نہیں ہوئی اور اُدھر گمرہی کا خطرہ بھی پیش آگیا!

میرے بھائی! میں نے ہمیشہ سیاست کو ذاتیات سے الگ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے اس پُرخار وادی میں قدم نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ میری بہت سی باتیں کنایوں کا پہلو لیے ہوتی ہیں۔ لیکن مجھے آج جو کچھ کہنا ہے اسے بے روک ہو کر کہنا چاہتا ہوں متحدہ ہندستان کا بٹوارہ بنیادی طور پر غلط تھا۔ مذہبی اختلافات کو جس ڈھب سے ہوا دی گئی،

سچ پوچھو تو میں ایک جمود ہوں یا ایک دور افتادہ صدا، جس نے وطن میں رہ کر بھی غریب الوطنی کی زندگی گذاری ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو مقام میں نے پہلے دن اپنے لیے چُن لیا تھا، وہاں میرے بال و پر کاٹ لیے گئے ہیں۔ یا میرے آشیانے کے لیے جگہ نہیں رہی، بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دامن کو تمھاری دست درازیوں سے گلہ ہے۔ میرا احساس زخمی اور میرے دل کو صدمہ ہے۔ سوچو تو سہی، تم نے کونسی راہ اختیار کی؟ کہاں پہنچے اور اب کہاں کھڑے ہو؟ کیا یہ خوف کی زندگی نہیں؟ کیا تمھارے حواس میں اختلال نہیں آگیا ہے؟ یہ خوف تم نے خود ہی فراہم کیا ہے۔ یہ تمھارے اپنے اعمال کے پھل ہیں۔

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا، جب میں نے تم سے کہا تھا کہ دو قوموں کا نظریہ حیاتِ معنوی کے لیے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے، اس کو چھوڑ دو۔ یہ ستون جن پر تم نے بھروسہ کیا ہے۔ نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں۔ لیکن تم نے سُنی اَن سُنی برابر کر دی، اور یہ نہ سوچا کہ وقت اور اس کی تیز رفتار تمھارے لیے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کر سکتے۔ وقت کی رفتار تھمی نہیں۔ تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمھیں بھروسہ تھا، وہ تمھیں لاوارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے۔ وہ تقدیر جو تمھارے دماغی لغت کی منشا سے مختلف مفہوم رکھتی ہے یعنی ان کے نزدیک فقدانِ ہمت کا نام تقدیر ہے۔

انگریز کی بساط تمھاری خواہش کے برخلاف الٹ دی گئی، اور راہ نمائی کے وہ بُت جو تم نے وضع کیے تھے، وہ بھی دغا دے گئے، حالانکہ تم نے یہی سمجھا تھا کہ یہ بساط ہمیشہ کے لیے بچھائی گئی ہے، اور ان ہی بُتوں کی پوجا میں تمھاری زندگی ہے۔ میں تمھارے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتا۔ اور تمھارے اضطراب میں مزید اضافہ میری خواہش نہیں۔ لیکن اگر کچھ دور ماضی کی طرف پلٹ جاؤ تو تمھارے لیے بہت سی گرہیں کھل سکتی ہیں۔

ایک وقت تھا میں نے ہندستان کی آزادی کے حصول کا احساس دلاتے ہوئے تمھیں پکارا تھا اور کہا تھا۔

عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو۔ جس طرح آج سے کچھ عرصے پہلے تمھارا جوش و خروش بیجا تھا اسی طرح آج یہ تمھارا خوف و ہراس بھی بیجا ہے۔ مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ سچّے مسلمانوں کو نہ تو کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔ چند انسانی چہروں کے غائب از نظر ہو جانے سے ڈرو نہیں انھوں نے تمھیں جانے کے لیے اکٹھا کیا تھا۔ آج انھوں نے تمھارے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہے تو یہ عیب کی بات نہیں۔ یہ دیکھو تمھارے دل تو ان کے ساتھ ہی رخصت نہیں ہو گئے۔ اگر دل ابھی تک تمھارے پاس ہیں تو اسے خدا کی جلوہ گاہ بناؤ جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک اُمّی کی معرفت فرمایا تھا: "جو خدا پر ایمان لائے اور اس پر جم گئے تو پھر ان کے لیے نہ تو کسی طرح کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم۔"[2] ہوائیں آتی ہیں اور گذر جاتی ہیں۔ یہ صرصر سہی لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں۔ ابھی دیکھتے آنکھوں ابتلا کا موسم گزرنے والا ہے۔ یوں بدل جاؤ جیسے تم پہلے کبھی اس حالت ہی میں نہ تھے۔

میں کلام میں تکرار کا عادی نہیں ہوں لیکن مجھے تمھاری تغافل کیشی کے پیشِ نظر بار بار یہ کہنا پڑتا ہے کہ تیسری طاقت اپنی گھمنڈ کا پشتارہ اٹھا کر رخصت ہو چکی ہے۔ جو ہونا تھا، وہ ہو کر رہا۔ سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچہ توڑ چکی ہے اور اب نیا سانچہ ڈھل رہا ہے۔ اگر اب بھی تمھارے دلوں کا معاملہ بدلا نہیں اور دماغوں کی چبھن ختم نہیں ہوئی، تو پھر حالت دوسری ہے لیکن اگر واقعی تمھارے اندر سچّی تبدیلی کی خواہش پیدا ہو گئی ہے تو پھر اس طرح بدلو جس طرح تاریخ نے اپنے تئیں بدل لیا ہے۔ آج بھی کہ ہم ایک دَورِ انقلاب کو پورا کر چکے ہیں، ہمارے ملک کی تاریخ میں کچھ صفحے خالی ہیں اور ہم ان صفحوں میں زیبِ عنوان بن سکتے ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ ہم اس کے لیے تیار بھی ہوں۔

عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو۔ یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیّر کے لیے تیار نہ تھے بلکہ اب تیار ہو جاؤ۔ ستارے ٹوٹ گئے لیکن سورج تو چمک رہا ہے۔ اس سے کرنیں مانگ لو اور

اس کا لازمی نتیجہ یہی آثار و مظاہر تھے، جو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور بدقسمتی سے بعض مقامات میں آج بھی دیکھ رہے ہیں۔

پچھلے سات برس کے روداد دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں اور نہ اس سے کوئی اچھا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ البتہ ہندستان کے مسلمانوں پر جو ریلا آیا ہے وہ یقیناً مسلم لیگ کی غلط قیادت کی فاش غلطیوں ہی کا نتیجہ ہے لیکن میرے لیے اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ میں پچھلے دنوں ہی سے ان نتائج پر نظر رکھتا تھا۔

اب ہندستان کی سیاست کا رخ بدل چکا ہے مسلم لیگ کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اب یہ ہمارے اپنے دماغوں پر منحصر ہے کہ ہم کسی اچھے اندازِ فکر میں بھی سوچ سکتے ہیں یا نہیں۔ اسی لیے میں نے نومبر کے دوسرے ہفتہ میں ہندستان کے مسلمان رہنماؤں کو دہلی بلانے کا قصد کیا ہے۔ دعوت نامے بھیج دیے گئے ہیں۔ ہراس کا موسم عارضی ہے۔ میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم کو ہمارے سوا کوئی زیر نہیں کر سکتا۔ میں نے ہمیشہ کہا اور آج پھر کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو، شک سے ہاتھ اٹھا لو، اور بدعملی کو ترک کر دو۔ یہ تین دھار کا انوکھا خنجر لوہے کی اس دو دھاری تلوار سے زیادہ کاری ہے، جس کے گھاؤ کی کہانیاں میں نے تمھارے نوجوانوں کی زبانی سنی ہے۔

یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے، اس پر غور کرو، اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ، اور اپنے دماغوں کو سوچنے کی عادت ڈالو اور پھر دیکھو کہ تمھارے یہ فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں۔ آخر کہاں جا رہے ہو اور کیوں جا رہے ہو؟

یہ دیکھو، مسجد کے بلند مینار تم سے اچک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ جمنا کے کنارے تمھارے قافلوں نے وضو کیا تھا۔ اور آج تم ہو کہ تمھیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ دہلی تمھارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔

ہوں اور بار بار کہتا ہوں: اپنے حواس پر قابو رکھو، اپنے گرد و پیش اپنی زندگی خود فراہم کرو۔ یہ منڈی کی چیز نہیں کہ تمھیں خرید کر لا دوں۔ یہ تو دل کی دکان ہی میں سے اعمالِ صالحہ کی نقدی سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

والسّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ان اندھیری راہوں میں بچھا دو، جہاں اُجالے کی سخت ضرورت ہے۔

میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکٹ حاصل کرو اور کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمھارا شعار رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جو اجلے نقش و نگار تمھیں اس ہندستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آرہے ہیں، وہ تمھارا ہی قافلہ تھا۔ انھیں بھلاؤ نہیں۔ انھیں چھوڑو نہیں۔ ان کے وارث بن کر رہو، اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لیے تیار نہیں تو پھر تمھیں کوئی طاقت بھگا نہیں سکتی۔ آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے، ہم اس کے لیے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔

آج زلزلوں سے ڈرتے ہو، کبھی تم خود اک زلزلہ تھے۔ آج اندھیرے سے کانپتے ہو، کیا یاد نہیں کہ تمھارا وجود ایک اجالا تھا! یہ بادلوں نے میلا پانی برسایا ہے تم نے بھیگ جانے کے خدشے سے اپنے پائینچے چڑھا لیے ہیں۔ وہ تمھارے ہی اسلاف تھے، جو سمندروں میں اتر گئے، پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا۔ بجلیاں آئیں، تو ان پر مسکرا دیے۔ بادل گرجے، تو قہقہوں سے جواب دیا۔ صرصر اٹھی، تو اس کا رخ پھیر دیا۔ آندھیاں آئیں، تو ان سے کہا کہ تمھارا راستہ یہ نہیں ہے۔ یہ ایمان کی جان کنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے، آج خود اپنے گریبانوں سے کھیلنے لگے۔ اور خدا سے اس درجہ غافل ہوگئے کہ جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہیں تھا۔

عزیزو! میرے پاس تمھارے لیے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے۔ وہی پرانا نسخہ ہے، جو برسوں پہلے کا ہے۔ وہ نسخہ جس کو کائناتِ انسانی کا سب سے بڑا محسن لایا تھا۔ وہ نسخہ ہے قرآن کا یہ اعلان کہ لَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ[۱۲]۔

آج کی صحبت ختم ہوگئی۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ اختصار کے ساتھ کہہ چکا ہوں۔ پھر کہتا

یہ سب کچھ ہے لیکن میں جب بھی سوچتا ہوں ایک چیز بار بار میرے سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ اس طرح جو کچھ بھی کیا جا رہا ہے اس میں مجھے ایک بڑا خانہ خالی نظر آتا ہے اور اگر اس کو پُر نہ کیا گیا، تو ایک بڑی کمی رہ جائے گی۔

آپ کو معلوم ہے کہ مہاتما جی کی زندگی مختلف کاموں میں گذری ہے لیکن ان جیسی شخصیتیں دنیا میں کبھی کبھی اُبھرا کرتی ہیں، جو دنیا کی تمام خود ساختہ حد بندیوں سے بالاتر ہوا کرتی ہیں۔

تاریخِ انسانی کے ہر دَور میں آپ دیکھیں گے کہ انسان نے دنیا میں بہت سی حد بندیاں قائم کی ہیں۔ جیسے جغرافیائی حد بندی؛ کہا جاتا ہے: یہ یورپ ہے، یہ ایشیا، یہ عرب ہے، یہ ہندستان وغیرہ، مذہبی حد بندی؛ ہم کہتے ہیں: یہ مسلمان ہے، یہ عیسائی، یہ ہندو، یہ سکھ وغیرہ۔

قومی حد بندی؛ کہا جاتا ہے: یہ انگریز ہے، یہ اٹالین، یہ ہندی وغیرہ

لسانی حد بندی؛ کہا جائے گا: یہ فلاں زبان کا بولنے والا ہے اور یہ فلاں زبان کا وغیرہ، ایسے ہی رنگ و نسل کی حد بندی وغیرہ۔

یہ تمام حد بندیاں ہماری زندگی کی قدرتی ضروریات ہیں۔ لیکن جب تک یہ تعمیری دائرہ میں رہتی ہیں، ہمارے لیے ایک بڑا سہارا بنتی ہیں اور جب یہ تخریبی رنگ اختیار کر لیتی ہیں تو گروہِ انسانی کو تباہ کر دینے والی اور مٹا دینے والی بن جایا کرتی ہیں۔

دنیا کی پوری تاریخ میں جب بھی ان حد بندیوں کا غلط استعمال ہونے لگتا ہے، تو وہی مقاصد جو ان کے سہارے چمکتے تھے، خاک میں مل جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر مذہب کی حد بندی کو لیجیے۔ سب جانتے ہیں کہ مذہب دنیا کی اصلاح کے لیے آیا ہے۔ اور صلح و آشتی، امن و انصاف وغیرہ ایسی چیزیں ہیں، جن کو ہر مذہب بنیادی طور پر صحیح مانتا ہے لیکن یہی مذہبی حد بندی جب تخریبی جامہ پہن لیتی ہے تو ہزاروں

۱۵

# مہاتما گاندھی کی یادگار

نئی دلی ، فروری ۱۹۴۸ء

گاندھی جی کے حادثۂ قتل کے چند ہی روز بعد فروری ۱۹۴۸ء میں کانسٹی ٹیوشن کلب (نئی دلی) میں ایک اجتماع ہوا تھا، جہاں یہ مسئلہ زیرِ بحث تھا کہ گاندھی جی کی یادگار کس شکل میں قائم کی جائے۔ اس جلسے کی صدارت مولانا آزاد نے فرمائی تھی۔ یہ ان کی صدارتی تقریر ہے

آج مہاتما گاندھی کے بعد نہ صرف ہندستان میں، بلکہ تمام دنیا میں ان کی یادگار مختلف شکلوں میں قائم ہے۔ حال ہی میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے بھی چھ اصحاب پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی ہے، جو مہاتما گاندھی کی ایک ایسی یادگار قائم کرنے کے مسئلے پر غور و فکر کرے گی، جو ان کے پاکیزہ مقصدِ حیات اور اس کی روح کو دنیا کے سامنے نمایاں کر دے۔

اس کے علاوہ دوسرے طریقوں سے بھی ان کی خدمات کے تذکرے اور قلمی یادگاریں، ان کے کارنامے محفوظ کیے جا رہے ہیں، تاکہ آنے والی نسلیں جب ان کی زندگی کا مطالعہ کریں، تو ایک روشن حقیقت ان کے سامنے آ جائے۔

کی نظر ہر طرف اور ہر گوشے پر یکساں پڑتی ہے۔ دنیا کا تمام اچھا بُرا ان کے سامنے ہوتا ہے۔ وہ سب کو ایک ہی نور سے دیکھتے اور پہچانتے ہیں۔ انھیں جہاں کہیں حُسن نظر آتا ہے، وہ دوڑتے ہیں کہ یہ تو ہمارے لیے ہے۔ انھیں جس طرف خوبی نظر آتی ہے، وہ اس کو اپناتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ ہمارا حق ہے۔ لیکن آپ یاد رکھیے، تاریخ میں ایسی ہستیاں بہت ہی کم ہوا کرتی ہیں۔

مہاتما جی کی ہستی تاریخِ عالم کی ان ہی ہستیوں میں سے ایک تھی۔ وہ دنیا کی ان تمام حد بندیوں سے بلند تر تھے۔ اور ان کی نگاہ میں ہر قوم اور ہر وطن، ہر نسل اور ہر گروہ ایک ہی حیثیت رکھتا تھا۔ اور وہ ہر ایک کی خوبیوں کو اپناتے اور پسند کرتے تھے۔

جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے، مجھے اُن کا تعارف سب سے پہلے ۱۹۰۸ء میں ہوا۔ جب کہ والد مرحوم نے انتقال فرمایا۔ بمبئی، ٹرانسوال وغیرہ میں والد مرحوم نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ اور ان اطراف میں ان کے بہت سے مریدین و معتقدین تھے۔ ان دنوں گاندھی جی ان اطراف کے حالات سے دلچسپی لے رہے تھے اور ٹرانسوال کانگریس کے پروگراموں میں سرگرم عمل تھے۔ اس وقت مجھے ایک ٹیلی گرام ملا۔ جس کے نیچے گاندھی جی کے دستخط تھے۔ انھوں نے اس ٹیلی گرام میں والدِ مرحوم کی تعزیت کی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۱۸ء تک مجھے ان سے خط و کتابت یا زیارت و ملاقات کا موقع نہ ملا ۔

۱۹۱۸ء میں جب میں رانچی جیل میں نظر بند تھا، اُن دنوں گاندھی جی بہار کے دورے کے لیے آئے، اور انھوں نے ایک شخص کے ذریعے مجھے جیل میں پیغام بھیجا کہ میں بہار آیا ہوا ہوں، اور تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ مگر گورنر بہار نے مجھے اس کی اجازت نہیں دی۔ اس کے بعد جب میں رانچی جیل سے رہا ہوا۔ اور ایک جلسہ میں شرکت کے لیے ۱۹۲۰ء کی ۲۰ جنوری کو دہلی آیا، تو حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کے مکان پر سب سے پہلے مجھے گاندھی جی سے نیاز حاصل ہوا۔ اس دن سے آج تک جب کہ ۱۹۴۸ء ہے، ۲۸ برس گذر چکے ہیں۔ ۲۸ برس کے

خوں ریزیوں کا باعث بن جاتی ہے۔ دنیا کی تاریخ میں ہزاروں کشت و خون ہیں جو اسی مذہب کے نام پر ہوئے ہیں۔

اپنے ہی ماحول کو دیکھیے۔ آج ہمارے چاروں طرف جو کچھ ہو چکا ہے، وہ خدا کا نام لے کر ہی کیا گیا ہے۔ ایسے ہی جغرافیائی حدبندی کو لیجیے۔ قرآن کی بولی میں یہ بندشیں اس لیے تھیں کہ لِتَعَارَفُوْا تم میں باہم پہچان پیدا ہو۔ لیکن یہی حدبندی جب تباہی کی شکل میں آتی ہے تو دنیا میں بڑی بربادیوں کا باعث بن جاتی ہے۔

یہی حال قومی حدبندی کا ہے اس کا مقصد بھی وہی لِتَعَارَفُوْا ہے۔ یعنی آپس کی پہچان کا ذریعہ! لیکن یہی قومیت کی حدبندی جو ایک ذریعہ پہچان کا تھی، جب اپنی حدوں سے گذر جاتی ہے، تو دنیا میں بڑی خوں ریزیاں اسی قومی حرص و طمع اور غرور و گھمنڈ کے نتیجے میں ہوئی ہیں۔

غرض کہ دنیا میں بہت سی حدبندیاں ہیں جو ہماری زندگی پر چھا گئی ہیں، اور ہم ان میں ایسے بندھ گئے ہیں کہ اگرچہ ہم میں بڑی سے بڑی روح برائی کی بڑی سے بڑی جگہ پیدا کر سکتی ہے، لیکن ان حدود کے اندر ہی اندر رہ کر، ان سے آگے قدم رکھنے کی ان میں جرأت ہی پیدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن جس طرح نیچر ایک خاص ڈھنگ پر چلتا ہے، لیکن کبھی کبھی اپنا رنگ چھوڑ دیتا ہے۔ ایسے ہی ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ کے افق پر کبھی کبھی ایسی شخصیتیں ابھرتی ہیں کہ دنیا کی کوئی حدبندی بھی انھیں بڑائی تک پہنچنے سے نہیں روک سکتی۔ مذہب کی حدبندی ان کی آنکھوں کو بند نہیں کر سکتی۔ قومیت کی حدبندی ان کے پاؤں کی زنجیر نہیں بن سکتی۔ وطنیت کی حدبندی ان کے ہاتھوں کو پکڑ نہیں سکتی۔ وہ ان تمام حدود سے بہت اونچے اور بلند ہوتے ہیں۔

جب یہ شخصیتیں ان بندشوں کی حدود سے بالاتر ہو جاتی ہیں، تب آپ دیکھیں گے کہ ان کی آنکھوں میں سچائی کا نور پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کی نگاہ میں تعصب کا ایک شمہ نہیں رہتا۔ ان

ذہن اس کے خلاف ہی جانا چاہتا ہے، یہاں تک کہ وہ میرے ذہن کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لے۔ چنانچہ جب میں پہلی دفعہ مہاتما جی سے ملا، اس وقت میں ان کا معتقد نہیں تھا۔ میری آنکھوں پر اعتقاد کی پٹی نہ تھی، جو انسان کی آنکھوں کو بند کر دیا کرتی ہے۔ لیکن اس کے بعد ان کی ہر ہر چیز نے ان کی عظمت کو میرے دل میں راسخ کر دیا۔ اور جو دن گزرا میرا اعتقاد ان کے بارے میں بڑھتا ہی چلا گیا۔ ہم دو آدمیوں کو ان سے انتہائی قرب تھا اور ہمیں بہت طویل موقع ملا۔ وہ ایک کھلی ہوئی کتاب تھے، جس کا ہر ورق کھلا ہوا، ہر سطر روشن، اور ہر لفظ دھلا ہوا اور ہر حرف چمکتا ہوا تھا۔

آج تمام دنیا میں شاید ان ہی کی زندگی ایسی تھی، جس کا ایک حرف بھی چھپا ہوا نہ تھا۔ یہ انسانیت کی عظمت کے لیے سب سے بڑی کسوٹی ہے اور اس معیار پر اترنے والے تمام تاریخِ انسانی میں صرف چند انسان ہوئے ہیں۔ جنھیں آپ اپنی انگلیوں پر گن سکتے ہیں۔

جن کو تمام دنیا کی حد بندیوں نے الجھانے کی کوشش کی، لیکن وہ الجھ نہ سکے۔ تمام بندشوں نے ان کا دامن پکڑنا چاہا، مگر وہ گرفت میں نہ آسکے۔ میرے نزدیک گاندھی جی کی سب سے بڑی عظمت یہی ہے۔

یہ نہ تھا کہ مہاتما جی ہندو نہ تھے۔ وہ بیشک ہندو تھے۔ لیکن انھوں نے ہندو مذہب د دماغ کی ایک نئی تعبیر کی تھی۔ اور ایک نیا زاویہ بنایا تھا، جو تمام حد بندیوں پر چھا گیا تھا۔ اور وہ ایک ایسی جگہ بن گئی کہ نہ وہاں جغرافیہ اور قومیت کی لکیریں چل سکتی ہیں، نہ اور دوسری حد بندیوں کی دیواریں قائم رہ سکتی ہیں۔ یہ وہ بلندی ہے کہ اگر ہمارا دماغ وہاں تک پہنچ سکے، تو اس سے بڑی کوئی خوبی نہیں ہے۔

ہندو مذہب کا پرانا دماغ اور نقشہ جو ہمارے سامنے آتا ہے، اس میں بہت زیادہ وسعتیں تھیں اور جہاں تک میرا مطالعہ ہے، دنیا کے تمام مذاہب میں نظریۂ توحید کو

یہ دن ہم پر ایسے گذرے ہیں کہ گویا ہم ایک ہی چھت کے نیچے رہے۔
اس عرصے میں بسا اوقات ان سے اختلافات بھی ہوئے۔ چنانچہ اس لڑائی کے زمانے میں میرا اور ان کا جو اختلاف ہوا تھا اُس سے آپ بھی واقف ہونگے۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی میں میری یہ قطعی رائے تھی جس پر ممبران کی اکثریت کو اتفاق تھا کہ اگر برطانیہ یہ مان لے کہ جنگ کے بعد ہندستان کو آزادی دے دی جائیگی، تو ہم لڑائی میں شریک ہوسکتے ہیں۔ ان کو اس سے سخت اختلاف تھا، وہ بالکل دوسری جانب جارہے تھے۔ وہ کہتے تھے، ہم ایسی آزادی لینا ہی نہیں چاہتے، جو لڑائی کے سایہ میں ہم کو ملے۔ اس لیے وہ کسی طرح بھی لڑائی میں شرکت کے لیے تیار نہ تھے۔
آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کی تجاویز کا ڈرافٹ گاندھی جی ہی بنایا کرتے تھے۔ چنانچہ اس مرتبہ بھی اپنے اس ریزولیوشن کا ڈرافٹ بنوانے کے لیے میں اور پنڈت نہرو، گاندھی جی کے پاس گئے۔ اور انھوں نے اپنے پورے اختلاف کے باوجود اس تجویز کا ڈرافٹ بنادیا۔
غرض اس طویل مدّت میں بہت سے موقعے آئے کہ ہم میں اور ان میں اختلاف ہوا اور کشمکش تک نوبت پہنچی، انھوں نے اور ہم نے دونوں ہی نے اپنی اپنی جگہ اس کو محسوس بھی کیا۔ لیکن اس پوری زندگی میں کوئی ایسا وقت نہیں آیا کہ ہمارے دلوں کا رُخ پھر گیا ہو۔ ایسے ایسے اختلافوں کے باوجود ان کی عظمت کی جو رسّی ہماری گردنوں میں پڑی ہوئی تھی، ہم کبھی اس سے باہر نہ ہوسکے۔
اس موقعے پر آپ سے یہ کہہ دوں کہ میری طبیعت میں ایک طرح کا نقص اور خامی ہے۔ وہ یہ کہ جب تک کسی کی کوئی خصوصیّت میرے سامنے نہ آجائے، جو میرے دماغ پر چھاجائے اور میری گردن کو دبالے، اس وقت تک وہ مجھے اپنے سامنے جھکا نہیں سکتا۔ "میری گردن کی رگیں سخت ہیں۔" میرے سامنے جب کوئی دماغ آتا ہے، تو پہلے میرا

# حواشی

از

مرتّب

جس مذہب نے سب سے زیادہ قریب سے دیکھا ہے وہ ہندو مذہب ہے۔ میرے پاس اس کے بہت سے تاریخی شواہد و نظائر موجود ہیں۔ لیکن آج ہندو دھرم کی وہ شکل باقی نہیں ہے۔ اور اس کے بہت سے خانے خالی ہو چکے ہیں۔ ہندو مذہب نے ابتدائی دور میں یونانیوں کو وہ درجہ دیا تھا، جو ایک برہمن کا ہوتا ہے۔ صرف اس لیے کہ یونان علم دوست ملک تھا۔ لیکن دوسری جگہ یہ ہے کہ ہندو دماغ گرنے لگا۔ چھوت چھات اور تنگ دماغ پیدا ہو گیا۔ تب ہی سے ہندو دھرم اپنی بلند سطح سے گر گیا۔

گاندھی جی ہندو تھے اور ہندو ہی رہے لیکن انھوں نے ہندو دھرم کی اتنی اونچی جگہ بنائی تھی کہ جب وہ اس بلندی پر سے دیکھتے تھے تو دنیا کے تمام جھگڑے ان کو مٹے ہوئے نظر آتے تھے ان کے سامنے ایک کھلی ہوئی سچائی تھی جو کسی ایک کا ورثہ نہیں ہے بلکہ سورج اور اس کی شعاعوں کی طرح سب کے لیے ہے۔

پس ہمیں گاندھی جی کی عظمت ان ادنیٰ درجے کی چیزوں میں نہیں ڈھونڈھنی چاہیئے بلکہ پردہ اٹھا کر دیکھنا چاہیے تب حقیقت کا چہرہ صاف نظر آئے گا۔ وہ اتنی بلندی پر تھے کہ دنیا کی کوئی حد بندی ان کا راستہ روک نہیں سکی۔

آج ہم ان کی کوئی بھی یادگار بنائیں وہ نامکمل ہوگی۔ جب تک کہ وہ ان کی اس سر بلندی کو ظاہر نہ کرے۔ اس لیے مجھے آپ سے یہ کہنا ہے کہ گاندھی جی کی یادگار اس شکل میں ہونی چاہیے جو مہاتما جی کی اس سر بلندی کو ظاہر کرے۔ آنے والی نسلوں کو اپنی خاموش زبان سے بتادے کہ مہاتما جی کا مشن اور مقصدِ حیات یہ تھا، جو دنیا بھر کے زائرین کو اپنی زبانِ حال سے گاندھی جی کی عظمت و بلندی کی تاریخ بتا سکے۔

آپ کتنی ہی یادگاریں بنالیں، لیکن وہ بیکار ہیں جب تک کہ ان کی انگلی اس عالمگیر سچائی کی طرف نہ اٹھے، جو گاندھی جی کے پیشِ نظر تھی۔

# حواشی

## ۱ ۔ اتحادِ اسلامی، کلکتہ

۱۳ : ۱ سورۂ آلِ عمران ۳ : ۲۶ (یا اللہ، اے سلطنت کے مالک! تو سلطنت دیتا ہے، جسے چاہتا ہے؛ اور سلطنت چھین لیتا ہے، جس سے چاہتا ہے۔ اور عزّت بخشتا ہے، جسے چاہتا ہے؛ اور ذلیل بنا دیتا ہے، جسے چاہتا ہے۔ تیرے ہی ہاتھ میں سب خوبی ہے؛ بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے)

۱۳ : ۲ قرآن میں ہے: فَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ (النحل ۱۶ : ۹۸) (جب تو قرآن پڑھے، تو شیطانِ مردود سے (اپنے) خدا کی پناہ مانگ) اسی لیے تلاوت کے وقت کہا جاتا ہے: اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ (میں مردود شیطان سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں)

۱۳ : ۳ الفاطر ۳۵ : ۱۵ (اے لوگو! تم اللہ کے محتاج ہو اور وہ سب تعریفوں کے لائق بے نیاز ہے۔ اگر وہ چاہئے تو تمھیں مٹا دے اور (تمھاری جگہ) ایک نئی خلقت لے آئے؛ اور یہ بات اللہ کے لیے کچھ مشکل نہیں)

۱۳ : ۴ نظیری نیشاپوری کا شعر ہے (دیوانِ نظیری نیشاپوری : ۳۰۸) مطبوعہ دیوان میں مصرع ثانی یوں ہے: حرفے ز حالِ خویش لبسیما نوشتہ ایم

۱۴ : ۵ مقابلہ کیجیے: عہدنامۂ جدید (انجیل) متی، ۱۱ : ۵ نیز لوقا، ۷ : ۲۲

۱۴ : ۶ سورۂ نوح ۷۱ : ۱۶

۲۰ : ۱۷ پس جو جواب ان کا، وہی جواب ہمارا

۲۱ : ۱۹ اسکندر اعظم مقدونی۔ ولادت ۳۵۵ ق م۔ یونان سے ہندستان تک کا تمام علاقہ اس نے فتح کیا۔ وہ پنجاب میں دریاے بیاس تک پہنچ گیا تھا۔ یہاں سے واپسی پر بابل (عراق) میں کثرتِ شراب نوشی (یا شاید زہر سے) ۳۲۳ ق م میں وفات ہوئی۔ صرف ۳۲ سال کی عمر پائی۔ بےشک، دنیا کے عظیم ترین فاتحوں میں سے تھا۔

۲۱ : ۲۰ ہنی بال۔ قرطاجنہ (شمالی افریقا) کا مشہور جرنیل۔ رومنوں کا جانی دشمن تھا۔ اس نے ہاتھیوں کے ساتھ کوہ الپس کو پار کر کے اٹلی پر حملہ کر دیا اور رومن فوج کو ایک خونریز جنگ میں شکست فاش دی۔ لیکن اسے واپس قرطاجنہ جانا پڑا۔ اور اب رومنوں نے حملہ کیا، جس میں اسے شکست ہوئی اور وہ بھاگ کر شرقِ اوسط چلا آیا۔ اس نے زہر سے خودکشی کی (۱۸۲ ق م) غالباً اس وقت ۷۰ سال کی عمر تھی۔

۲۱ : ۲۱ مرض کی پیش بندی، اس کے لاحق ہو جانے کے بعد علاج سے بہتر ہے۔

۲۲ : ۲۲ ڈیمبری؛ اس کا اصلی نام ہرمن بمبرجر تھا، لیکن مشہور آرمین ڈیمبری کے نام سے ہوا۔ دریاے ڈینیوب (ہنگری) کے وسط میں ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے 'شوت'؛ یہ وہیں ۱۹ مارچ ۱۸۳۲ء کو پیدا ہوا۔ اس کی سیاح، مستشرق اور مؤرخ کی حیثیت سے بہت شہرت ہے؛ ۱۹۰۵ء تک بوڈاپسٹ یونیورسٹی میں پروفیسر تھا۔ مدتوں قسطنطنیہ میں مقیم رہا۔ اس نے ایران، وسط ایشیا، افغانستان کی سیاحت کی، اور ان ممالک سے متعلق اس کے سفرنامے چھپ چکے ہیں۔ اس کی جرمن / ترکی لغات اور ترکی / تاتاری لغات آج بھی مستند مانی جاتی ہیں، حالانکہ انھیں چھپے نوّے برس سے اوپر ہو چکے ہیں۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۱۳ء کو بوڈاپسٹ (ہنگری) میں انتقال ہوا۔

۲۳ : ۲۳ وجودک ذنب لایقاس بہ ذنب قائل کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔

۲۴ : ۲۴ انجیل لوقا، ۱۹ : ۲۷۔ حضرت عیسیٰ کے ٹھیک الفاظ یہ ہیں:
مگر میرے ان دشمنوں کو، جنھوں نے نہیں چاہا تھا کہ میں ان پر

۱۵ : ۷ یہاں اشارہ ہے تورات کی کتاب استثنا کی مندرجۂ ذیل آیات کی طرف :

اور مردِ خدا موسیٰ نے جو دعائے خیر دے کر اپنی وفات سے پہلے بنی اسرائیل کو برکت دی، وہ یہ ہے ۔ اور اس نے کہا : خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر آشکار ہوا۔ وہ کوہِ فاران سے جلوہ گر ہوا اور لاکھوں قدسیوں میں سے آیا۔ اس کے دہنے ہاتھ پر ان کے لیے آتشی شریعت تھی (۳۳ : ۱-۲)

۱۶ : ۸ الحجرات ۴۹ : ۱۳

۱۶ : ۹ الروم ۳۰ : ۲۲ (اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے آسمان اور زمین اور تمھاری مختلف زبانیں اور رنگ پیدا کیے)

۱۶ : ۱۰ سورۂ المؤمنون ۲۳ : ۵۲

۱۶ : ۱۱ بو قبیس۔ مکّے کے نواح میں ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے۔ اس کا یہ نام یوں پڑا کہ قبیلۂ جُرہم کا ایک شخص قبیس بن شالخ اس پر گیا تھا اور وہ وہیں ہلاک ہو گیا۔

۱۷ : ۱۲ سورۂ آلِ عمران ۳ : ۱۰۳

۱۹ : ۱۳ مسلم (کتاب البرّ : ۶۶) کے علاوہ یہ حدیث بخاری میں بھی ہے (کتاب الادب : ۲۷، ۲۸) بلکہ مسند احمد بن حنبل میں مجھے ملی ہی نہیں۔ صحیحین میں کچھ خفیف سا لفظی اختلاف ہے۔

۱۹ : ۱۴ بخاری (کتاب الصّلوٰۃ : ۸۸؛ کتاب الادب : ۳۶؛ کتاب المظالم : ۵)؛ مسلم (کتاب البرّ : ۶۵) صحیحین کے علاوہ یہ حدیث نسائی (کتاب الزکاۃ : ۶۷) ترمذی (کتاب البرّ : ۱۸) اور مسند احمد بن حنبل کے متعدد مقامات پر بھی ہے۔

۱۹ : ۱۵ الفتح ۴۸ : ۲۹

۱۹ : ۱۶ (اے مسلمانو! عبرت پکڑو اور ان لوگوں کے سے نہ بنو، جنھوں نے کہا : ہم نے سُن لیا، حال آنکہ وہ نہیں سنتے)۔ اس عبارت کا پہلا ٹکڑا (فَاعْتَبِرُوا يَا أَيُّهَا الْمُسْلِمُونَ) خود مولانا آزاد کا ہے، دوسرا ٹکڑا (وَلَا تَكُونُوا... يَسْمَعُونَ) قرآن سے ہے (الانفال ۸ : ۱۲)

۲۰ : ۱۷ الحاقہ ۶۹ : ۳۱ (اسے پکڑو، پھر اس کے طوق پہنا دو، پھر اسے آگ کی بھٹی میں جھونک دو)

اضافہ کرتا ہے؛ وہ عقل کے اندھے ہیں)

۳۳ : ۳۹ سورہ محمّد ۴۷ : ۳۱ (اور ہم تمھارا امتحان لینگے، حتیٰ کہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ تم میں سے کون مجاہد ہے اور کون صبر کرنے والا)

۳۳ : ۴۰ سورۂ آلِ عمران ۳ : ۱۰۶-۱۰۷

۳۴ : ۴۱ سورۃ فاطر ۳۵ : ۱۵-۱۷

۳۴ : ۴۲ المائدہ ۵ : ۵۴

۳۵ : ۴۳

: ۴۴ الصافات ۳۷ : ۱۰۳-۱۰۵۔ آخری آیت کے معنی متن میں نہیں آئے؛ یہ ہیں: ہم نیکی کرنے والوں کو اس طرح انعام دیتے ہیں۔

## ۲۔ افتتاح مدرسۂ اسلامیہ، کلکتہ

۳۷ : ۱ تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات کا ایک شاخسانہ یہ بھی تھا کہ سرکاری مدارس کا بائیکاٹ کیا جائے۔ جو طلبہ وہاں سے نکلے، ان کے پڑھنے کا انتظام نئے مدارس قائم کرکے کیا گیا تھا۔ اسی طرح کا ایک مدرسہ جامع مسجد (مسجدِ ناخدا)، کلکتہ میں مولانا آزاد نے اپنی نگرانی میں جاری کیا تھا۔ اس میں بیشتر طلبہ مدرسۂ عالیہ، کلکتہ کے تھے، جو مولانا آزاد کی ترغیب پر وہاں سے نکل آئے تھے۔

اس مدرسے کا افتتاح مہاتما گاندھی نے ۱۳ دسمبر ۱۹۲۰ء کو کیا تھا۔ اسی موقع پر مولانا آزاد نے یہ تقریر مہاتما جی کو مخاطب کرکے کی تھی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے، ذکرِ آزاد، عبدالرزاق ملیح آبادی : ۵۵-۵۶)

## ۳۔ خطبۂ صدارت مجلسِ خلافت، آگرہ

۴۸ : ۱ سورۃ الممتحنہ کے اصلی الفاظ یہ ہیں:

لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ

بادشاہی کروں، یہاں لاکر میرے سامنے قتل کرو۔

۲۴ : ۲۵ سورۃ التوبہ ۹ : ۳۰ ( یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں، ان کی ریس میں جنھوں نے پہلے کفر کا ارتکاب کیا۔ خدا انھیں ہلاک کرے؛ یہ کہاں پھرے جارہے ہیں )

۲۵ : ۲۶ سورۃ الاعراف ۷ : ۱۷۶

۲۶ : ۲۷ سورۃ آل عمران ۳ : ۱۰۳

۲۶ : ۲۸ { کمثل هذا ابن رب القلب من کمد ان کان فی قلب اسلام وایمان
نونیہ ابی البقاء کا شعر ہے مصنف ابو البقا صالح بن شریف الرندی ہیں (نفح الطیب ۶ : ۲۲۳)

۲۷ : ۲۹ سورۃ المائدہ ۵ : ۳ ( آج میں نے تمھارے لیے تمھارے دین کی تکمیل کردی؛ اور تم پر اپنی نعمت پوری کردی؛ اور تمھارے لیے اسلام پسند کیا )

۲۸ : ۳۰ سورۃ البقرہ ۲ : ۱۶ ( یہی وہ لوگ ہیں، جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی۔ ان کی یہ تجارت سودمند ثابت نہ ہوئی، اور نہ انھیں ہدایت حاصل ہوئی

۲۸ : ۳۱ پورا شعر ہے: السیف اصدق انباء من الکتب فی حدہ الحد بین الجد واللعب
اور یہ ابو تمام کے اس قصیدے میں ہے، جو اس نے معتصم باللہ محمد بن ہارون الرشید کی مدح میں کہا تھا (دیوان : ۴۵؛ محاضرۃ الابرار ومسامرۃ الاخیار، ۲ : ۱۰۸)

۲۹ : ۳۲ الحدید ۵۷ : ۲۵

۳۱ : ۳۳ عبدۃ بن الطبیب کا شعر ہے، جو اس نے قیس بن عاصم المنقری کی وفات (تقریباً ۲۰ھ) پر لکھا تھا۔ (امالی المرتضیٰ، ۱ : ۱۱۴؛ المستطرف : ۷۶؛ زہر الآداب ۴ : ۱۰۴؛ البیان والتبیین، ۲ : ۳۵۳؛ العقد الفرید، ۳ : ۳۸۶ وغیرہ)

۳۱ : ۳۴ اور وہ (شیطان) ان کے دلوں کو جس طرح چاہتا ہے، پھیر دیتا ہے۔

۳۱ : ۳۵ سورہ ابراہیم ۱۴ : ۳ ( جو لوگ دنیا کی زندگی کو آخرت کے مقابلے میں ترجیح دیتے ہیں اور (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور اس میں کجی کے خواہشمند ہیں، وہ بہت دور تک گمراہ ہوگئے ہیں۔)

۳۲ : ۳۶ سورۃ الاحزاب، ۳۳ : ۵۷

۳۳ : ۳۷ سورۃ البقرہ، ۲ : ۱۴

۳۳ : ۳۸ سورۃ البقرہ، ۲ : ۱۵ ( اللہ ان سے ہنسی کرتا ہے اور ان کی سرکشی میں

(۱۸۸۹ - ۱۸۹۰ء) میں ہجرت کر کے مکّہ چلے گئے۔ سولہ برس تک خاندان حجاز میں مقیم رہا۔ مولانا حسین احمد اگرچہ اس دوران میں کبھی کبھی ہندستان آئے، لیکن ان کا بیشتر زمانہ مدینہ میں بسر ہوا؛ اسی لیے ان کے نام کے ساتھ مدنی کی نسبت ملتی ہے۔ ۱۹۱۶ء میں ان کے استاد شیخ الہند مولانا محمود الحسن مکّہ پہنچے تو مولانا حسین احمد ان کے ہمنوا ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ بھی ان کے ساتھ مالٹا جلاوطن کر دیے گئے۔ ۱۹۲۰ء میں رہائی پر ہندستان آئے اور تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات کی سرگرمیوں میں کود پڑے۔ مولانا ابوالکلام نے دسمبر ۱۹۲۰ء میں جو مدرسہ کلکتہ میں جاری کیا تھا، اس کے صدر مدرّس مولانا مدنی ہی تھے۔ کلکتے کے بعد وہ سلہٹ گئے، جہاں چھ برس تک حدیث کا درس دیتے رہے۔ ۱۹۲۸ء میں انھیں دارالعلوم دیوبند کا صدر مدرّس منتخب کیا گیا۔ وہ یہاں ۳۰ برس رہے۔ جمعہ ۶ دسمبر ۱۹۵۷ء (۱۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ) کو انتقال ہوا (تذکرۂ مشایخ دیوبند)

۱۷ : ۴ ڈاکٹر کچلو۔ سیف الدین نام تھا۔ ۱۵ جنوری ۱۸۸۶ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ یہاں تعلیم کے بعد انگلستان گئے اور کیمبرج یونیورسٹی سے بی اے کی سند لی؛ پھر بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۱۲ء میں برلن یونیورسٹی (جرمنی) سے پی ایچ ڈی کی سند لی۔ ۱۹۱۳ء میں ہندستان واپس آئے، اور قومی تحریک میں شامل ہو گئے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ (امرتسر) کے المناک سانحے سے کچھ بعد گرفتار ہوئے۔ اس کے بعد کئی مرتبہ قید و بند کی سزا ہوئی۔ مجموعی طور پر ۱۴ برس جیلخانے میں کاٹے۔ دسمبر ۱۹۲۹ء میں کانگریس کا جو اجلاس پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں لاہور میں ہوا تھا، ڈاکٹر کچلو اس کی مجلسِ استقبالیہ کے صدر تھے۔ انھوں نے مسلم لیگ اور خلافت تحریک میں بھی سرگرم حصّہ لیا تھا۔ آخری زمانے میں ان کا رجحان بائیں بازو کی سیاست کی طرف ہو گیا تھا؛ چنانچہ وہ آٹھ سال تک "پیس کونسل" کے صدر رہے۔ وہ پہلے ہندستانی تھے، جنھیں ۱۹۵۴ء میں "لینن پیس پرائز" ملا۔ بدھ کے دن ۹ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو نئی دلّی میں انتقال ہوا۔ اسی دن جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر، نئی دلّی کے قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے۔

۱۷ ۵ پیر غلام مجدّد: مٹیاری، سندھ کے رہنے والے اور وہاں کے سجّادہ نشین تھے۔

مِنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ

(الممتحنہ ۶۰ : ۸)

متن میں آخری ٹکڑے کے معنی بیان نہیں ہوئے ہیں۔ یہ ہیں: بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

۵۰ : ۲ الہلال کا پہلا شمارہ ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو نکلا تھا۔ لیکن ہندو مسلم تعاون اور اتحاد پر انھوں نے اور کئی جگہ بھی لکھا ہے۔

۵۱ : ۳ سیرۃ النبویہ لابن ہشام، ۲ : ۱۴۷ (بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم۔ ھذا کتاب من محمد النبی صلی اللہ علیہ وسلم، بین المؤمنین والمسلمین من قریش ویثرب ومن تبعھم، فلحق بھم، وجاھد معھم انھم امۃ واحدۃ من دون الناس .... الخ)
اس معاہدے کے مکمل ترجمے کے لیے دیکھیے، عہدِ نبوی میں نظامِ حکمرانی از محمد حمید اللہ (ص ۱۰۲ - ۱۱۱)

۵۸ : ۴ سورۃ العصر ۱۰۳ : ۱ - ۳ (قسم ہے عصر کی کہ انسان یقیناً خسارے میں ہے، بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائیں، اور نیک کام کریں، اور آپس میں ایک دوسرے کو نیکی کی تاکید کرتے رہیں، اور باہم صبر و تحمّل پر عمل کریں۔

## ۴۔ خطبۂ اختتامیہ، مجلسِ خلافت، آگرہ

۷۱ : ۱ مولانا محمد علی۔ ولادت: رامپور ۱۰ دسمبر ۱۸۷۸ء؛ وفات: لندن ۴ جنوری ۱۹۳۱ء
مختصر حالات کے لیے دیکھیے تذکرہ (حواشی)، ۳۴۴ (ساہتیہ اکاڈمی ایڈیشن)

۷۱ : ۲ مولانا شوکت علی۔ ولادت: رامپور ۱۸۷۳ء؛ وفات: دلّی ۲۷ نومبر ۱۹۳۸ء
مختصر حالات کے لیے دیکھیے مآخذِ سابق الذکر۔

۷۱ : ۳ حسین احمد مدنی۔ ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوئے۔ دیوبند میں تعلیم پائی۔ لیکن ابھی اس کی تکمیل نہیں ہوئی تھی کہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ ان کے والد ۱۳۱۶ھ

ہو جانے سے انتقال ہوا۔ اگلے دن ہفتے کو جنازہ مہرولی گیا اور اپنے استاد اور دیرینہ مربّی مفتی کفایت اللہ مرحوم کے پہلو میں درگاہِ حضرت بختیار کاکی کے دروازے کے برابر ظفر منزل کے نیچے دفن ہوئے۔ (مفتی اعظم کی یاد میں: ۱۸۴-۲۱۸)

۷۱ : ۹ عبدالعزیز۔ افسوس، ان کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

۷۵ : ۱۰ اللہ تعالیٰ کی صفات میں 'عزیز' یعنی (زبردست طاقت والا) بھی ہے۔ یہ لفظ بلا مبالغہ قرآن میں بیسیوں جگہ خدا کی اس صفت کے ساتھ آیا ہے۔

۷۶ : ۱۱ اس حدیث کے الفاظ ہیں: اَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ عَدْلٍ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ (او امیر جائر)۔ یہ حدیث صحاحِ ستّہ کے متعدد مجموعوں میں ملتی ہے مثلاً ابو داؤد (کتاب الملاحم: ۱۷)، ترمذی (کتاب الفتن: ۱۳)، النسائی (کتاب البیعہ: ۳۷)، ابن ماجہ (کتاب الفتن: ۳۰) اس کے علاوہ مسند ابن حنبل کی تیسری اور چوتھی اور پانچویں جلد کے کئی مقامات پر بھی ہے۔

۷۷ : ۱۱ جلیاں والا باغ: امرتسر میں ایک پرانے وقتوں کا باغ تھا، جہاں لوگ میلے لگاتے اور جلسوں کے لیے جمع ہوتے تھے۔ پہلی عالمی جنگ عظیم (۱۹۱۴-۱۹۱۸ء) کے بعد پنجاب میں بہت بے چینی پھیل گئی تھی۔ حکومتِ وقت نے سختی سے کام لیا۔ سر مائیکل اوڈوائر لفٹنٹ گورنر پنجاب نے طاقت کے زور سے لوگوں کو مرعوب اور خاموش کرنا چاہا؛ متعدد عوامی لیڈر گرفتار کر لیے، گولی چلا دی، جس میں بیگناہ لوگ مارے گئے۔ حکومت کے ان اقدامات کے خلاف احتجاج کے لیے عوام نے بروز اتوار ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیاں والا باغ میں جلسہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ جلسہ ہو رہا تھا کہ بریگیڈیر جنرل ڈائر فوج لے کر جلسہ گاہ پر پہنچ گئے۔ انھوں نے لوگوں کو منتشر ہونے کے لیے کہا تک نہیں، بلکہ پہنچنے کے ساتھ ہی ہجوم پر گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ واقعی کتنے آدمی اس المیے میں ہلاک ہوئے۔ تحقیقاتی کمیٹی کا اندازہ تھا کہ "اگر مرنے والوں کی تعداد ایک ہزار قرار دی جائے، تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔"

۷۹ : ۱۲ سورۃ الفرقان ۲۵: ۶۹۔ ظاہر ہے کہ متن میں اس آیت کا جو ترجمہ دیا گیا ہے، وہ

۱۷ : ۶ مولانا نثار احمد۔ کانپور کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد مولوی احمد حسن بریلوی مسلک کے یعنی مولانا احمد رضا خان کے مریدوں میں سے تھے۔ انھوں نے مثنوی مولانا روم کا ایک خاص ایڈیشن چھ جلدوں میں کانپور سے شائع کیا تھا۔

۱۷ : ۷ جگت گورو شنکراچاریہ۔ ان کا اصلی نام وینکٹ رامن تھا۔ شاردا پیٹھ کے جگت گورو نے ۴ جولائی ۱۹۱۶ء کو انھیں اپنا جانشین مقرر کیا اور ۲۷ فروری ۱۹۲۱ء کو جسد ان میں انھیں گدی پر بٹھا کر خود صحت کی بنا پر دست بردار ہو گئے۔ وہ اس مقدمے میں بیگناہ قرار پائے۔

۱۷ : ۸ مولانا احمد سعید دہلوی، دسمبر ۱۸۸۸ء (ربیع الثانی ۱۳۰۶ھ) میں دلّی میں پیدا ہوے۔ خاندان کے کشمیری تھے۔ ان کے والد حافظ نواب مرزا زینت المساجد کے پیش امام تھے، اور مکتب بھی پڑھاتے تھے۔ احمد سعید کے بچپن میں ان کی تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہیں ہوئی۔ قرآن تو ضرور حفظ کر لیا تھا، لیکن اس سے آگے کوئی ترقی نہیں کی۔ البتہ مولویوں کے وعظ سنتے سنتے خود تقریر کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ چونکہ طرّار اور ذہین تھے، بہت جلد چل نکلے اور تقریریں اور وعظ کرنے لگے۔ ۲۲ برس کی عمر ہوگی کہ ۱۹۱۰ء میں مفتی کفایت اللہ مرحوم کی نظر ان پر پڑی اور انھوں نے اپنی نگرانی میں ان کی تعلیم کا سلسلہ قائم کیا اور چند سال میں فارغ التحصیل کر دیا۔

اب یہ اصحابِ علم کی طرح مذہبی مناظروں میں حصہ لینے لگے۔ ان میں مفتی کفایت اللہ مرحوم ان کے معاون ہوا کرتے تھے۔ جب ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ العلمائے ہند قائم ہوئی، تو مفتی صاحب اس کے صدر اور یہ ناظم مقرر ہوئے۔ اس سلسلے میں سیاسی تحریک میں حصہ لیا اور قید و بند تک نوبت پہنچی اور متعدّد مرتبہ جیل گئے۔

تقریر کے میدان میں بہت کم لوگ ان کے حریف تھے۔ اسی مہارت اور خطابت کے باعث اصحابِ علم نے انھیں ''سحبان الہند'' کا لقب عطا کیا تھا۔ صاحبِ تصنیف و تالیف بھی تھے۔ ان کی کتابوں کی فہرست لمبی ہے، لیکن سب سے اہم ترجمۂ قرآن ہے، جو دلّی کی صاف ستھری، نکھری زبان کا اچھا نمونہ ہے۔

۴ دسمبر ۱۹۵۹ء (۳ جمادی الثانی ۱۳۷۹ھ) بروز جمعہ مغرب کے بعد حرکتِ قلب بند

چیرا تھا کہ دیکھے کہ اس نے دل سے کہا تھا یا نہیں۔ اور اس بات کو متاسفاً دُہرایا۔ اسامہ کہتے تھے کہ کاش میں اس دن اسلام لایا ہوتا۔ (صحیح مسلم، کتاب الایمان)

## ۵۔ خطبۂ صدارت جمعیۃ العلما ہند، لاہور

۸۳ : ۱ جمعیۃ العلماء ہند کا یہ تیسرا سالانہ اجلاس تھا، جو لاہور میں ۱۸ نومبر سے ۲۰ نومبر ۱۹۲۱ء تک منعقد ہوا۔ یہ لاہور کے مشہور بریڈلا ہال میں ہوا تھا۔ خطبۂ صدارت جو چھپا ہوا موجود تھا، پہلے دن ۱۸ نومبر ۱۹۲۱ء کو پڑھا گیا تھا۔ اس اجلاس کے صدر استقبالیہ مولانا عبدالقادر قصوری تھے۔ اس سے پہلے جمعیۃ العلماء ہند کے دو اجلاس ہو چکے تھے: پہلا، امرتسر میں (۲۸، ۳۱ دسمبر ۱۹۱۹ء ویکم جنوری ۱۹۲۰ء) بصدارت مفتی محمد کفایت اللہ اور دوسرا، دہلی میں بصدارتِ شیخ الہند مولانا محمود الحسن (۲۸، ۲۹، ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو)

۸۴ : ۲ سورۃ الکہف، ۱۸: ۱۰ (اے ہمارے رب! ہمیں اپنی بخشش عطا کر اور ہمارے لیے ہمارے کام کی درستی مکمل کر دے)

۸۶ : ۳ دیوان کامل خواجہ حافظ شیرازی: ۱۴۳

۸۷ : ۴ ایضاً: ۱۴۷۔ دوسرے شعر کے مصرع اول میں مطبوعہ دیوان میں 'قدسیاں' کی جگہ 'خاکیاں' ملتا ہے۔ دیوان کے بعض دوسرے نسخوں میں سرے سے یہ غزل موجود ہی نہیں، ممکن ہے الحاقی ہو۔

۸۸ : ۵ یہ مشہور حدیث صحیح بخاری کے متعدد مقامات پر ہے (مثلاً بدءالوحی: ۱؛ عتق: ۶ وغیرہ) اس کے علاوہ یہ صحیح مسلم (کتاب الامارہ: ۱۵۵)، ابوداؤد (کتاب الطلاق: ۱۱)، نسائی (کتاب الطہارہ: ۵۹؛ کتاب الطلاق: ۲۴ وغیرہ) اور ابن ماجہ (کتاب الزہد: ۲۶) میں بھی ملتی ہے۔

۸۸ : ۶ یہ حدیث صحیح بخاری میں کئی جگہ آئی ہے مثلاً کتاب الایمان، کتاب العتق،

تفسیری ہے، لفظی نہیں۔

۸۰ : ۱۳ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ (البقرہ، ۲ : ۲۱۷)، وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (البقرہ، ۲ : ۱۹۱) فتنہ و فساد قتل سے بھی بڑا (جرم) ہے۔

۸۱ : ۱۴ البقرہ، ۲ : ۱۷۹ (اے اصحابِ عقل! قصاص میں زندگی (کی روح) ہے۔

۸۲ : ۱۵ النساء ۴ : ۹۳

۱۶ اسامہ بن زید بن حارث مشہور صحابی ہیں۔ ان کے والد زید بن حارث رسول کریم صلعم کے آزاد کردہ غلام تھے اور انھوںؓ نے خود ان کی تربیت کی تھی۔ اسی لیے اسامہؓ حضرت رسول اللہ صلعم کو بہت عزیز تھے۔ ان کی ولادت چوتھے سال نبوت (تقریباً ۶۱۴ء) میں ہوئی۔ ان کے والد زید، شام میں البلقاء کے مقام پر مارے گئے، تو حضرت رسول اللہ صلعم نے انھیں ایک فوج کا سپہ سالار بنا کر شام روانہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس لشکر میں بڑے بڑے اکابر صحابہ ان کی ماتحتی میں تھے، حال آنکہ اس وقت ان کی اپنی عمر ۱۷۔۱۸ سال سے متجاوز نہیں تھی۔ لشکر ابھی روانہ نہیں ہوا تھا کہ حضورؐ کا وصال ہو گیا اور حضرت ابوبکرؓ خلیفہ بنا دیے گئے۔ بیشتر لوگوں نے مشورہ دیا کہ حالات کو دیکھتے ہوئے مہم ملتوی کر دی جائے، لیکن ان کی مخالفت کے باوجود حضرت ابوبکرؓ نے یہ مہم بھیج دی تھی۔

حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں ان کا ۴۰۰۰ درہم سالانہ وظیفہ مقرر کیا تھا، جو بدری صحابیوں کو ملتا تھا۔ ۵۴ ہجری میں انتقال کیا اور مدینہ میں دفن ہوئے۔

یہاں جس واقعے کا ذکر ہے، یہ قبیلہ جُہَیْنَہ کے خلاف مہم میں پیش آیا تھا۔ ہوا یہ کہ حضرت اُسامہ نے ایک مخالف کو پکڑ لیا۔ جونہی اسے قتل کرنے کو تلوار اٹھائی، اس نے کہہ دیا: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ ۔ راوی ابن ابی شیبہ نے اس کا حضرت رسول کریم صلعم سے ذکر کیا، تو آپؐ نے دریافت فرمایا: کیا واقعی اس نے لا إلٰہ إلّا اللّٰہ کہا تھا اور اس کے باوجود تم نے اسے قتل کر دیا۔ اسامہ نے جواباً کہا: حضور، اس نے تلوار سے ڈر کر ایسا کہا تھا۔ اس پر حضورؐ نے سوال کیا: تو کیا تم نے اس کا دل

۹۲ : ۱۹ سورۂ محمد، ۴۷ : ۱۴ (بھلا ایک آدمی جو اپنے رب کے (بتائے ہوئے) صاف رستے پر چلتا ہے، کیا اس کے برابر ہے، جسے اس کے بُرے اعمال اچھے معلوم ہونے لگے؛ اور وہ چلتے ہیں اپنی ہوا و ہوس کے پیچھے)

۹۲ : ۲۰ سورۃ النحل، ۱۶ : ۸۹ (ہر چیز کا کھلا کھلا بیان)

۹۲ : ۲۱ سورۃ البقرۃ، ۲ : ۲۵۶ (مضبوط حلقہ، ناقابلِ شکست)

۹۲ : ۲۲ سورۂ یوسف، ۱۲ : ۱۰۸ (یہ ہے میری راہ، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں؛ میں صاحبِ بصیرت ہوں اور وہ بھی جو میری پیروی کرتے ہیں)

۹۲ : ۲۳ سورۃ الانعام، ۶ : ۵۰؛ نیز رعد، ۱۳ : ۱۶ (کیا اندھا اور دیکھنے والا ایک برابر ہوتے ہیں)

۹۲ : ۲۴ سورۃ الزمر، ۳۹ : ۹ (کیا جو لوگ جانتے ہیں، وہ نہ جاننے والے لوگوں کے برابر ہوتے ہیں)

۹۳ : ۲۵ گلستاں کے بابِ پنجم کی آخری (منظوم) حکایت کا شعر ہے (کلیاتِ سعدی : ۱۰۲)

۹۳ : ۲۶ مولانا محمود الحسن شیخ الہند ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء میں بریلی میں پیدا ہوئے، جہاں ان ایام میں ان کے والد مولانا ذوالفقار علی بحیثیت انسپکٹر مدارس مقیم تھے۔ تعلیم کے بعد ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء میں اولاً دارالعلوم دیوبند میں معین مدرس مقرر ہوئے اور پچاس برس تک (۱۳۳۹ھ) یہاں پڑھاتے رہے؛ آخری ۳۴ برس یہیں صدر مدرس رہے۔ انھوں نے ملک کی آزادی کے لیے خفیہ طور پر بہت کام کیا تھا اور اسی مقصد کے لیے جمعیۃ الانصار کی تحریک شروع کی تھی۔ اسی کے نتیجے میں ہندستان کی شمال مغربی سرحد پر انگریزوں کے خلاف محاذ قائم ہوا۔ ان کی ہدایت کے مطابق جن لوگوں نے ہجرت کر کے افغانستان میں سکونت اختیار کی تھی، انھوں نے وہاں ایک متوازی حکومت قائم کر لی۔ بیرونِ ہند اسی تحریک کو تقویت پہنچانے کے لیے انھوں نے ۱۹۱۵ء (۱۳۳۳ھ) میں مکّہ کا سفر کیا۔ یہاں انھوں نے دو حج کیے۔ یہ پہلی جنگِ عظیم کا زمانہ تھا، اور انگریزی کی ان کی مخالفانہ سرگرمیوں پر کڑی نگاہ تھی۔ انھوں نے شریف مکّہ

مناقب الانصار وغیرہ۔ اس کے علاوہ یہ مسلم (کتاب الامارہ)، دارمی (کتاب الطلاق) ترمذی (کتاب الفضائل الجہاد)، نسائی (کتاب الایمان) اور مسند حنبل (۱: ۳۴۴) میں بھی ہے۔

۸۸ : ۷ سورۃ البقرہ، ۲: ۲۰۷ (اور بعض آدمی اللہ کی رضاجوئی کی خاطر اپنے آپ کو بیچ ڈالتا ہے۔)

۸۹ : ۸ یہ آیت سورۃ الشعرا (۲۶) میں بار بار آئی ہے مثلاً ۱۰۹، ۱۲۷، ۱۴۵، ۱۶۴، ۱۸۰۔ اس کے معنی ہیں: میں اس کے لیے تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، کیونکہ مجھے معاوضہ جہانوں کا رب دیگا۔

۸۹ : ۹ مسند دارمی: مقدمہ

۹۲ : ۱۰ سورۃ الاحزاب، ۳۳: ۲۱ (تمھارے لیے رسول اللہ میں اچھا نمونہ ہے)

۹۲ : ۱۱ سورۂ ممتحنہ، ۶۰: ۴ (تمھارے لیے اچھا نمونہ ہے، ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کا)

۹۲ : ۱۲ سورۂ فاتحہ، ۱: ۵، ۶ (ہمیں سیدھے راستے پر چلا، راستہ ان لوگوں کا جن پر تو نے فضل کیا)

۹۲ : ۱۳ سورۃ النساء، ۴: ۶۹ (جن پر اللہ نے انعام کیا نبیوں اور صدیقوں اور شہیدوں اور نیکوکاروں میں سے، اور کیا اچھے رفیق ہیں یہ لوگ)

۹۲ : ۱۴ سورۂ ہود، ۱۱: ۷، نیز سورۃ الملک، ۶۷: ۲ (تاکہ تمھارا امتحان کرے کہ تم میں سے کون اچھا عمل کرتا ہے)

۹۲ : ۱۵ سورۃ النور، ۲۴: ۴۰ (اندھیرے ایک دوسرے کے اوپر)

۹۲ : ۱۶ سورۃ الجاثیہ، ۴۵: ۲۴ (انھیں اس کا کچھ علم نہیں ہے، سوائے اس کے کہ وہ اٹکل سے کام لیتے ہیں)

۹۲ : ۱۷ سورۃ الدخان، ۴۴: ۹ (بلکہ وہ دھوکے میں کھیلتے ہیں)

۹۲ : ۱۸ سورۃ النجم، ۵۳: ۲۸ (انھیں اس کا کچھ علم نہیں، محض قیاس کی پیروی کرتے ہیں؛ اور حقیقت کے مقابلے میں قیاس تو کام نہیں دیتا)

کہو کہ بوڑھا بہک گیا ہے)

۹۶ : ۳۷ سورۃ یوسف، ۱۲ : ۸۴ (اور اس نے کہا، وائے افسوس یوسف پر، اور غم کے مارے اس کی آنکھیں سفید ہو گئیں، حال آنکہ وہ بہت ضبط کرتا رہا)

۹۶ : ۳۸ شاعر کا نام نہیں معلوم ہو سکا۔

۹۶ : ۳۹ مثنوی مولانا روم، دفتر اوّل : ۴۹ - ۵۰۔ عنوان "تفسیر ما شاء اللہ کان و مالم یشا لم یکن"۔ اس سلسلے میں دو باتیں کہنے کی ہیں : اول، یہ دونوں شعر مثنوی میں یکے بعد دیگرے نہیں آئے ؛ بلکہ ان کے درمیان چند شعر ہیں۔ دوسرے، شعرِ اول کے مصرعِ ثانی میں "روز و شب در" کی جگہ "ہمچو اُو با" ہے یعنی ع "ہمچو اُو با گریہ و آشوب باش" ہے۔

۹۶ : ۴۰

۹۶ : ۴۱ مولانا احمد سعید۔ دیکھیے خطبہ ۴، حاشیہ ۸

۹۷ : ۴۲ عباس بن الاحنف کا شعر ہے (دیوان : ۹۶) نیز دیکھیے تذکرہ (حواشی) : ۱/۳ (حاشیہ ۵ متعلقہ ص ۶۲)

: ۴۳ حلّاج کا شعر ہے (دیوان : ۱۲۸) مطبوعہ شعر کے مصرع ثانی میں اَھْوَن کی جگہ اَسْھَل ملتا ہے۔

۹۷ : ۴۴ یہ حدیث متعدد مجامیع میں آئی ہے مثلاً ترمذی (باب الفتن ؛ نیز تفسیر سورۃ المائدہ)؛ ابن ماجہ (باب الفتن)؛ مسند حنبل (۳ : ۳۹۰ - ۳۹۱)؛ ابوداود (کتاب الملاحم) ٹھیک الفاظ یہ ہیں : الصابر فیھم علی دینہ کالقابض علی الجمر۔

۹۸ : ۴۵ شاعر کا نام نہیں معلوم ہو سکا۔

۹۸ : ۴۶ سورۃ یوسف، ۱۲ : ۸۳ (شاید اللہ ان سب کو میرے پاس لے آئے ؛ وہی جاننے والا، حکمتوں والا ہے)

۹۸ : ۴۷ سورۃ الکہف، ۱۸ : ۱۰ (اے ہمارے رب! ہمیں اپنے پاس سے رحمت بخش، اور ہمارے کام کی ٹھیک سے تکمیل کر دے)

پر دباؤ ڈالا اور یہ دوسرے رفقاء کے ساتھ گرفتار کر لیے گئے۔ یہاں سے پہلے قاہرہ اور پھر جزیرہ مالٹا میں قید رہے۔ یہ قید و بند کا سلسلہ مارچ ۱۹۲۰ء تک چلا۔ رہائی کے بعد جون ۱۹۲۰ء میں وہ بمبئی پہنچے اور اسی سال ۲۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو دلی میں انتقال ہو گیا۔ جنازہ دیوبند گیا، جہاں دارالعلوم کے قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے (شیخ الہند اسیرِ مالٹا؛ تذکرہ مشایخِ دیوبند)

۹۴ : ۲۷ شاعر کا نام نہیں معلوم ہو سکا۔

۹۴ : ۲۸ سورۃ یوسف، ۱۲ : ۳۳ (میرے نزدیک قید خانہ اس چیز کی بہ نسبت زیادہ محبوب ہے، جس کی طرف وہ مجھے بلاتے ہیں)

۹۴ : ۲۹ سورۃ یوسف، ۱۲ : ۵۴ (یقیناً تم نے آج ہمارے پاس اعتماد کا مقام پایا)

۹۴ : ۳۰ سورۃ یوسف، ۱۲ : ۲۱، ۵۶ (اس طرح ہم نے یوسف کو زمین میں صاحبِ قدرت بنایا)

۹۴ : ۳۱ سورۃ یوسف، ۱۲ : ۹۰ (اللہ نے ہم پر احسان کیا؛ ہاں جو کوئی (اللہ سے) ڈرتا ہے اور مصیبت میں صبر کرتا ہے، تو یقیناً اللہ نیکی کرنے والوں کا بدلہ ضائع نہیں کرتا)

۹۵ : ۳۲ سورۃ یوسف، ۱۲ : ۷ (ہاں، یوسف اور اس کے بھائیوں کے قصے میں دریافت کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں)

۹۵ : ۳۳ سورۃ یوسف، ۱۲ : ۳۹ (اے میرے قید خانے کے ساتھیو! (یہ تو بتاؤ کہ) کیا منتشر متعدد معبود بہتر ہیں، یا ایک اکیلا زبردست اللہ؟)

۹۵ : ۳۴ سورۃ یوسف، ۱۲ : ۱۰۱ (اے رب! تو نے مجھے حکومت دی اور باتوں کا مطلب اور نتیجہ نکالنا سکھایا۔ اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے! تو ہی میرا کارساز ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ مجھے اٹھائیو تو اپنی فرمانبرداری کی حالت میں؛ اور ان کے ساتھ شامل کیجیو، جو تیرے نیک بندے ہیں)

۹۵ : ۳۵ شاعر کا نام نہیں معلوم ہو سکا۔

۹۵ : ۳۶ سورۃ یوسف، ۱۲ : ۹۴ (میں اس میں یوسف کی بُو پاتا ہوں، بشرطیکہ تم یہ نہ

۱۰۰ : ۵۹ سورۃ یونس، ۱۰: ۷۳؛ نیز صافات، ۳۷: ۷۳ ( دیکھو، کیا انجام ہوا ان کا، جنھیں ( بداعمالیوں سے ) ڈرایا گیا تھا )

۱۰۰ : ۶۰ سورۃ الاعراف، ۷: ۸۴ ( دیکھو، کیا انجام ہوا نافرمانی کرنے والوں کا )

۱۰۰ : ۶۱ سورۃ الشعراء، ۲۶: ۱۵۸ ( یقیناً اس میں نشان ہیں، اور ان میں سے اکثر اسے تسلیم نہیں کرتے )

۱۹۱ : ۶۲ سورۃ النور، ۲۴: ۳۴ ( اور ہم نے تم پر صاف صاف آیتیں نازل کیں اور ان لوگوں کے حالات بھی، جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں )

۱۰۱ : ۶۳ سورۃ الحج، ۲۲: ۴۵-۴۶ ( کتنی ہی بستیاں جنھیں ہم نے غارت کر دیا کیونکہ وہ گنہگار تھیں، اب اپنی چھتوں پر گری پڑی ہیں۔ اور کتنے کوئیں بیکار اور کتنے منقش محل ( خالی ) ہیں۔ کیا انھوں نے زمین میں چل پھر کر نہیں دیکھا تاکہ انھیں ( مشاہدے سے ) سوچنے والے دل یا سننے والے کان ملتے؛ بعض آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، بلکہ سینوں میں دل اندھے ہو جاتے ہیں )

۱۰۲ : ۶۴ سورۃ الاحزاب، ۳۳: ۶۲ ( یہ تھا قانون اللہ کا ان لوگوں سے متعلق جو پہلے گذرے اور تو نہیں پائیگا اللہ کا قانون بدلنے والا )

۱۰۲ : ۶۵ سورۃ الانفال، ۸: ۳۸ ( اور اگر وہ ( اپنے کرتوتوں کا ) اعادہ کرینگے، تو اگلوں کا بنا ہوا قانون موجود ہی ہے )

۱۰۲ ۶۶ سورۃ فاطر، ۳۵: ۴۳ ( کیا وہ انتظار کر رہے ہیں اس قانون کا جو پہلوں پر ( نافذ ) ہوا۔ ( اگر یوں ہے، تو ) تُو اللہ کے قانون کو بدلنے والا نہیں پائیگا اور نہ اللہ کے قانون کو ٹلنے والا پائیگا )

۱۰۲ ۶۷ سورۃ النساء، ۴: ۲۶ ( قانون ان لوگوں کے جو تم سے پہلے گذر چکے )

۱۰۳ ۶۸ سورۃ الحدید، ۵۷: ۲۱؛ نیز الجمعہ، ۶۲: ۴ ( یہ اللہ کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے، دیتا ہے؛ اور اللہ بڑے فضل والا ہے )

۱۰۳ ۶۹ المؤمنون، ۲۳: ۸۱ ( بلکہ یہ بھی وہی کچھ کہتے ہیں، جیسا ان سے پہلے کے لوگ

۹۹ : ۴۸ سورۃ الکہف، ۱۸ : ۲۳ (میرا رب ان کی تعداد خوب جانتا ہے)

۹۹ : ۴۹ ایضا : ۱۳ (وہ کئی جوان تھے، جو اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے انھیں ہدایت میں پختہ کیا)

۹۹ : ۵۰ ایضاً : ۱۴ (انھوں نے کہا: ہمارا رب، آسمانوں اور زمین کا رب، ہم اس کے سوا کسی دوسرے کو معبود کہہ کر نہیں پکاریں گے۔ اگر ہم نے ایسا کہا، تو یہ بے عقلی کی بات ہوگی)

۹۹ : ۵۱ ایضاً : ۱۶ (اب پناہ لو اس غار میں، تمھارا رب تمھارے لیے اپنی رحمت وسیع کر دے، اور تمھارے کام میں تمھارے لیے آسانی پیدا کر دے)

۱۰۰ : ۵۲ سورۃ ہود، ۱۱ : ۱۲۰ (اور ہم تیرے لیے رسولوں کے احوال میں سب باتیں بیان کرتے ہیں تاکہ اس سے تیرا دل مضبوط ہو اور اس میں تیرے پاس مومنوں کے لیے سچائی اور نصیحت اور یاد رکھنے والی باتیں ہیں)

۱۰۰ : ۵۳ ایضاً : ۱۰۲۔۱۰۳ (اور اس طرح کی ہے گرفت تیرے رب کی، جب وہ ظلم کرتی ہوئی بستیوں کو پکڑتا ہے۔ بیشک اس کی گرفت سخت دردناک ہے۔ اس میں آخرت کے عذاب سے ڈرنے والے کے لیے نشانی ہے)

۱۰۰ : ۵۴ سورۃ یوسف، ۱۲ : ۱۰۵ (اور کئی نشانیاں ہیں آسمانوں اور زمین میں جن سے وہ بے توجہی سے گذر جاتے ہیں)

۱۰۰ : ۵۵ سورۃ آل عمران، ۳ : ۱۹۱ (تو نے یہ عبث پیدا نہیں کیا)

۱۰۰ : ۵۶ سورۃ الانعام، ۶ : ۷۹ (میں نے ہر طرف سے منہ موڑ کر اپنا منہ اس کی طرف کر لیا ہے، جس نے آسمان اور زمین بنائے)

۱۰۰ : ۵۷ سورۃ المؤمنون، ۲۳ : ۴۴؛ نیز سورۃ سبا، ۳۴ : ۱۹ (اور ہم نے ان کی کہانیاں بنا ڈالیں)

۱۰۰ : ۵۸ سورۃ ہود، ۱۱ : ۱۰۱ (ان میں سے بعض اب تک کھڑی ہیں، اور بعض تباہ ہوگئیں)

۱۰۷ : ۷۹ یہ تمام اشعار نونیۃ البقاء کے ہیں؛ شاعر کا نام ابوالبقا، صالح بن شریف الرندی ہے (نفح الطیب، ۶ : ۲۲۳)

۱۰۷ : ۸۰ سورۃ الکہف، ۱۸ : ۱۰ (اے ہمارے رب! ہمیں اپنی جناب سے رحمت عطا کر اور ہمارے کام میں ہمیں ہدایت بخش)

۱۰۹ : ۸۱ سرسیّد احمد خان۔ انیسویں صدی کے ہندستان کی مایۂ ناز شخصیت۔ ولادت: دلّی، ۶ ذوالحجہ ۱۲۳۲ھ/ ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء۔ بانیِ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (حال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)۔ ملک کی تعلیمی، سماجی، سیاسی ترقی کی تاریخ ان کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو علی گڑھ میں انتقال ہوا؛ اور اپنے قائم کردہ کالج (یونیورسٹی) کی مسجد کے پہلو میں دفن ہوئے (حیاتِ جاوید)

۱۰۹ : ۸۲ سلطان محمود خان (۱۷۸۵ - ۱۸۳۹ء)، سلطان عبدالحمید اوّل کے صاحبزادے یہ اپنے بڑے بھائی مصطفیٰ چہارم کی وفات پر ۱۸۰۸ء میں تخت پر بیٹھے۔ انھوں نے اپنے وزیر اعظم بیراکتر کی ترغیب پر ملک میں اصلاحات نافذ کرنے کا فیصلہ کیا، لیکن فوج (ینی سری) کی مخالفت کے باعث انھیں ملتوی کرنے پر مجبور ہو گئے۔ سیاسی اور فوجی پہلو سے کبھی اطمینان نصیب نہ ہوا۔ اوّلاً یونان سے لڑائی ہوئی، جس کی پشت پر تمام یورپی طاقتیں تھیں۔ یہ ختم ہوئی، تو روس نے حملہ کر دیا۔ اس جنگ کا خاتمہ صلحنامۂ ادرنہ پر ہوا (۱۴ ستمبر ۱۸۲۹ء) جس نے ترکیا کو کم و بیش روس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا دیا۔
محمد علی پاشا (مصر) ان کی اصلاحی کوششوں کا سب سے مستعد مخالف تھا اور اسی لیے وہ لوگوں میں بہت ہر دلعزیز تھا۔ سلطان نظامِ حکومت اور فوج کو مغربی ممالک کے اسلوب پر منظم کرنا چاہتے تھے؛ یہی محمد علی پاشا نے بھی خود مصر میں کیا تھا۔ لیکن پراپگنڈے میں بہت طاقت ہے۔ سلطان چونکہ مدۃ العمر جنگوں میں الجھے رہے، اس لیے اپنے منصوبے کو مکمل نہ کر سکے۔ اس کے باوجود انھوں نے ۱۸۲۶ء میں ینی سری کا خاتمہ کر دیا۔ جس سے تنظیمات کے لیے راہ صاف

کہا کرتے تھے)

۱۰۳ : ۷۰ سورۃ التوبہ، ۹: ۳۳؛ الفتح، ۴۸: ۲۸؛ الصّف، ۶۱: ۹ (تاکہ اسے سب دینوں پر غالب کرے)

۱۰۴ : ۷۱ سورۃ العنکبوت، ۲۹: ۵۳ (وہ تجھ سے عذاب جلدی مانگتے ہیں، اور اگر اس کا وقت مقرر نہ ہوتا، تو ان پر عذاب کب کا آچکا ہوتا)

۱۰۴ : ۷۲ سورۃ یونس، ۱۰: ۴۸-۴۹ (اور وہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو، تو یہ عذاب کا وعدہ کب پورا ہوگا؟ (ان سے) کہو کہ میں تو اپنے لیے نہ برائی کا ذمہ دار ہوں، نہ بھلائی کا؛ ہاں جو اللہ چاہے۔ ہر قوم کے لیے ایک مقرّرہ وقت ہے؛ جب ان کا وقت آگیا، پھر وہ اسے نہ ایک گھڑی پیچھے کر سکینگے، نہ آگے کر سکینگے)

۱۰۴ : ۷۳ سورۃ غافر، ۴۰: ۷۸ (پس جب اللہ کا حکم نافذ ہوا، تو انصاف سے فیصلہ ہوگیا اور اس وقت جھوٹے نقصان میں رہے)

۱۰۴ : ۷۴ سورۃ الروم، ۳۰: ۴۱ (لوگوں کے ہاتھوں خشکی اور تری میں فساد کا دور دورہ ہوگیا)

۱۰۵ : ۷۵ سورۃ القصص، ۲۸: ۷۸ (کون ہے اس سے طاقت میں زیادہ تر)

۱۰۵ : ۷۶ مقابلہ کے لیے دیکھیے، انجیل لوقا (۹: ۵۸) (یسوع نے اس سے کہا کہ لومڑیوں کے بھٹ ہوتے ہیں اور ہوا کے پرندوں کے گھونسلے، مگر ابنِ آدم کے لیے سر دھرنے کی بھی جگہ نہیں)

۱۰۶ : ۷۷ عمرو بن الحارث بن عمرو بن مضاض الاصغر کا شعر ہے (السیرۃ لابن ہشام، ۱: ۸۲؛ معجم البلدان، ۵: ۱۸۶؛ وفیات الاعیان، ۱: ۳۰۱؛ المحاضرات للراغب، ۱: ۱۴۷)

۱۰۶ : ۷۸ یہ شعر نہج البلاغہ میں ہے (۹: ۵۵) اگرچہ وہاں 'منکر' کی جگہ 'نکر' ہے لیکن معلوم نہیں ہوسکا کہ ہے کس کا۔

اس سے انھیں بہت فائدہ ہوا۔ انھوں نے احمد جودت کی شرکت میں ترکی کی
پہلی جدید گرامر (قواعدِ عثمانیہ) کے نام سے لکھی۔ وہ اصلاح کے زبردست
حامی تھے، لیکن یہ بھی جانتے تھے کہ جلدبازی ترکیا کے قدامت پرست
حلقوں کی مخالفت کا باعث ہوگی، اس لیے انھوں نے بتدریج کام کیا۔
حقیقت یہ ہے کہ اس کے بعد تنظیمات کے نام سے جو کچھ ہوا، اس کی بنیاد
انھیں کے ہاتھوں پڑی تھی۔

۱۰۹ : ۸۴ محمد علی پاشا۔ مصر کی آزادی اور وہاں کے شاہی خاندان کے بانی، البانیا میں
پیدا ہوئے۔ سالِ ولادت میں اختلاف ہے، اگرچہ خود انھوں نے یہ ۱۷۶۹ء
لکھا ہے۔ ۱۷۹۸ء میں نپولین کے حملۂ مصر کے موقع پر وہ ترکی افواج کے ساتھ
مصر پہنچے اور یہاں انھوں نے اپنا حلقۂ اقتدار وسیع کرنے کی داغ بیل ڈالی۔
یہاں اس وقت ممالیک کا دور دورہ تھا۔ محمد علی نے مارچ ۱۸۱۱ء میں ان کے
سرداروں کی قلعے میں دعوت کی اور کھانے کے بعد سب کو تہ تیغ کرا دیا۔ اس
کے بعد جب وہابیوں نے جزیرۃ العرب پر قبضہ کر لیا، تو سلطان نے محمد علی سے مدد
طلب کی؛ اور محمد علی کے سب سے بڑے بیٹے ابراہیم پاشا نے ان کا قلع قمع کر دیا۔
اس کے بعد محمد علی نے رفتہ رفتہ اپنا اقتدار سوڈان اور مصر کے جنوبی نخلستانوں
تک وسیع کر لیا۔ خرطوم کی بنا ۱۸۲۳ء میں پڑی اور سات سال بعد ۱۸۳۰ء میں
یہ سوڈان کا دارالخلافہ بنا دیا گیا۔ وہ چاہتے تھے کہ ملک کے نظم ونسق کی مغربی
طرز پر اصلاح اور تنظیم ہو؛ ادھر سلطان کو شبہ تھا کہ محمد علی، شریفِ مکّہ کی مدد اور
شہ پر اپنے خلیفۃ المسلمین ہونے کا اعلان کرنا چاہتے ہیں۔ بالآخر جنگ تک
نوبت پہنچی، جس کے نتیجے میں سلطان معظم کو محمد علی کو مصر کا موروثی پاشا تسلیم
کرنا پڑا (۱۸۴۱ء)۔ محمد علی کی ۲ اگست ۱۸۴۹ء کو قاہرہ میں وفات ہوئی؛
وہیں دفن ہیں۔ وہ مصرِ جدید کے بانی ہیں۔ ان کے خاندان نے ۱۹۵۲ء تک
حکومت کی، جب انقلاب ہوا، اور ان کے نام لیوا فاروق کو تخت سے

ہوگئی۔

یکم جولائی ۱۸۳۹ء کو انتقال ہوا۔

۱۰۹ : ۸۳ فواد پاشا۔ ترکیا کے مشہور شاعر عزت ملا کے بیٹے تھے۔ جنھیں سیاسی سرگرمیوں کے باعث ۱۸۲۹ء میں جلاوطنی کی سزا ملی تھی۔ ان کا اصلی نام محمد تھا۔ اور یہ ۱۸۱۵ء میں استامبول میں پیدا ہوئے۔ طب اور فرانسیسی زبان کی تعلیم کی تکمیل کے بعد حکومت کی ملازمت میں داخل ہو گئے۔ اور یہاں سے ان کی ترقی اور تجربہ تبدریج بڑھتا رہا۔ تین چار مرتبہ وزیر خارجیہ رہنے کے بعد ۲۲ نومبر ۱۸۶۱ء کو پہلی مرتبہ وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے، لیکن سلطان عبدالعزیز سے اختلاف کی بنا پر انھیں جنوری ۱۸۶۲ء میں دست بردار ہونا پڑا۔ لیکن جلد ہی سلطان نے انھیں واپس بلالیا اور جون میں وہ دوبارہ وزیر اعلیٰ بنا دیے گئے۔ اب کے وہ اس عہدے پر تین برس تک متمکن رہے۔ اس اثنا میں انھوں نے ملک و ملت کے لیے بہت اہم خدمات سرانجام دیں۔ چونکہ سلطان عبدالعزیز، مصر کے خدیو اسماعیل کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتے تھے، اور فواد اس کے خلاف تھے، اس لیے اس نے انھیں جون ۱۸۶۶ء میں وزارت اعلیٰ کے منصب سے الگ کر دیا۔

فروری ۱۸۶۷ء میں وہ (پانچویں اور آخری مرتبہ) وزیر خارجیہ کی حیثیت سے سلطان عبدالعزیز کے ساتھ پیرس، لندن، وی آنا کے سفر پر گئے۔ جہاں ایک طرف اس سے سیاسی فائدے حاصل ہوئے، وہیں اس سفر میں سلطان کو مغرب کی مادی ترقیوں کے دیکھنے کا موقع ملا؛ یہ سفر ترکیا میں اصلاح و تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

فواد پاشا صحت کی خرابی کی وجہ سے نیس (اٹلی) گئے تھے کہ وہیں ۱۲ فروری ۱۸۶۹ء کو بعارضۂ قلب انتقال ہوگیا۔ لاش استامبول آئی، جہاں وہ دفن ہوئے۔

فواد پاشا کو فرانسیسی زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ اور یہی اس زمانے میں (بلکہ بہت قریب کے زمانے تک) بین الاقوامی سیاست کی زبان تھی۔

کے لیے تیار کرنے کا حکم دیا۔ یہی اسکیم بعد کو "احکام ولایات" کے نام سے مشہور ہوئی۔

مدحت پاشا "ینگ ترک" پارٹی کے مؤیّد اور مدّاح تھے، لیکن چاہتے تھے کہ اصلاحات قدم بقدم اور رفتہ رفتہ نافذ ہوں۔ ادھر سلطان عبدالعزیز کسی عنوان اس پر تیار نہیں تھے، جس سے کام بگڑتا چلا گیا۔ آخر کار وزیر اعلیٰ اور وزیر افواج اور مدحت پاشا نے گٹھ جوڑ کرکے سلطان کو مئی ۱۸۷۶ء میں معزول کر دیا اور اس کے کوئی مہینا بھر بعد وہ موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ ان کے جانشین مراد پنجم کا بھی یہی حشر ہوا، اور ان کی جگہ ان کے چھوٹے بھائی عبدالحمید ثانی تخت نشین ہوئے۔ انھوں نے مدحت پاشا کو وزیر اعلیٰ کے عہدے پر فائز کر دیا۔ لیکن ان کی نئے سلطان سے نبھ نہ سکی۔

مدحت پاشا کے آخری سال مختلف قسم کے مصائب میں بسر ہوئے حتیٰ کہ ایک موقع پر انھیں موت تک کی سزا سنا دی گئی۔ جان تو انگریزی حکومت کے بیچ بچاؤ سے بچ گئی، لیکن جلا وطن ہونا پڑا۔ آخری ایام طائف (جزیرۃ العرب) میں گزرے؛ وہیں ۸ مئی ۱۸۸۴ء کو انتقال ہوا۔

۱۰۹ : ۸۹ اس سے مراد ہے حدیث: بدء الاسلام غریبًا وسیعود کما بدء فطوبیٰ للغرباء (مسلم، کتاب الایمان: ۲۳۲؛ ترمذی، کتاب الایمان: ۱۳؛ ابن ماجہ، کتاب الفتن: ۱۵ وغیرہ)

۱۱۰ : ۹۰ الہلال کا پہلا شمارہ ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو شائع ہوا، اور آخری نومبر ۱۹۱۴ء کو۔ اپنی نشاۃ ثانیہ میں یہ البلاغ کے نام سے ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء کو پھر شروع ہوا۔ اس سلسلے کا آخری پرچہ (مشترکہ نمبر ۱۵-۱۶) ۱۷-۲۴ مارچ ۱۹۱۶ء کا ہے۔ تیسری مرتبہ یہ پھر الہلال ہی کے نام سے جون ۱۹۲۷ء سے دسمبر ۱۹۲۷ء تک چھ مہینے شائع ہوتا رہا۔

۱۱۰ : ۹۱ یہ کوئی حدیث نہیں ہے، بلکہ قرآنی آیت کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ

معزول کر دیا گیا۔

۱۰۹ : ۸۵ خیر الدین۔ افسوس، ان کے حالات کہیں سے دستیاب نہیں ہوئے۔

۱۰۹ : ۸۶ بیرم تیونسی۔ تیونس کے ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ تھے، جس نے تیرھویں صدی ہجری میں فقہ اور ادب کے میدان میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ ان کا پورا نام محمد بیرم بن مصطفیٰ بن محمد تھا اور وہ محمد بیرم پنجم کے عرف سے مشہور ہیں۔ ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰ء) میں تیونس میں پیدا ہوئے۔ تعلیم یورپ میں پائی اور پھر حکومت کے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ جب ۱۲۹۸ھ (۱۸۸۲ء) میں فرانس ان کے وطن پر مسلّط ہو گیا، تو وہ ہجرت کر کے اولاً استامبول گئے اور پھر وہاں سے مصر چلے آئے۔ یہاں سے انھوں نے ایک پرچہ 'الاعلام' کے نام سے جاری کیا۔ بعد کو وہ قاہرہ میں قاضی مقرر ہوئے۔ وہ مصر میں برطانوی اقتدار کے سخت مخالفین میں سے تھے۔

وہ متعدد کتابوں کے مصنّف ہیں؛ "صفوۃ الاعتبار بمستودع الامصار" ان میں سے بہت مشہور ہے؛ یہ چھپ چکی ہے۔ اس کتاب کا ان کا اپنا خطی نسخہ دارالکتب مصریہ، قاہرہ میں محفوظ ہے۔

حلوان (مصر) میں ۱۳۰۷ھ (۱۸۸۹ء) میں رحلت کی۔

۱۰۹ : ۸۷ سید جمال الدین اسد آبادی (۱۸۳۸/۱۸۳۹ء - ۱۸۹۷ء) حالات کے لیے دیکھیے غبارِ خاطر (ساہتیہ اکاڈمی ایڈیشن): ۳۱۵

۱۰۹ : ۸۸ مدحت پاشا۔ ۱۸۲۲ء میں قسطنطنیہ میں پیدا ہوئے۔ زندگی بہت معمولی ملازمت سے شروع کی، لیکن جو کام بھی ان کے سپرد ہوا، اسے انھوں نے ایسی مستعدی اور عمدگی سے انجام تک پہنچایا کہ ۱۸۶۰ء میں پاشا کے خطاب سے مفتخر ہو کر وزیر مقرر ہو گئے۔ اس کے بعد نیش کی گورنری کے زمانے میں انھوں نے جو اصلاحات وہاں رائج کیں، ان کی کامیابی سے متاثر ہو کر سلطان المعظم نے انھیں فواد پاشا اور علی پاشا کی معیت میں ایسی ہی اسکیم پورے ممالکِ اسلامیہ

۱۱۴ : ۱۰۳ اشارہ ہے سورۃ یوسف (آیت ۸۴) کی طرف : یٰاَسَفٰی عَلٰی یُوْسُفَ، یعنی وائے افسوس، یوسف پر

۱۱۵ : ۱۰۴ رانچی کی چار سالہ نظر بندی : ۷ اپریل ۱۹۱۶ء لغایت جنوری ۱۹۲۰ء

۱۱۵ : ۱۰۵ الخنساء کا شعر ہے (دیوان : ۱۵۱) اور بھی کئی جگہ ملتا ہے۔

۱۱۵ : ۱۰۶ سورۃ الزخرف، ۴۳ : ۷۱ (جسے دل چاہتا ہے اور جس سے آنکھیں لذت اندوز ہوتی ہیں)

۱۱۵ : ۱۰۷ سورۃ یوسف، ۱۲ : ۱۰۰ (یہ میرے پہلے خواب کی تعبیر ہے، جسے میرے رب نے سچ کر دکھایا)

۱۱۵ : ۱۰۸ افسوس، شاعر کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔

۱۱۵ : ۱۰۹ دیکھیے اسی خطبے کا حاشیہ (۸۹)

۱۱۶ : ۱۱۰ ابوداؤد (کتاب السنہ : ۵)؛ ترمذی (کتاب العلم : ۱۶)؛ ابن ماجہ (مقدمہ : ۷)۔ اس کے علاوہ یہ سنن دارمی اور مسند ابن حنبل میں بھی ملتی ہے۔

۱۱۶ : ۱۱۱ مشہور حدیث ہے۔ موطا امام مالک (باب النہی عن قول فی القدر) میں رسولہ کی جگہ نبیّہ ہے۔ مستدرک حاکم کتاب العلم) میں تمسکتم کی جگہ اعتصمتم ہے۔

۱۱۶ : ۱۱۲ افسوس، شاعر کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔

۱۱۶ ۱۱۳ ایضاً

۱۱۷ : ۱۱۴ سورۃ الاعراف : ۷ : ۴۳ (شکر ہے اللہ کا جس نے ہمیں اسے قبول کرنے کی ہدایت بخشی، اور اگر اللہ ہمیں ہدایت نہیں دیتا، تو ہمیں کبھی ہدایت نہ ملتی)

۱۱۷ : ۱۱۵ سورۃ آل عمران، ۳ : ۱۸ (اللہ نے شہادت دی کہ اس کے سوائے کوئی معبود نہیں ہے؛ اور فرشتوں نے اور صاحبانِ علم نے بھی یہی کہا ہے کہ) وہی انصاف سے قائم ہے، کوئی اس اقتدار اور حکمت والے کے سوائے معبود نہیں ہے)

۱۱۸ : ۱۱۶ سورۃ المائدۃ، ۵ : ۱۱۷ (میں تو (اسی وقت تک) ان پر نگاہ رکھ سکتا تھا جب

(آلِ عمران، ۳ : ۱۱۰) سے مستنبط ہے۔

۱۱۰ : ۹۲ اشارہ ہے سورۃ البیّنہ (۹۸ : ۷) کی طرف : اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ (وہ لوگ سب خلق سے بہتر ہیں)

۱۱۰ : ۹۳ یہ قرآن میں دو جگہ ہے: سورہ البقرہ، ۲ : ۱۴۳؛ اور سورۃ الحج، ۲۲ : ۷۸ (لوگوں کے بتانے والے)

۱۱۰ : ۹۴ سورۃ النساء (۴ : ۱۳۵) میں ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ (اے لوگو جو ایمان لائے ہو انصاف پر قائم رہو اور شہادت (گواہی) دو اللہ کے لیے)

۱۱۰ : ۹۵ دیکھیے، صحیح مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافرین وقصرہا (۲۶۹) مسلم کے علاوہ یہ حدیث ابن ماجہ (مقدمہ : ۱۶) دارمی (کتاب الفضائل القرآن : ۹) اور مسند حنبل (۲ : ۳۲۷) میں بھی ملتی ہے۔

۱۱۰ : ۹۶ دیکھیے، سنن ترمذی، کتاب ثواب المسافرین (۴۱) یہ حدیث دارمی، کتاب الفضائل القرآن (۱) میں بھی ہے۔

۱۱۱ : ۹۷ سورۃ المائدہ، ۵ : ۴ (میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا اور یوں تم پر اپنی نعمت تمام کر دی)

۱۱۱ : ۹۸ سورۃ التوبہ، ۹ : ۳۳؛ سورۃ الفتح، ۴۸ : ۲۸؛ سورۃ الصف، ۶۱ : ۹ (تاکہ تمام دینوں پر غالب کرے)

: ۹۹ جامع ترمذی، کتاب الایمان، باب ماجاء فی افتراق ہذہ الامّۃ

: ۱۰۰ سورۃ الاسراء، ۱۷ : ۵ (اور اس وعدے کو تو ہونا ہی تھا)

۱۱۱ : ۱۰۱ سورۃ المجادلہ ۵۸ : ۱۹ (قابو پالیا ان پر شیطان نے اور بھلا دی انھیں اللہ کی یاد؛ وہ شیطان کا ٹولہ ہیں، اور یاد رکھو کہ شیطان کا ٹولہ ہی گھاٹے میں رہنے والا ہے)

۱۱۳ : ۱۰۲ سورۃ التوبہ، ۹ : ۱۰۲ (انھوں نے اچھے اور بُرے عمل خلط ملط کر دیے)

حق گوئی کے باعث عہد بنوامیہ کے معتوبین میں سے تھے؛ آخر قید و بند تک نوبت پہنچی۔ ۹۴ھ (۷۱۳ء) میں رحلت کی (الاکمال فی اسماء الرجال؛ تذکرۃ الحفّاظ، ۱: ۵۱۔۵۳)؛ طبقاتِ ابن سعد، ۵: ۵۸؛ وفیات الاعیان، ۱: ۲۰۶؛ حلیۃ الاولیا، ۲: ۱۶۱)

۱۲۰ : ۱۲۵ حضرت امام مالک بن انس، فقہ مالکی کے بانی۔ دراصل ان کا خاندان حمیری تھا۔ لیکن ان کے جدِّ اعلیٰ بنو تمیم بن مرّہ قریش سے مل گئے تھے۔ امام مالک کی ابتدائی تعلیم سے متعلق کوئی تفصیل نہیں ملتی، لیکن یہ یقینی ہے کہ انھوں نے فقہ ربیعۃ الرائی سے پڑھی۔ یہ علویوں اور عباسیوں کی کشمکش کا زمانہ تھا۔ محمد بن عبداللہ نے عباسی حکومت کے خلاف خروج کیا، تو امام مالک نے فتویٰ دیا کہ خلیفہ المنصور عباسی کی اطاعت ضروری نہیں ہے۔ لیکن انھوں نے عملاً اس سرکشی میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ شورش فرو ہو جانے کے بعد انھیں سزا دی گئی۔ اسی سزا کے دوران میں ان کے شانے اکھڑ گئے تھے۔

مالک کا کوئی ۸۵ سال کے سن میں ۱۷۹ھ/۷۹۵۔۷۹۶ء میں مدینے میں انتقال ہوا۔ البقیع میں آسودۂ خوابِ ابدی ہیں۔ ان کی مؤطا اپنے اختصار کے باوجود حدیث کی معتبر کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔

۱۲۱ : ۱۲۶ امام احمد بن حنبل، فقہ اہل سنت والجماعت کے چوتھے امام، ربیع الثانی ۱۶۴ھ/ دسمبر ۷۸۰ء میں بغداد میں پیدا ہوئے۔ متعدد اساتذۂ عصر سے تعلیم پائی اور اس کے لیے دور دور کے سفر کیے۔ تکمیل کے بعد بغداد میں حدیث کا درس دینے لگے۔ یہ خلیفہ المامون عبّاسی کا زمانہ تھا۔ اس نے معتزلہ کے اثر کے تحت مسئلہ خلقِ قرآن اٹھایا اور تمام علما سے اس کی تصدیق پر اصرار کیا۔ امام احمد نے اس سے انکار کر دیا۔ اس پر قید و بند اور ظلم و ستم کا دور شروع ہو گیا، جو المامون کی وفات کے بعد اس کے جانشینوں — المعتصم اور الواثق — کے عہد تک جاری رہا۔ امام احمد کا انتقال ربیع الاول ۲۴۱ھ/ جولائی ۸۵۵ء میں ہوا۔ باب الحرب بغداد کے

تک (خود) ان میں موجود تھا) آخری الفاظ "معلمًا وداعیًا الی الحق" قرآن کے الفاظ نہیں۔ مولانا آزاد نے محض سیاق مکمل کرنے کو اپنی طرف سے لکھے ہیں

۱۱۸ : ۱۱۷ سورۃ النساء، ۴: ۴۱ (اور کیا صورت ہوگی، جب ہم ہر ایک امت سے گواہ لائینگے اور پھر تمھیں ان لوگوں سے متعلق بطور گواہ طلب کرینگے)

۱۱۸ : ۱۱۸ سورہ حٰمٓ السجدہ، ۴۱: ۵۳ (ہم انھیں اپنے نشان دنیا میں اور خود ان کے نفسوں میں دکھلائینگے، حتیٰ کہ حق ان پر ٹھیک ٹھیک ظاہر ہوجائے)

۱۱۸ : ۱۱۹ سورۃ العنکبوت، ۲۹: ۴۳ لفظ 'ولکن' آیت کا ٹکڑا نہیں ہے۔ آیت کے معنی ہیں: عقلمندوں کے سوائے کوئی نہیں سمجھتا۔

۱۱۹ : ۱۲۰ سورۃ البقرہ، ۲: ۱۴۳ (اور یوں ہم نے تمھیں درمیانی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بن سکو۔ اور رسول تم پر گواہی دینے والا رہے)

۱۱۹ : ۱۲۱ سورۃ الاحزاب، ۳۳: ۴۵-۴۶ (ہم نے تجھے شہید اور خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے، جو (لوگوں کو) خدا کے حکم ہی سے اس کی طرف بلاتا ہے، چمکتے سورج کی طرح)

۱۲۰ : ۱۲۲ سورۃ السجدہ، ۳۲، ۱۶ (وہ اپنے رب کو (عذاب کے) ڈر سے اور (ثواب کے) لالچ میں پکارتے ہیں)

۱۲۰ : ۱۲۳ افسوس، شاعر کا نام معلوم نہیں ہوسکا۔

۱۲۰ : ۱۲۴ سعید بن المسیب۔ ابو محمد القرشی المخزومی، حضرت عمر کی خلافت کے دوسرے سال پیدا ہوئے۔ طبقۂ تابعین میں ان کا بہت بلند مقام ہے۔ فقہ وحدیث میں اور زہد و ورع میں ممتاز اقران تھے۔ بالخصوص اپنے خسر بزرگوار حضرت ابوہریرۃ کی احادیث اور قضایائے حضرت عمر کے حافظ شمار ہوتے تھے۔ خود انھوں نے بہت صحابہ کو دیکھا اور ان سے روایت کی اور ان سے بھی بہت لوگوں نے روایت کی۔ وہ امام زہری کے شیوخ میں سے ہیں خود ان کا قول ہے کہ میں نے چالیس حج کیے۔ اپنی

۱۲۱ : ۱۳۱ منصور عباسی۔ ابو جعفر عبداللہ بن محمد، عباسی خاندان کا دوسرا خلیفہ، اپنے بڑے بھائی عبداللہ السفّاح کے بعد ۴۱ سال کی عمر میں (۱۳۶ھ/۷۵۴ء میں) تخت نشین ہوا۔ اگرچہ عباسی حکومت سفاح کے زمانے ہی میں کافی مضبوط ہوگئی تھی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کا استحکام منصور کے ہاتھوں ہوا؛ دارالخلافہ بغداد اسی کا بسایا ہوا ہے۔ اس نے اندرونی اور بیرونی سازشوں کا قلع قمع کر دیا، لیکن اندلس کی اموی حکومت بھی عبدالرحمٰن الداخل نے اسی کے عہد میں قائم کی۔ اس کا ۶۳ سال کی عمر میں ۲۲ سال کی حکمرانی کے بعد ۱۵۸ھ/۷۷۴ء میں حج کے سفر میں بیر معونہ کے مقام پر انتقال ہوا۔ منصور کو علوم اور تصنیف و تالیف کا خاص شوق تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس کے زمانے میں مختلف علوم میں بیش بہا کتابیں لکھی گئیں۔

۱۲۱ : ۱۳۲ امام شافعی۔ ابو عبداللہ محمد بن ادریس، فقہ شافعی کے بانی، قریشی، ہاشمی، حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے رشتے دار تھے۔ ۱۵۰ھ/۷۶۷ء میں غزّہ میں پیدا ہوئے۔ کم سنی میں والد کی وفات کے باعث ابتدائی زمانہ بہت عُسرت میں گذرا۔ عربی زبان اور ادب جاہلی انھوں نے بدوؤں سے حاصل کیا اور فقہ و حدیث مسلم الزنجی اور سفیان بن عُیَینہ سے۔ انھیں موطا امام مالک زبانی یاد تھی۔ بعد کو وہ مدینے میں امام مالک کی خدمت میں بھی کئی سال تک رہے۔ پہلے وہ یمن میں سرکاری ملازم ہو کر گئے تھے، لیکن یہاں انھوں نے علویوں کی خلافِ حکومت سرگرمیوں میں حصہ لیا، تو گرفتار کر کے پابجولاں خلیفہ ہارون الرشید کے سامنے لائے گئے۔ بارے ہارون الرشید نے انھیں معاف کر دیا۔ اس کے بعد ان کا زیادہ زمانہ عراق، مصر اور حجاز کے سفروں میں گزرا۔ بالآخر ۲۰۰ھ/۸۱۵ - ۸۱۶ء میں وہ قاہرہ میں مقیم ہو گئے۔ یہیں چار برس بعد سلخ رجب ۲۰۴ھ/۲۰ جنوری ۸۲۰ء کو فسطاط (قاہرہ) میں واصلِ حق ہوئے۔ مدفن المقطّم پہاڑی کے دامن میں ایک خاص احاطے میں ہے۔ یزار و یتبرک۔ متعدد کتابیں ان سے یادگار ہیں، لیکن ان کی اصلی تعلیم کتاب الام میں ہے۔

باہر مقابر الشہدا میں دفن ہوئے تھے، لیکن یہ قبرستان دجلہ کے سیلاب میں دریا بُرد ہوگیا۔ امام احمد کی مسند مشہور مجموعۂ احادیث ہے؛ اس میں تقریباً تیس ہزار حدیثیں ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ اور رسائل بھی ان سے منسوب ہیں۔

۱۲۱ : ۱۲۷ معتصم باللہ۔ عباسی خلیفہ، ہارون الرشید کا منجھلا بیٹا، اپنے بڑے بھائی مامون کی وفات پر ۳۸ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا (۲۱۸ھ/۸۳۳ء)۔ بڑا بہادر اور جنگجو آدمی تھا۔ ترک اسی کے زمانے میں کاروبارِ سلطنت میں دخیل ہوئے، جس کا نتیجہ بعد کو خطرناک نکلا۔ حال آنکہ معتصم کو علم و فن سے کوئی لگاؤ نہیں تھا اور اس کی دین سے دلچسپی بھی سرسری تھی، لیکن اس نے خلقِ قرآن کے مسئلے میں مامون کی وصیت پر عمل کیا اور امام احمد بن حنبل پر بہت سختی کی؛ بلکہ اسے اس مسئلے میں بہت غلو ہوگیا تھا؛ حکم دے دیا کہ ابتدا ہی سے طلبہ کو خلقِ قرآن کی تعلیم دی جائے۔ تقریباً نو برس کی حکمرانی کے بعد ۲۲۷ھ/۸۴۱ء میں انتقال ہوا۔

۱۲۱ : ۱۲۸ سورۃ الاحقاف، ۴۶ : ۳۵ (جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا)

۱۲۱ : ۱۲۹ دیوانِ حافظ : ۱۹۹

۱۲۱ : ۱۳۰ امام ابوحنیفہ، نعمان بن ثابت، اہلِ سنت والجماعت کے سرخیل، فقہِ حنفی کے بانی، ان کے نسب سے متعلق روایات مختلف ہیں۔ ۸۰ھ/۶۹۹ء کے قریب پیدا ہوئے۔ انھوں نے حماد ابن ابی سلمان سے فقہ کی تعلیم پائی اور اس کے انتقال (۱۲۰ھ) کے بعد خود کوفہ میں مرجعِ خلائق ہوئے۔ فقہ میں ان کے رسوخ کا یہ نتیجہ ہوا کہ خلیفہ منصور عبّاسی نے انھیں بغداد کی قضاۃ پیش کی۔ امام نے اسے قبول کرنے سے انکار کردیا، تو اس نے انھیں قید خانے میں ڈال دیا اور طرح طرح کی سختیاں کرنے لگا۔ اسی حالت میں ۱۵۰ھ/۷۶۷ء میں انتقال ہوگیا۔ بغداد ہی میں محلّہ اعظمیہ میں مزار ہے۔ انھوں نے خود کوئی کتاب مرتب نہیں کی تھی؛ فقہِ حنفی کی بنیاد ان کے دو شاگردوں — قاضی ابو یوسف اور محمد الشیبانی (شیخین)، کی تالیفات پر ہے۔

جا سکتی ہے۔ آخر کے الفاظ کی دوسری مشہور قرأت 'شبر بشبر' بھی ہے۔

۱۲۳ : ۱۳۷ اشارہ ہے غالباً 'فمن اتقی الشبھات استبراء' کی طرف دیکھیے، بخاری (کتاب الایمان)، مسلم (کتاب المساقاۃ والمزارعۃ)۔ اس کے علاوہ یہ حدیث ابوداؤد، ابن ماجہ اور دارمی کے ہاں بھی ہے۔

۱۲۳ : ۱۳۸ ابن ماجہ، مقدّمہ : ۸۔ اس کے علاوہ دارمی کے مقدمہ (۱۷) میں بھی ہے۔

۱۲۳ : ۱۳۹ ابوداؤد (کتاب الملاحم) میں الفاظ ہیں : وما الوھن قال حُبّ الدنیا وکراھیۃ الموت۔ یہ حدیث مسند حنبل (۵ : ۲۷۸) میں بھی ہے۔

۱۲۶ : ۱۴۰ دیکھیے اسی خطبے کا حاشیہ (۹۷)

۱۲۷ : ۱۴۱ یہ مشہور حدیث ابوداؤد (کتاب الملاحم: ۱) کے علاوہ مسند حنبل میں بھی ملتی ہے (۲ : ۸۸)

۱۳۰ : ۱۴۲ ترمذی کے علاوہ یہ حدیث بعض دوسرے مجموعوں میں بھی ملتی ہے مثلاً بخاری (کتاب الجہاد و کتاب الاحکام)، مسلم (کتاب الامارۃ)، ابوداؤد (کتاب الجہاد) وغیرہ

۱۳۰ : ۱۴۳ خفیف اختلافِ الفاظ کے ساتھ یہ حدیث صحیح مسلم (کتاب الصلوٰۃ : ۶۲؛ کتاب المساجد : ۲۶) اور مسند ابن حنبل (۳ : ۲۴؛ ۵ : ۵۳) میں ملتی ہے۔

۱۳۰ : ۱۴۴ حدیث مسلم کے الفاظ ہیں : اذا کانوا ثلاثۃ فلیؤمھم احدھم (کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ) اس کے علاوہ یہ مسند ابن حنبل میں بھی ملتی ہے (۳ : ۳۴؛ ۵ : ۵۳)

۱۳۲ : ۱۴۵ سورۃ الزمر، ۳۹ : ۴۵ (بند ہو جاتا ہے دھڑکنا، ان لوگوں کے دل کا، جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے)

۱۳۵ : ۱۴۶ دونوں شعر نظیری کے ہیں (دیوان نظیری نیشاپوری : ۱۸۷، مطبوعہ دیوان

ان کے کئی رسالے جو الگ الگ شائع ہوئے ہیں، وہ دراصل اسی کتاب الام کے حصے ہیں۔

۱۲۱ : ۱۳۳ شیخ الاسلام احمد ابن تیمیہ۔ ان کے حالات کے لیے دیکھیے تذکرہ (حواشی ۳۸۱-۳۸۲ (ساہتیہ اکاڈمی ایڈیشن)

۱۲۲ : ۱۳۴ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی، شیخ فاروقی، سرہند میں ۹۷۱ھ / ۱۵۶۴ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد دارالخلافہ آگرہ آئے۔ یہ اکبری بدعتوں اور اختراعوں کا زمانہ تھا۔ ابوالفضل اور ان کے بڑے بھائی فیضی سے ان کے مراسم پیدا ہوئے، جس نے ان کے خیالات پر گہرا اثر کیا۔ انھوں نے شیعی عقائد کی مخالفت شروع کی جن کا شاہی دربار میں دور دورہ تھا؛ وہ خود حضرت خواجہ باقی باللہ کے سلسلۂ نقشبندیہ میں مرید تھے۔ ان کی ان مخالفانہ تحریروں سے دربارِ جہانگیر کے شیعی امرا نے ناراض ہو کر بادشاہ کے کان بھرے، جس پر یہ ۱۰۲۸ھ / ۱۶۱۹ء میں قلعہ گوالیار میں قید کر دیے گئے۔ سال بھر بعد نہ صرف جہانگیر نے انھیں آزاد کر دیا، بلکہ اپنی فوجوں کے ساتھ رہنے کا حکم دیا۔ ۱۰۳۴ھ / ۱۶۲۴ء میں انتقال ہوا۔ سرہند میں مزار مرجع خواص و عوام ہے۔ ان کے مکتوبات کے مجموعے علوم کا خزانہ ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد رسائل مختلف موضوعات پر چھپ چکے ہیں۔

۱۲۲ : ۱۳۵ جہانگیر۔ خاندانِ مغلیہ کا مشہور فرمانروا، ۳۰ اگست ۱۵۶۹ء کو سیکری میں پیدا ہوا؛ اور اپنے والد اکبر کی وفات پر ۲۴ اکتوبر ۱۶۰۵ء کو تخت پر بیٹھا کشمیر سے واپس آرہا تھا کہ بھیمبر کے مقام پر، ۷ نومبر ۱۶۲۷ء کو وفات پائی۔ مقبرہ لاہور کے قریب شاہدرہ میں ہے۔

۱۲۳ : ۱۳۶ یہ مشہور متفق علیہ حدیث بخاری (کتاب الاعتصام بالسنہ نیز کتاب الانبیاء) اور مسلم (کتاب العلم) کے علاوہ تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ ترمذی (کتاب الفتن) اور ابن ماجہ (کتاب الفتن) میں بھی دیکھی

بنائی تھی، جس نے ۱۹۳۶ء کے انتخاب میں حصہ لیا؛ کانگریس کے بعد سب سے زیادہ اسی کے امیدوار کامیاب ہوئے تھے۔ اور جب کانگریس نے وزارت بنانے سے انکار کر دیا، تو انڈی پنڈنٹ پارٹی ہی نے وزارت کی تشکیل کی تھی۔
ان کی حب الوطنی اور معاملہ فہمی اور آزادہ روی کے سب قائل تھے۔
۱۸ نومبر ۱۹۴۰ء (۱۷ شوال ۱۳۵۹ھ) کو انتقال کیا۔ پھلواری شریف (پٹنہ) میں دفن ہوئے۔

## ۶۔ خطبۂ صدارت: جمعیۃ العلمائے ہند

۱۳۹ : ۱ یہ ایک طرح سے اس سے پیشتر کے خطبے ہی کا آخری حصہ ہے۔ ہوا یہ کہ مجلسِ استقبالیہ کے اصرار پر مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنا خطبہ قلمبند کرکے ان کے پاس بھیج دیا، جو چھپ گیا؛ اور اجلاس میں تقسیم ہوا اور پڑھا گیا لیکن مولانا کی جولانیِ طبع اس پر قانع نہ رہ سکی۔ مطبوعہ خطبے کے اختتام کے بعد، انھوں نے اس خطبے (۶) سے فی البدیہہ حاضرین کو خطاب کیا۔

۱۵۱ : ۲ حسرت موہانی۔ حضرت امام علی موسیٰ رضا کی نسل میں، سیّد اظہر حسن کے بیٹے، سیّد فضل الحسن حسرت موہانی، اُردو غزل کے مشہور شاعر، سیاست کے میدان میں بھی کچھ کم ممتاز نہیں تھے۔ ۱۸۷۵ء میں موہان، ضلع اناؤ (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۳ء میں ایم اے او کالج، علی گڈھ سے بی اے کی سند لی۔ اس کے بعد "اردوے معلّٰی" ماہانہ جاری کیا۔ سیاست سے دلچسپی کالج کے زمانے سے تھی؛ چنانچہ اس میں ادبی مضامین کے علاوہ سیاسی مضمون بھی شائع ہونے لگے۔ ایسا ہی ایک مضمون حکومتِ وقت کی نظر میں قابلِ اعتراض ٹھہرا۔ مقدمہ چلا، اور انھیں سزائے قید ہو گئی۔
ساری عمر مجاہدانہ اور درویشانہ گذری۔ مذہب اور تصوّف سے بھی بیحد

میں شعرِ اوّل کے مصرع ثانی میں 'رود' کی جگہ 'رسد' ہے اور شعرِ دوم کے مصرع اوّل میں 'الفت' کی جگہ 'غیرت' اور 'نظر در کن' کی جگہ 'تماشا کن'؛ اور مصرع ثانی میں 'و تن با' کی جگہ 'با تن' ملتا ہے۔ دیوان کے نسخہ' لاہور (مبارک علی) میں 'پنہانش' کی جگہ 'پہنایش' ملتا ہے۔

۱۳۵ : ۱۴۷ ابو العلا المعری کا شعر ہے (شروح سقط الزند ۳: ۱۲۲۸) دیوان میں 'بالخیف' کی جگہ 'بالحزن' ہے۔

۱۳۵ : ۱۴۸ سورۃ النجم، ۵۳: ۲۸ (اور حق کے مقابلے میں ظن کی کوئی حقیقت نہیں ہے)

۱۳۶ : ۱۴۹ سورۃ ابراہیم، ۱۴: ۲۰؛ نیز سورۃ فاطر، ۳۵: ۱۷ (اور یہ بات اللہ کے لیے کیا مشکل ہے)

۱۳۸ : ۱۵۰ مولانا ابو المحاسن محمد سجّاد۔ ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۲ء) میں پنہہ (ضلع پٹنہ، بہار) میں پیدا ہوئے۔ اچھے خاصے خوشحال خاندان کے فرد تھے، لیکن افتادِ طبع کے صدقے کبھی جاداد کی دیکھ بھال نہ کی۔ نجی تعلیم کے بعد مدرسۂ اسلامیہ' بہار میں پڑھتے رہے۔ دار العلوم دیوبند بھی گئے، لیکن چھ مہینے بعد ہی یہاں سے جی اچاٹ ہو گیا؛ چنانچہ تکمیل مدرسۂ سبحانیہ، الٰہ آباد میں کی۔ پھر وہیں مدرّس مقرر ہو گئے۔ کچھ مدت بعد وطن واپس آئے، تو گیا میں مدرسۂ انوار العلوم قائم کیا۔ آدمی مجاہد اور سراسر عملی تھے، سینے میں دلِ درد مند تھا۔ جمعیۃ العلماء ہند کے قیام (۱۹۱۹ء) سے بھی پہلے ۱۹۱۷ء میں انجمن علمائے بہار قائم کی؛ ۱۹۲۱ء میں امارتِ شرعیہ بہار کی تشکیل کی، جو آج تک سرگرمِ کار ہے۔ اور اس میں بیت المال، دار القضاء، دار الافتاء، شعبۂ تنظیم و تبلیغ، شعبۂ تحفظ المسلمین وغیرہ پوری مستعدی سے کام کر رہے ہیں۔

۱۹۳۰ء میں جمعیۃ العلماء ہند نے ایک جنگی کونسل بنائی تھی، اس کے روحِ رواں بھی مولانا محمد سجاد ہی تھے۔ انھوں نے بہار میں ایک نئی انڈی پنڈنٹ پارٹی

ثمرہ ہیں: ایشیائی روس (۱۸۸۹ء)، ایران (۱۸۹۲ء)، مشرقِ بعید کے مسائل (۱۸۹۴ء) اب وہ وزارتِ خارجیہ میں داخل ہوگیا۔ اس کی قابلیت اور معاملہ فہمی کا یہ ادنیٰ ثبوت ہے کہ ۱۸۹۸ء میں جب اس کی صرف ۳۹ برس کی عمر تھی، وہ ہندستان کا وائسرائے مقرر ہوا۔ یہاں اس کا دورِ حکومت کئی لحاظ سے بہت اہم رہا۔ نظامِ حکومت میں کئی اصلاحات نافذ ہوئیں۔ فرنٹیر کا صوبہ اسی نے بنایا تھا بنگال کی تقسیم (پہلی) بھی اسی کے زمانۂ حکومت میں ہوئی تھی (۱۹۰۵ء) سپہ سالارِ افواجِ ہند لارڈ کچنر سے اختلاف کے باعث اسے مستعفی ہونا پڑا اور وہ انگلستان واپس چلا گیا (۱۹۰۵ء)۔ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء-۱۹۱۸ء) میں وہ لائڈ جارج کی وزارت میں شامل تھا؛ اور جنگ کے بعد ۱۹۱۹ء میں وزیرِ خارجیہ مقرر ہوا۔ لوزان کے صلحنامے پر انگریزوں کی طرف سے اسی نے دستخط کیے تھے۔ وہ بلا شبہہ اپنے زمانے کے قابل ترین اشخاص میں سے تھا۔

۲۰ مارچ ۱۹۲۵ء کو انتقال ہوا۔

۱۶۵ : ۳ ولسن، ٹامس ووڈرو: ۲۸ دسمبر ۱۸۵۶ء کو سٹانٹن (ریاست ورجینیا) کے مقام پر پیدا ہوا۔ چندے وکالت کی، لیکن پھر معلمی پیشہ اختیار کر لیا۔ بعد کو سیاست میں داخل ہوگیا۔ ۱۹۱۲ء میں، اور پھر ۱۹۱۶ء میں ڈیموکریٹک پارٹی کے امیدوار کی حیثیت سے ریاستہائے متحدہ امریکا کا صدر منتخب ہوا۔ پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء-۱۹۱۸ء) اسی کی صدارت کے زمانے میں ہوئی تھی۔ اس سے پہلے امریکا ہمیشہ یورپ کے لڑائی جھگڑے سے الگ تھلگ رہا تھا؛ اس جنگ میں امریکا کی شمولیت بہت حد تک ولسن کے ذاتی اثر کا نتیجہ تھی۔ جنگ کے بعد صلح کی گفت وشنید میں اس کا بہت حصہ رہا اور اس کے چودہ نکات اس کی بنیاد قرار پائے۔ پہلی جمعیۃ اقوام (لیگ آف نیشنز) کی تشکیل بھی اسی کی مرہونِ منّت ہے؛ لیکن بحیثیتِ مجموعی وہ بہت ناکام رہا۔ کئی کتابیں بھی تصنیف کیں۔ ان میں سے بیشتر قانون کے موضوعات پر ہیں۔ بقیہ میں سے

شغف تھا۔ آخری عمر میں کئی سال تک بلا ناغہ متواتر حج کیے، اور بیشتر پاپیادہ۔ ایسا بے غرض اور بے ریا آدمی دیکھنے میں نہیں آیا۔ ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء کو اللہ کو پیارے ہوئے۔ انوار باغ، فرنگی محل، لکھنؤ میں اپنے پیر مولانا عبدالوہاب کے پائیں سپردِ خاک ہوئے۔

## ۷۔ اجلاسِ خصوصی، انڈین نیشنل کانگریس

۱۶۴ : ۱ عصمت انونینو۔ مشہور ترکی فوجی جرنیل اور سیاستدان، ۲۴ ستمبر ۱۸۸۴ء کو ازمیر (سمرنا) میں پیدا ہوئے۔ پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴ء۔ ۱۹۱۸ء) میں شاندار خدمات کے باعث وہ اتاترک مصطفٰی کمال پاشا کے دستِ راست بن گئے۔ یونان کے خلاف لڑائی میں فوج کی کمان انھیں کے ہاتھ میں تھی۔ اور انھوں نے ۱۹۲۱ء میں انونیو کے مقام پر انھیں دو مرتبہ شکست فاش دی (اسی لیے بعد کو انھوں نے انونیو کو اپنے نام کا جزو بنالیا)۔ ترکی کی طرف سے لوزان کے صلحنامے پر انھیں نے دستخط کیے تھے۔ جب خلافت کی تنسیخ کے بعد ترکی جمہوریہ بن گیا، تو وہ اس کے پہلے وزیر اعظم مقرر ہوئے (۱۹۲۳ء)، لیکن صحت کی خرابی کے باعث انھیں سال بھر بعد مستعفی ہونا پڑا۔ چندے بعد وہ دوبارہ وزیر اعظم بنا دیے گئے (۱۹۲۵ ۔ ۱۹۳۷ء)۔ اس کے بعد ۱۹۳۸ء سے ۱۹۵۰ء تک وہ صدر جمہوریہ ترکی رہے۔ ۱۹۶۱ء میں وہ تیسری مرتبہ وزیر اعظم بنے اور چار سال تک اس عہدے پر متمکّن رہے۔ ان کا ۲۵ دسمبر ۱۹۷۳ء کو انقرہ میں انتقال ہوا اور تین دن بعد اتاترک کے مقبرے میں دفن ہوئے۔

۱۶۴ : ۲ کرزن، جارج نتھانیل، مارکوئیس کرزن آف کڈلیسٹن۔ مشہور انگریز سیاستدان اور ہندستان کا وایسرائے، ۱۱ جنوری ۱۸۵۹ء کو پیدا ہوا۔ ۱۸۸۶ء میں برطانوی پارلیمنٹ کا رکن چنا گیا۔ ۱۸۸۷ء میں اس نے ایشیائی اور مشرقی ممالک کا طویل سفر کیا۔ اس کی تین مشہور کتابیں اسی سیر و سیاحت کا

۱۱۲۳ء میں نیشاپور میں انتقال ہوا۔

۱۷۲ : ۸ وکٹر ہیوگو : فرانسیسی شاعر، ناول نگار اور فلسفی، ۲۶ فروری ۱۸۰۲ء کو پیدا ہوا۔ اس کے والد جرنیل جوزف لیوپولڈ ہیوگو، نپولین اعظم کے بھائی جوزف نپولین کے درباریوں میں تھے، جو پہلے ناپولی اور بعد کو اسپین کے حکمران بنے۔ چنانچہ وکٹر بھی بچپن میں ان کے ساتھ اسپین گیا اور دس برس کی عمر تک اس کی تعلیم وہیں ہوئی۔ اس کے بعد حالات کی مجبوری سے خاندان واپس پیرس چلا آیا۔ یہاں اس کی تعلیم پر خاطر خواہ توجہ نہ دی جا سکی۔ بالآخر اسے اسکول بھیجا گیا۔ یہاں اپنی صغر سنی کے باوجود اس نے ایسی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا کہ لوگ دنگ رہ گئے۔ ۱۴ برس کی عمر میں وہ شعر اور نثر لکھنے لگا۔ اس کی ۱۵ برس کی عمر تھی کہ اس کی ایک نظم پر فرانس کی اکیڈیمی نے خوشنودی کا اظہار کیا؛ اور دو سال بعد ۱۷ برس کی عمر میں اسے نظم کا اوّل انعام ملا۔ اس کی بعض کتابیں دنیا کے کلاسیکی ادب میں شمار ہوتی ہیں مثلاً لے مزیرابل، نوٹر دام کا کبڑا، ہنسنے ہنسانے والا وغیرہ؛ اس کی متعدد کتابوں کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے۔ ۲۱ مئی ۱۸۸۵ء کو پیرس میں انتقال ہوا۔

۱۷۳ : ۹ ابن خلدون، عبدالرحمٰن : عرب مؤرخ اور ماہرِ معاشیات ۲۷ مئی ۱۳۳۲ء کو ٹیونس میں پیدا ہوا۔ اس کا خاندان حضرموت سے ہجرت کر کے اشبیلیہ (اندلس) میں بس گیا تھا۔ شروع میں وہ چندے سلطانِ فیض کی ملازمت میں رہا۔ لیکن یہاں اس پر خیانت کا الزام لگایا گیا، جس پر اسے دو برس قید خانے میں بسر کرنے پڑے۔ رہائی کے بعد وہ غرناطہ چلا گیا۔ اس نے زندگی کے بہت نشیب و فراز دیکھے اور انجامِ کار قاہرہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی، جہاں وہ کئی مرتبہ قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز رہا۔ یہیں اس کا ۱۹ مارچ ۱۴۰۶ء کو انتقال ہو گیا۔

اس کی شہرت کا ایوان "مقدمہ" پر قائم ہے، جو دراصل اس کی بڑی تصنیف "کتاب العبر"

جارج واشنگٹن کی سوانح عمری (۱۸۹۶ء) اور امریکی قوم کی ایک تاریخ (۱۹۰۲ء) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۶۵ : ۴ وہ وعدے یا عہد نامے جو کوئی ملک : غیر ملکی حکومتوں یا ان کی رعایا کو اپنے ہاں خاص حقوق یا مراعات و اختیارات عطا کرنے کو کرتا ہے۔ خلافتِ عثمانیہ کے زمانے میں جب ترکی کمزور تھا، اس نے بھی متعدد یورپی ممالک کے ساتھ ایسے معاہدے کر رکھے تھے۔ اتاترک نے برسرِ اقتدار آتے ہی یہ سب منسوخ کر دیے تھے۔

۱۶۶ : ۵ مصطفیٰ کمال، اتاترک : ۱۸۸۱ء میں سالونیکا میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۹ء میں ترکی نوجوانوں نے جو قومی تحریک ملکی اصلاحات کی شروع کی تھی، وہ اس کے سربراہ تھے۔ ۱۹۱۴ء ۔ ۱۹۱۸ء کی عالمی جنگ میں وہ ترکی فوج کے جرنیل تھے۔ جنگ کے خاتمے کے بعد انھوں نے خلافت منسوخ کر دی اور ترکی کو جمہوریہ میں تبدیل کر دیا؛ وہ خود اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ انھوں نے ملک کے نظم و نسق میں بہت اہم تبدیلیاں کیں اور اسے عصری تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق منظم کرنے کی کوشش کی۔ وہی موجودہ ترکی کے بانی اور معمار ہیں۔
۱۰ نومبر ۱۹۳۸ء کو انتقال ہوا

۱۶۹ : ۶ گاندھی، موہن داس کرم چند (مہاتما) : ولادت : پوربندر، ۲ اکتوبر ۱۸۶۹ء وفات : دلّی، ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء (ایک قاتل کی گولی کا نشانہ بنے)

۱۷۲ : ۷ عمر خیام : تقریباً ۱۰۵۰ء میں پیدا ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری ان کے دونِ مرتبہ ہے، اگرچہ آج ان کی شہرت کا ایوان ان کی رباعیات کی بنیاد ہی پر قائم ہے، وہ ہیئت دان اور ماہرِ ریاضی کی حیثیت سے کچھ کم قابلِ ذکر نہیں حقیقتہً وہ مغربی ممالک میں ریاضی کے عالم ہی کی شکل میں متعارف تھے، جب ۱۸۵۹ء میں فٹ جیرالڈ نے ان کی ۷۵ رباعیوں کا انگریزی ترجمہ شائع کیا۔ اس کے بعد ان کی شہرت رباعی نگار کی حیثیت میں کہیں زیادہ ہوگئی۔

دانشوروں اور عالموں پر اس کا بہت اثر تھا۔ اس نے ۲۴ ستمبر ۱۰۵۴ء کو رحلت کی۔
اس نے کئی مذہبی رسالے لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ اسے ریاضی، ہیئت اور موسیقی سے بھی بہت شغف تھا۔ وہ خود گھڑیاں اور دوسرے وغیرہ بنا لیتا تھا۔
اس کی سب سے مشہور کتاب (لاتینی) "۱۰۵۴ء تک کے حالات" ہے (بعد کو اس کے شاگرد بر تولڈ نے ۱۰۶۶ء تک کے حالات مرتّب کر کے اس میں شامل کر دیے تھے) اس کا ترجمہ مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔ مولانا آزاد غالباً اسی کتاب کا حوالہ دے رہے ہیں۔

۱۷۷ : ۱۳ باردولی: یہاں باردولی سے اشارہ ہماری تحریکِ آزادی کے ایک اہم واقعے کی طرف ہے:
آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس دلی منعقدہ نومبر ۱۹۲۱ء میں یہ قرارداد منظور ہوئی تھی کہ گاندھی جی کی قیادت میں ملک گیر سول نافرمانی کی تحریک چلائی جائے اور اس کا آغاز باردولی سے ہو (جو کہ صوبہ بمبئی میں ضلع سورت کی ایک تحصیل تھی) بعد کو کانگریس کے سالانہ اجلاس احمد آباد (دسمبر ۱۹۲۱ء) نے اس کی توثیق کر دی۔
اس قرارداد کے مطابق اواخر جنوری ۱۹۲۲ء میں اس تحریک کا آغاز ہوا۔ بدقسمتی سے جلد ایک افسوسناک واقعہ رونما ہوا جس سے یہ تحریک واپس لینا پڑی۔
۵ فروری (۱۹۲۲ء) کو کانگریس کا ایک جلوس چورا چوری کے مقام پر (جو گورکھپور (یوپی) کے قریب ایک قصبہ ہے) جا رہا تھا کہ سامنے سے پولیس کے کچھ افراد آگئے، ان میں ۲۱ سپاہی تھے اور ایک تھانیدار۔ ہجوم نے ان کا پیچھا کیا جس پر پولیس کے لوگوں کو تھانے کی عمارت میں پناہ لینا پڑی۔ بھیڑ نے چوکی کو

کا دیباچہ ہے۔ مقدمے کا دنیا کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ ملتا ہے۔ اس میں اس نے بڑی ژرف نگاہی اور غور و فکر سے قوموں کے عروج و زوال کا فلسفہ بیان کیا ہے، جو تحقیق و فلسفۂ جدید سے بھی اتنا قریب اور صحیح ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ آج سے ساڑھے چھ سو برس پہلے یہ باتیں اس کے دماغ میں کیونکر آئیں، جب کہ نتائج اخذ کرنے کے لیے اتنا کم مواد مہیا تھا۔

۱۷۳ : ۱۰ لی بان، گستاو: مشہور فرانسیسی طبیب اور نفسیاتِ اجتماعی کا ماہر، ۷ مئی ۱۸۴۱ء کو پیدا ہوا۔ اس نے زندگی طبیب کی حیثیت سے شروع کی۔ ۱۸۸۴ء میں وہ بدھ مت کے آثارِ قدیمہ کی تحقیق کے لیے ہندستان آیا۔ واپسی پر اس نے ایک کتاب لکھی: آثار الہند (فرانسیسی)، جو ۱۸۹۱ء میں شائع ہوئی۔ اسی دوران میں اس نے نفسیاتِ اجتماعی کا مطالعہ شروع کیا اور اس کے بعد اس موضوع پر متعدد کتابیں تصنیف کیں، جن میں سے بعض کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ بعض قوموں میں کچھ خصوصیات ایسی ہوتی ہیں کہ وہ لامحالہ ترقی کی دوڑ میں دوسروں سے آگے نکل جاتی اور بالآخران پر حکمران بن جاتی ہیں۔ وہ تاریخ اور تمدن کے ارتقا میں جذبات کی اہمیت کا قائل تھا۔ عام طور پر بعد کے علما نے اس کے نظریوں کی تردید کی ہے؛ لیکن اس کی کتابیں غالباً اپنی جدت کے باعث بہت دن تک فرانس اور یورپ کے دوسرے ممالک میں مقبول رہیں۔

اس کا ۱۳ دسمبر ۱۹۳۱ء کو پیرس کے مضافات کے ایک قصبے میں انتقال ہوا۔

۱۷۳ : ۱۱ Psychology نفسیات

۱۷۴ : ۱۲ ہرمن: اس سے غالباً ہرمن رائش ناوی مراد ہے، جو بعض اوقات ہرمن لنگ بھی کہلاتا ہے۔ وہ ایک امیر گھرانے میں ۱۰۱۳ء میں پیدا ہوا۔ وہ اپنے زمانے کا ممتاز عالم اور مؤرخ تھا۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد اس نے دنیا ترک کر دی، اور راہب بن کر "رائش نو" کے راہب خانے میں رہنے لگا۔ اپنے زمانے کے

مقدمہ چلا۔ عدالت نے موت کی سزا دی اور اس نے زہر کا پیالہ پی لیا، حال آنکہ اس کے دوستوں نے اس کے قیدخانے سے فرار کا انتظام کر لیا تھا۔ اس کا جواب تھا: فیصلہ حقائق کے خلاف ہے، لیکن چونکہ یہ ایک جائز اور قانونی عدالت نے دیا ہے، اس لیے اس کی تعمیل لازمی ہے۔

۱۸۰ : ۱۸ "یروشلم کی صلیب" سے حضرت عیسیٰ مسیح کے واقعۂ صلیب کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ انھوں نے صداقت کے ترک کرنے کے مقابلے میں سُولی پر لٹکنا قبول کر لیا۔

: ۱۹ "مکّے کی گلیوں" سے وہ مظالم مراد ہیں، جو رسولِ اسلام صلعم کے مخالفوں نے ان پر تیرہ برس کے قیامِ مکّہ میں اس لیے توڑے کہ وہ اپنی دعوت سے دست بردار ہو جائیں۔ انھوں نے سمجھوتہ کرنے سے انکار کر دیا؛ اور بالآخر انھیں ۶۲۲ء میں ہجرت کر کے مدینہ جانا پڑا۔

۱۸۰ : ۲۰ سیویرس: لوسی اُس سپٹی میئس سیورلیس ان کا پورا نام تھا۔ روما کے شہنشاہ تھے۔ انھوں نے ایسی ہوشیاری سے کام لیا کہ لوگوں کو انھیں بادشاہ تسلیم کرنے کے سوائے کوئی چارہ نہ رہا۔ ہوا یہ کہ جب مارچ ۱۹۳ء میں شہنشاہ پرٹی نیکس کو فوجیوں نے قتل کر دیا، تو جولیانوس نے شہنشاہیت کا خلعت خرید لیا۔ جونہی سیورلیس کو اس کی خبر ملی، انھوں نے ٹھان لی کہ وہ جولیانوس کو تخت سے اتار دینگے۔ اس کے لیے انھوں نے اول ایلبی نوس سے گٹھ جوڑ کیا، جو روما کی برطانی فوجوں کی کمان سنبھالے ہوئے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے روما پر چڑھائی کر دی۔ جب روما میں جولیانوس کے ساتھیوں کو سیورلیس کی تاخت کی اطلاع ملی، تو انھوں نے جولیانوس کا ساتھ چھوڑ دیا اور اسے قتل کر دیا۔ اس طرح میدان صاف ہو گیا اور سیورلیس فاتحانہ روما میں داخل ہو گئے۔ لیکن جب تک ایلبی نوس زندہ تھا، وہ بلا شرکتِ غیرے روما کے شہنشاہ نہیں بن سکتے تھے۔ اولاً انھوں نے اسے قتل کرانے کی کوشش کی۔ جب اس میں ناکام رہے

آگ لگا دی، جس میں تمام سپاہی اور تھانیدار جل کر راکھ ہو گئے۔
قدرتاً گاندھی جی کو تشدّد کے ان واقعات سے بہت صدمہ ہوا کہ یہ ان کے بنیادی اصولوں کے خلاف تھے۔ اس کے علاوہ انھیں دنوں بمبئی اور مدراس میں بھی اسی طرح کے تشدّد کے حادثات پیش آچکے تھے۔
اس پر انھوں نے ۱۲ فروری ۱۹۲۲ء کو باردولی میں کانگریس کی مجلسِ عاملہ کا جلسہ بلایا، جس نے گاندھی جی کی تجویز پر تحریک کے منسوخ کرنے کی قرارداد منظور کرلی۔
کانگریس اور گاندھی جی کے اس اقدام پر لوگوں کو بہت مایوسی ہوئی تھی۔ بعض رہنماؤں نے (مثلاً پنڈت موتی لال نہرو، لالہ لاجپت رائے وغیرہ) گاندھی جی پر اعتراض کیا تھا کہ اگر کسی جگہ کے لوگوں نے غلطی کی ہے، تو اس کے لیے پورے ملک کو کیوں سزا دی جائے (تاریخ کانگریس (انگریزی)، ۱ : ۲۳۳-۲۳۷)

۱۷۹ : ۱۴ نون کواپریشن = Non Co-operation = ترکِ موالات

۱۸۰ : ۱۵ کواپریشن = Co-operation = موالات

۱۸۰ : ۱۶ سول ڈس اوبیڈیینس Civil Dis-obedience سول نافرمانی۔

۱۸۰ : ۱۷ سقراط، مشہور یونانی حکیم اور فلسفی، تقریباً ۴۷۰ قبلِ مسیح پیدا ہوا۔ اس نے خود کچھ نہیں لکھا، لیکن اس کے شاگردِ رشید افلاطون نے اپنے مکالمات میں سقراط کے فلسفے کو خاصی تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔ اگرچہ بعض اصحاب نے شبہہ ظاہر کیا ہے کہ یہ افلاطون کے اپنے خیالات اور نظریات ہیں، جو اس نے سقراط سے منسوب کر دیے ہیں۔
۳۹۹ قبلِ مسیح اس پر (۱) قوم کے نوجوانوں کو گمراہ کرنے اور (۲) دیوتاؤں سے بے پروائی برتنے اور (۳) مذہبی بدعتوں کے ارتکاب کے الزام میں

۱۸۱ : ۲۴ Protest احتجاج ۔

۱۸۱ : ۲۵ روزویلٹ ۔ اس سے امریکا کے صدر تھیوڈور روزویلٹ مراد ہیں، جو ۲۷ اکتوبر ۱۸۵۸ء کو نیویارک میں پیدا ہوئے ۔ وہ وکالت کا پیشہ اختیار کرنا چاہتے تھے، لیکن اس میں دل نہ لگا، اور سیاسیات میں داخل ہو گئے، اور جمہوری (ری پبلکن) پارٹی کے نمایندے کی حیثیت سے نائب صدر چنے گئے اتفاق دیکھیے کہ ۶ ستمبر ۱۹۰۱ء کو صدر میک کنلی گولی کا نشانہ بنے اور اسی دن تھیوڈور روزویلٹ (۲۶ ویں) صدر کے عہدے پر فائز ہو گئے ۔ جب میعاد ختم ہوئی، تو انھیں دوبارہ اس عہدے کے لیے منتخب کیا گیا ۔ ان کا عہد مختلف قسم کی اصلاحات کے لیے مشہور ہے ۔ انھوں نے بڑے بڑے اکھٹی اداروں اور افراد کی طاقت اور رسوخ کے انتظامیہ میں کم کرنے کی کامیاب کوشش کی ۔ بین الاقوامی معاملات میں وہ امن پسند تھے ۔ چنانچہ ۱۹۰۶ء میں انھیں امن کا نوبل انعام دیا گیا ۔ ان کی وجہ سے امریکا کا اقتدار اور عالمی مقام بہت بلند ہوا ۔ مارچ ۱۹۰۹ء میں وہ صدارت سے سبکدوش ہوئے ۔

کچھ وقفے کے بعد وہ دوبارہ سیاست میں داخل ہوئے ۔ لیکن اب کے وہ ووڈرو ولسن کے مقابلے میں ہار گئے ۔ پہلی جنگِ عظیم میں امریکہ شامل نہیں ہوا تھا ۔ روزویلٹ شروع سے اس کے حق میں تھے ۔ بالآخر امریکا ۱۹۱۷ء میں اتحادیوں کی طرف سے جنگ میں داخل ہو گیا ۔ جنگ تو اتحادیوں نے جیت لی، لیکن دن رات کی محنت نے روزویلٹ کی صحت تباہ کر دی تھی ۔ ان کا ۶ جنوری ۱۹۱۹ء کو انتقال ہوا ۔ بلاشبہ وہ آج کے امریکا اور اس کی پالیسیوں کے بنانے والے تھے ۔

۱۸۲ : ۲۶ ہمبرٹ اول، شاہِ اطالیہ جو اپنے والد وکٹر عمانوئل ثانی کی وفات پر جنوری ۱۸۷۸ء میں تخت نشین ہوا، ۱۴ مارچ ۱۸۴۴ء کو ٹیورن (اطالیہ) کے مقام پر پیدا ہوا تھا ۔ اس کی تعلیم بہت معمولی تھی اور اسے سپاہیانہ زندگی کے علاوہ اور کسی چیز سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی ۔ کہا جا سکتا ہے کہ اطالیہ میں ملوکیت

تو اس کے خلاف لڑائی چھیڑ دی، جس میں نہ صرف ایلبی نوس کو شکست ہوئی، بلکہ وہ میدان میں کام آیا۔ اس کے بعد کوئی مدِّمقابل نہ رہا، اور وہ چین سے حکومت کرنے لگے۔

اس کے بعد انھوں نے ایشیا کا بیشتر علاقہ فتح کر کے اپنی سلطنت میں ملا لیا۔ وہ اسکندریہ میں تھے کہ انھیں برطانیہ میں بغاوت کی خبر پہنچی۔ وہ واپس آئے اور سرکشی کو فرو کر کے انھوں نے جزیرے کے شمال میں ایک سدّ تعمیر کرا دی تاکہ کلدونی فوجیں آسانی سے حملہ نہ کر سکیں۔

لیکن اب لمبے عرصے تک کثرتِ کار کے باعث ان کی صحت خراب رہنے لگی۔ بالآخر تقریباً اٹھارہ سال کی حکومت کے بعد ۴ فروری ۲۱۱ء کو ان کا ۶۶ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ ان کا قول تھا کہ میں نے اپنی زندگی میں وہ سب کچھ کیا اور دیکھا، جس کی کسی انسان کو تمنا ہو سکتی ہے، لیکن اس کے باوجود میں بالکل ہیچ ہوں۔

۱۸۰ : ۲۱ ترتولیَن: آگسٹین کے بعد عیسائی کلیسا کے بارے میں لکھنے والا سب سے بڑا مصنف۔ تقریباً ۱۵۰ء میں قرطاجنہ (شمالی افریقہ) میں پیدا ہوا۔ بہت اعلیٰ تعلیم پائی۔ اسے لاتینی اور یونانی — اس زمانے کی علمی زبانیں — دونوں پر ماہرانہ قدرت حاصل تھی۔ آج عیسائیت سے متعلق جو کچھ لاتینی زبان میں ہے، اس کا سلسلہ بہت حد تک اس کی تحریروں میں ملتا ہے۔ اس کی موت تقریباً ۲۲۲ء میں ہوئی۔

۱۸۰ : ۲۲ Conflict Between Religion and Science

ڈریپر کی مشہور تصنیف ہے۔ اس کا اردو ترجمہ مولانا ظفر علی خان نے "معرکۂ مذہب و سائنس" کے عنوان سے کیا تھا؛ یہ چھپ چکا ہے۔

۱۸۱ : ۲۳ ٹالسٹائی، کاؤنٹ لیو نکولائیوِیچ: ولادت، یسنا پولیانا ۲۸ اگست (۹ ستمبر) ۱۸۲۸ء؛ وفات، یسنا پولیانا نومبر ۱۹۱۰ء۔ تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے غبارِ خاطر (ساہتیہ اکاڈمی ایڈیشن): ۳۴۳-۳۴۴

ترمیمی قانون

۱۹۳ : ۳۵ Defensive Civil-Disobedience
اندفاعی سول نافرمانی

۱۹۵ : ۳۶ Discipline نظم و ضبط

۱۹۵ : ۳۷ Majority اکثریت، بڑی تعداد

۳۸ Movement تحریک

۳۹ Worker

۴۰ Volunteer

۲۰۹ : ۴۱ حضرت مسیح کے الفاظ یہ ہیں:

اگر تم آدمیوں کے قصور معاف کروگے، تو تمھارا آسمانی باپ بھی تم کو معاف کریگا۔ اور اگر تم آدمیوں کے قصور معاف نہ کروگے تو تمھارا باپ بھی تمھارے قصور معاف نہ کریگا (متّی، ۶ : ۱۴-۱۵)

دوسری جگہ فرمایا:

تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ اپنے پڑوسی سے محبت رکھ اور اپنے دشمن سے عداوت۔ لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے لیے دعا کرو (متّی، ۵ : ۴۳-۴۴)

نیز لیکن میں تم سننے والوں سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو جو تم سے عداوت رکھیں، ان کا بھلا کرو (لوقا، ۶ : ۲۷؛ نیز ۶ : ۳۵)

## ۸ ۔ آل انڈیا خلافت کانفرنس، کانپور

۲۱۳ : ۱ Reaction ردِّ عمل، ردِّ فعل

۲۱۳ : ۲ مذہب ہر ایک کا الگ ہوتا ہے، لیکن وطن سب کے لیے ہے۔

کے خلاف جو جذبہ پیدا ہوا، اس نے اسی کے عہد میں طاقت پکڑی۔ ۲۹ جولائی ۱۹۰۰ء کو ایک نراجی کے ہاتھوں قتل ہوا۔

۱۸۲ : ۲۷ واشنگٹن، جارج۔ ریاستہائے متحدہ امریکا کے پہلے صدر ۲۲ فروری ۱۷۳۲ء (اس وقت ۱۱ فروری تھا) کو پیدا ہوئے۔ شروع میں چندے فوج میں کام کیا لیکن اس میں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی ــ بالآخر وہ اس ملازمت سے مستعفی ہو گئے اور اپنے زراعتی فارم پر کام کرنے لگے۔
یہ حالات بہت دن تک قائم نہ رہ سکے۔ ۱۷۷۶ء میں انگلستان کی حکومت سے اختلافات، جنگ، ریاستہائے متحدہ کی تشکیل ـــ یہ سب تاریخ کے واقعات ہیں۔ اور ان سب میں واشنگٹن نے جو کردار ادا کیا، وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ بہر حال جب ملک آزاد ہوا، تو امریکی قوم نے ان کی خدمات کا اعتراف اس طرح کیا کہ انھیں اتفاق رائے سے اپنا پہلا صدر منتخب کیا (۱۷۸۹ - ۱۷۹۲ء) پھر جب ان کی میعاد ختم ہوئی، تو وہ اتفاق رائے سے دوبارہ صدر بنا دیے گئے (۱۷۹۲ - ۱۷۹۷ء) قوم انھیں اس عہدے پر تیسری مرتبہ بھی فائز کرنا چاہتی تھی، لیکن انھوں نے سختی سے انکار کر دیا۔ کثرتِ کار سے اب ان کی صحت بہت خراب ہو چکی تھی۔ ۱۴ دسمبر ۱۷۹۹ء کو وفات پائی۔

۱۸۵ : ۲۸ بیوروکریسی Bureaucracy دفترشاہی (لال فیتے کی حکومت)

۱۸۵ : ۲۹ نون وائیلنٹ Non violent بغیر تشدّد کے، غیر جارحانہ

۱۸۶ : ۳۰ کواپریٹر Co-operator تعاون کرنے والا۔ نون کواپریٹر Non Co-operator عدم تعاون کرنے والا

۱۸۷ : ۳۱ اسپرٹ Spirit روح، ولولہ، جوش وخروش

۱۸۷ : ۳۲ Positive سلبی؛ مثبت

۱۹۲ : ۳۳ Institution (s) ادارہ (ادارے)

۱۹۳ : ۱۴ Criminal Law Amendment Act ضابطۂ فوجداری کا

۲۲۲ : ۵ میرابو : پورا نام آنورے گیبری ایل رکوتی میرابو تھا۔ ۹ مارچ ۱۷۴۹ء کو پیدا ہوئے۔ امیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ وہ اتفاق سے ادب اور سیاست کی طرف آ گئے۔ ان کی تعلیم انھیں سپاہی بنانا چاہتی تھی اور شروع میں وہ فوج میں بھرتی بھی ہو گئے تھے؛ لیکن وہاں ان کے بعض اعمال ایسے تھے کہ ان کے اپنے خاندان سے تعلقات بگڑ گئے، اور بالآخر انھیں قید خانے کا منہ دیکھنا پڑا۔ یہیں انھوں نے لکھنا شروع کیا اور اس میں بہت نام پیدا کیا۔ جب ۱۷۸۹ء میں فرانس کا مشہور انقلاب ہوا، تو وہ مفکّر اور مصنّف اور مشیرِ حکومت کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ انھوں نے جو کچھ بھی لکھا، اس میں بہت کم ان کے ذاتی خیالات ہیں، بیشتر دوسروں سے مستعار لیا ہے۔ لیکن اسے پیش کرنے اور اسے لوگوں میں مقبول کرنے کا سہرا ان کے سر ہے۔ بلاشبہہ وہ انقلاب کے بہترین خطیبوں اور مؤیدوں میں تھے۔ ۲ اپریل ۱۷۹۱ء کو انتقال ہوا۔

۲۲۲ : ۶ لافیَت : ۶ ستمبر ۱۷۵۷ء کو فرانس کے ایک امیر گھرانے میں پیدا ہوئے۔ کم عمری ہی میں فوج میں بھرتی ہو گئے۔ بمشکل ۱۹ برس کے تھے کہ امریکا میں جنگِ آزادی چھڑ گئی اور یہ اس میں شامل ہونے کو وہاں چلے گئے۔ واپسی پر پھر فرانسیسی فوج میں شامل ہو گئے۔ انقلابِ فرانس میں انھوں نے بھرپور شرکت کی، بلکہ اس وقت وہ نیشنل اسمبلی کے نائب صدر تھے؛ اور حقوق کا محضر بھی انھیں نے امریکی محضرِ آزادی کے نمونے پر مرتّب کر کے بادشاہ لوئی شانزدہم کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ انقلاب کے بعد جو جھنڈا منظور ہوا، اس کے رنگ اور شکل بھی انھیں کی تجویز کردہ تھی۔
لیکن انقلاب کے بعد جو زیادتیاں ہوئیں، وہ اس سے محدود بادشاہی کی بحالی کے حق میں ہو گئے۔ اس پر رفیقوں نے ان پر غدّاری کا الزام عاید کر دیا! اور انھیں راہِ فرار اختیار کرنا پڑی۔ آخر گرفتار ہوئے اور پانچ سال قید و بند

۲۲۲ : ۳ روسو : یان یاک رُوسو ۱۸ جون ۱۷۱۲ء کو جینوا (سوئیزرلینڈ) میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان معمولی استطاعت کا تھا، اسی لیے ان کی تعلیم بھی پوری نہ ہوسکی۔ مدّتوں وہ موسیقی سے دل بہلاتے رہے اور اس میں انھیں کچھ کامیابی بھی ہوئی۔ اس زمانے میں انھوں نے کچھ تصنیف و تالیف بھی کی۔ وہ محض اتفاق سے اخلاقیات اور علم و فن کے میدان میں داخل ہوئے۔ ایک دن انھوں نے اخبار میں پڑھا کہ اکاڈیمی نے اعلان کیا ہے کہ اس مضمون پر مقالہ لکھا جائے : کیا علم و فن کی ترقی نے ہمارے اخلاق کو تباہ کیا ہے، یا اس کی اصلاح کی ہے ؟ روسو نے بھی مقالہ لکھا اور کہا کہ ان سے ہمارے اخلاق تباہ ہوئے ہیں۔ اس پر انھیں اول انعام ملا۔ اس کے بعد انھوں نے اخلاقیات، معاشیات، سیاسیات پر متواتر اور متعدد مقالے لکھے۔ ان کی تین کتابیں بہت مشہور ہوئیں : معاہدۂ عمرانی اور اعترافات اور ناول یولی۔ انھوں نے ۲ جولائی ۱۷۷۸ء کو رحلت کی۔ وہ اپنے زمانے کے بہترین مفکروں میں شمار ہوتے تھے اور آج وہ عالمی سطح پر صفِ اول کے مفکّر اور مصنّف تسلیم کیے جاتے ہیں۔ انقلابِ فرانس میں ان کی تحریروں کا بہت ہاتھ رہا۔

۲۲۲ : ۴ والٹیر : ان کا اصلی نام فرانسوا ماری اروے تھا؛ والٹیر ان کا قلمی نام تھا۔ ۲۱ نومبر ۱۶۹۴ء کو پیرس میں پیدا ہوئے۔ ان کی شروع سے یہ تمنا تھی کہ ادب میں نام پیدا کریں۔ چنانچہ انھوں نے نظم و نثر میں لکھنا شروع کیا۔ اس میں نہ صرف اپنے والد کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، بلکہ جن لوگوں کی انھوں نے ہجو لکھی، یا جن کا مذاق اڑایا، وہ بارسوخ اور طاقتور تھے اور اس کی سزا والٹیر کو بھگتنا پڑی پوری زندگی لوگوں سے لڑتے بھڑتے گزری۔ اپنی تمام خامیوں کے باوجود، وہ نہ صرف فرانسیسی کے عظیم مصنّف، ڈراما نگار اور ہجو نویس ہیں، بلکہ دنیا کے ادب العالیہ میں ان کا بہت بلند مقام ہے۔ ان کا انقلابِ فرانس (۱۷۸۹ء) کے ہراول دستے میں شمار ہوتا ہے۔ ۳۰ مئی ۱۷۷۸ء کو رحلت کی۔

شام میں تبلیغ کی۔ جن لوگوں نے اس نئی دعوت پر لبیک کہا، وہ دروزی کہلائے۔ لیکن دروزی خود اپنے آپ کو موحّدین کہتے ہیں۔ البتہ یہ واقع ہے کہ ان کے معتقدات اسلام اور عیسائیت کی بعض خصوصیات کو یکجا کر کے مرتّب کر لیے گئے ہیں۔

دروزیوں کی اکثریت شام کے پہاڑی علاقے حوران میں آباد ہے؛ اسی لیے ان پہاڑیوں کا نام ہی جبل الدروز پڑ گیا ہے۔ لبنان میں بھی اس فرقے کی خاصی تعداد ہے۔ کچھ لوگ امریکا میں جا بسے ہیں۔ بہرحال مجموعی طور پر یہ جماعت غالباً ڈیڑھ دو لاکھ سے زیادہ نہیں ہوگی۔

یہاں جس واقعے کی طرف اشارہ ہے، یہ پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴-۱۹۱۸ء) کے بعد کا ہے۔ ورسائی کے صلحنامے کی رُو سے شام اور لبنان فرانسیسی انتداب قرار دیے گئے تھے۔ ۱۹۲۴ء میں دروزیوں نے بغاوت کر دی اس پر فرانسیسی فوج نے سخت حملہ کیا اور دمشق اور جبل دروز کی دروزی آبادی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اگرچہ انھیں فرانسیسی فوجوں نے شکست دے دی کیونکہ مٹھی بھر غیر تربیت یافتہ گروہ کا بھلا ایک جابر متمدن ملک کی منظّم، ہتھیل کانٹے سے لیس فوج سے کیا مقابلہ! لیکن دروزیوں نے میدانِ جنگ میں جس بہادری اور شجاعت کا مظاہرہ کیا تھا، اس سے حکومتِ فرانس کو معلوم ہو گیا کہ اگر دروزیوں کے مطالبات منظور نہ کیے گئے، تو یہ لوگ چین سے نہیں بیٹھنے دینگے۔ چنانچہ دروزیوں کو زیادہ حقوق دیے گئے اور ان سے دوستانہ تعلقات قائم ہوئے۔

۲۲۹ : ۱۰ ریکارڈ Record

۲۳۱ : ۱۱ نائٹ Night رات، شب

نائٹ اسکول = مدرسۂ شبینہ۔ وہ مدرسہ جس میں شب کے وقت پڑھائی ہوتی ہے، تاکہ جو لوگ دن بھر اپنے کام کاج میں لگے رہتے ہیں، وہ رات کے

میں رہے۔ آزاد ہوئے، تو پھر سیاست میں حصہ لینے لگے۔ اب وہ نپولین کے زیادہ اختیارات کے خلاف ہو گئے۔ لیکن حالات کی گرما گرمی میں ان کی کون سنتا تھا؛ اس لیے کم و بیش عزلت گزیں ہو گئے۔

وہ ہمیشہ عوام کے حقوق اور آزادی کے اور حکومت کے نرم رویّے کے حامی اور علمبردار رہے۔ ۲۰ مئی ۱۸۳۴ء کو پیرس میں راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔

۲۲۲ : ۷ وکٹر ہیوگو۔ دیکھیے اسی کتاب میں خطبہ ۷، حاشیہ ۸

۲۲۴ : ۸ محمد بن عبدالکریم۔ مشہور ریف (مراکش) لیڈر، جنھوں نے برسوں فرانس اور اسپین کے خلاف جنگ جاری رکھی۔ اور دونوں حکومتوں کا ناطقہ بند کر دیا۔ ایک جھڑپ کے دوران میں عبدالکریم گرفتار ہو گئے۔ اور حکومت نے انھیں جنوبی فرانس کے ایک شہر میں نظر بند کر دیا۔ بعد کو حکومت فرانس نے فیصلہ کیا کہ ان کا فرانس میں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ چنانچہ انھیں جزیرہ ماریشس منتقل کرنے کے لیے جہاز پر سوار کر دیا گیا۔ جب جہاز نہر سویز میں سے گزر رہا تھا، یہ عرشۂ جہاز پر سے نہر میں کود گئے اور تیر کر مصر کی سرزمین میں داخل ہو گئے۔ حکومتِ مصر نے، فرانس کے سارے دباؤ کے باوجود، انھیں حوالے کرنے سے انکار کر دیا اور انھیں اپنے ہاں پناہ دے دی؛ ان کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ اس کے بعد وہ اطمینان سے قاہرہ میں رہے۔ وہیں انتقال کیا۔ مراکش کو بالآخر جرنیل ڈی گول نے آزاد کیا، حالانکہ ان کے مشیر اس کے سخت خلاف تھے۔

۲۲۴ : ۹ دروزی، چھٹے فاطمی خلیفۂ مصر الحاکم بامر اللہ (۹۹۶-۱۰۲۱ء) ۱۰۲۱ء میں یکایک غائب ہو گئے۔ آج تک پتا نہیں چلا کہ وہ کیا ہوئے۔ بہر حال انھوں نے یہ عجیب دعویٰ کیا تھا کہ مجسّم عقل ہونے کے باعث میں فوق الانسان شخصیت کا مالک ہوں۔ اپنے اس دعوے کو تسلیم کرانے کے لیے انھوں نے مختلف اطراف میں داعی بھیجے۔ انھیں میں ایک شخص اسمٰعیل الدرزی تھے، جنھوں نے

۲۴۱ ، ۲ ڈاکٹر وزیر خان : عظیم آباد پٹنہ کے خاندانِ افاغنہ کے چشم و چراغ تھے۔
۱۸۳۲ء میں طب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کو انگلستان گئے۔ واپسی
پر حکومت نے انھیں آگرے میں اسسٹنٹ سرجن مقرر کر دیا۔
دورانِ قیامِ انگلستان میں انھوں نے طب کے علاوہ یونانی سیکھی اور
عیسائیت کا بھی وسیع مطالعہ کیا۔ چنانچہ ہندستان آئے، تو اپنے ساتھ بہت سا
لٹریچر ردِّ عیسائیت کا بھی لیتے آئے۔ ان دنوں پادری فنڈر صاحب آگرے میں
مقیم تھے، اور ردِّ اسلام میں قلمے اور سخنے بہت سرگرم۔ ڈاکٹر وزیر خان
آگرے پہنچے، تو انھوں نے ان کا جواب دینا شروع کیا۔ پادری صاحب کا
جو مناظرہ ۱۸۵۴ء میں مولوی رحمت اللہ کیرانوی سے ہوا تھا، اس میں ڈاکٹر
وزیر خان نے بھی نمایاں حصہ لیا تھا اور مولوی صاحب کی ہر طرح مدد کی تھی۔
ڈاکٹر صاحب کی یہ سرگرمیاں حکومت کی نظر میں قابلِ عتاب ٹھیریں، چنانچہ
۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں انھیں بھی باغی قرار دے دیا۔ گرفتاری کا وارنٹ
جاری ہو گیا تھا، مگر پیشگی اطلاع مل جانے پر یہ چھپتے چھپاتے دلّی چلے آئے
اور بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان دنوں یہاں جرنیل بخت خان
کرتا دھرتا تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو بہادر شاہ ظفر کی منظوری سے
اودھ کا صوبیدار مقرر کرا دیا۔ اس تحریک کا جو حشر ہوا، وہ سب کے علم میں
ہے۔ شاہی فوجوں کو شکست ہوئی، اور دلّی پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ
ہو گیا۔
اس کے بعد ڈاکٹر وزیر خان نے راہِ فرار اختیار کی اور ایران کے رستے حجاز
چلے گئے۔ زندگی کے آخری ایام مکے میں گزرے۔ بالآخر مدینے میں وفات پائی
اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ (فرنگیوں کا جال: ۲۴۳-۲۴۶)

۲۴۱ : ۳ فنڈر : ان کا پورا نام کارل گوٹلیب فنڈر تھا۔ وہ ۱۸۰۳ء میں جرمنی کے
شہر ویلنگن میں پیدا ہوئے۔ شروع سے انھیں مشنری بننے کا شوق تھا۔

وقت تعلیم حاصل کر سکیں۔

۲۳۳ : ۱۲ سورہ آل عمران، ۳ : ۸ (اے ہمارے رب! اب ہمارے دلوں کو دوسری طرف نہ پھیر، بعد اس کے کہ تو نے ہمیں ہدایت کی راہ دکھلا دی۔ اور ہمیں اپنی جناب سے رحمت عطا کر)

## ۹ - جمعیتہ تبلیغ اہلِ حدیث، کلکتہ

۲۴۱ : ۱ محمد حسن ۱۲۴۹ھ (۱۸۳۳ - ۱۸۳۴ء) میں امروہہ میں پیدا ہوئے۔ علوم عقلیہ و نقلیہ اساتذۂ وقت سے حاصل کیے۔ مولانا فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدرالدین آزردہ ان کے استادوں میں ہیں۔ طب کی تعلیم حکیم امام الدین سے حاصل کی۔

تکمیلِ تعلیم کے بعد اولاً چند سے آگرے میں حکومت کی ملازمت کی۔ پھر میو کالج، اجمیر میں عربی اور فارسی پڑھانے پر مقرر ہو گئے۔ لیکن یہاں پرنسپل سے نبھ نہ سکی اور مستعفی ہو کر بطور طبیب مہارانا اودے پور کے پاس چلے آئے۔ وہاں سے نکلے تو اجمیر میں سکونت اختیار کر لی اور مطب کرنے لگے۔ یہاں وہ ۲۹ برس مقیم رہے تھے۔

ان کا عیسائیت کا مطالعہ بہت گہرا تھا، خاص طور پر کتب سماویہ سے حضرت رسولِ اسلام صلعم سے متعلق ان کتابوں میں سے پیشگوئیاں دریافت کرنے کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ اس پہلو سے تورات اور انجیل کا مطالعہ کر کے متعلقہ آیات جمع کی تھیں۔ قرآن کی تفسیر بھی قلمبند کی تھی، جو زبان کے اشکال کے باعث مقبول نہ ہو سکی۔

وہ مباحثہ یا مناظرہ نہیں کرتے تھے۔ اگر کوئی سوال لے کر آجاتا تو اسے سمجھا دیتے۔ ۷۴ سال کی عمر میں ۱۹ رمضان ۱۳۲۳ھ (۱۷ نومبر ۱۹۰۵ء) کو رحلت کی (فرنگیوں کا جال : ۲۸۵)

بہت متاثر رہے۔ بہر حال تکمیل کے بعد انھوں نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا اور اپنا اخبار جاری کر دیا۔ لیکن حکومت ان کے ترقی پسند رجحانات برداشت نہ کر سکی اور پرچہ ضبط ہو گیا۔ اس پر وہ ہجرت کرکے پیرس چلے گئے، اور یہاں کے اشتراکی مصنفوں کے حلقے میں بار پا گئے۔ اسی زمانے میں ان کی اینگلز سے ملاقات ہوئی، جس نے عمر بھر کی دوستی کی شکل اختیار کر لی۔

ان کا تاریخ اور اشتراکیت کا خاص نظریہ تھا اور انھوں نے اپنی متعدد تحریروں میں اس کی وضاحت کی ہے۔ اشتراکیت کی اساسی کتاب "سرمایہ" Das Kapital انھیں کی تصنیف ہے۔ ان کا پہلا حصہ ۱۸۶۷ء میں شائع ہوا، اور باقی دو حصے ان کی وفات کے بعد ۱۸۸۵ء اور ۱۸۹۴ء میں۔ اس کا دنیا کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان کا ۱۴ مارچ ۱۸۸۳ء کو انگلستان میں انتقال ہوا؛ ہائی گیٹ کے قبرستان میں مدفون ہیں۔

## ۱۲ - عربی نصاب کمیٹی، لکھنؤ

۲۱۷ ۱ شیخ (محمد) عبدہ۔ مشہور مصری مذہبی اور سیاسی رہنما۔ حالات کے لیے دیکھیے: غبارِ خاطر: ۳۱۵

۲۱۷ ۲ جمال الدین (افغانی)، پان اسلام کے زبردست حامی۔ حالات کے لیے دیکھیے غبارِ خاطر: ۳۱۵

۲۱۷ ۳ محمد رشید رضا، شیخ محمد عبدہ کے شاگردِ رشید۔ استاد کی جلاوطنی کے بعد ان کے کام کو مصر میں جاری رکھا، اور اس کے لیے مشہور عربی ماہنامہ "المنار" قاہرہ سے جاری کیا۔ انھوں نے اس میں قرآن کی تفسیر بھی بالاقساط چھاپنا شروع کی تھی، جو اب الگ کتابی شکل میں "تفسیر المنار" کے نام سے ملتی ہے۔ ۱۹۱۲ء میں ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لیے ہندستان بھی

چنانچہ انھوں نے کئی مشرقی زبانوں میں مہارت پیدا کرلی مثلاً ترکی، تاتاری، ارمنی، فارسی وغیرہ۔ ۱۸۲۹ء میں انھوں نے اسلام کے خلاف اپنی کتاب "میزان الحق" جرمن میں لکھی۔ اس کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ وہ عرصے تک شرقِ اوسط اور ایران میں عیسائیت کی تبلیغ کرنے کے بعد پہلی مرتبہ ۱۸۳۷ء میں ہندستان آئے۔ دو تین برس کلکتے میں گزار کر انھوں نے آگرہ کو اپنا مرکز بنایا انھیں ایام میں انھوں نے اُردو سیکھی اور اپنی کتاب 'میزان الحق' پر نظرِ ثانی کرکے اسے مکمّل کیا اور اسے اردو میں بھی منتقل کرایا۔ یہاں آگرے اور اس کے گرد و نواح میں بہت سرگرم رہے۔ عیسائیت کی تائید میں کتابیں تقسیم کرتے اور وعظ بھی کرتے۔

'میزان الحق' کا پہلا جواب 'استفسار' کے عنوان سے مولوی آلِ حسن نے لکھا تھا۔ فنڈر کی ایک اور کتاب مفتاح الاسرار تھی؛ اس کا جواب ایک لکھنوی عالم نے 'کشف الاستار' کے نام سے دیا تھا؛ اور فنڈر نے جواب الجواب میں 'حل الاشکال' تصنیف کی۔ اس آخری کتاب کا جواب مولوی مؤیدالدین احمد آبادی نے دیا تھا۔

فنڈر صاحب کا مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی سے مشہور مناظرہ ۱۸۵۴ء میں آگرے میں ہوا تھا، جو کتابی شکل میں شائع ہوچکا ہے۔

۱۸۵۸ء میں فنڈر قسطنطنیہ گئے۔ لیکن ترکی حکومت نے ان کی خلافِ اسلام سرگرمیوں کی بنا پر ان کے اخراج کا حکم صادر کردیا۔ اس پر وہ بیوی بچوں کے ساتھ انگلستان چلے گئے، جہاں ان کا یکم دسمبر ۱۸۶۵ء کو انتقال ہوا۔ (ایضاً: ۹۵-۹۷)

۲۴۵ : ۴ روسو: دیکھیے خطبہ ۸ حاشیہ ۲

۲۴۵ : ۵ کارل مارکس: پورا نام کارل ہنرخ مارکس تھا۔ ۵ مئی ۱۸۱۸ء جرمنی کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کی عمر چھ برس کی ہوگی، جب ان کے والد نے عیسائی مذہب اختیار کرلیا۔ تعلیم کے دوران میں وہ مشہور فلسفی ہیگل سے

## ۱۳ ۔ بین ایشیائی کانفرنس، نئی دلّی

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| ۳۳۵ | ۱ | آرگنائزیشن | Organisation | ادارہ، تنظیم |
| ۳۳۵ | ۲ | اسٹینڈنگ کمیٹی | Standing Committee | مستقل کمیٹی |
| ۳۳۵ | ۳ | انسٹی ٹیوٹ | Institute | ادارہ |

## ۱۴ ۔ مسلمانانِ دلّی کا اجتماع، دلّی

۳۳۷ ۱ اس سے مسلم لیگ کے دو قومی نظریے اور قبلِ آزادیِ ملک کے پراپگنڈے کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

۳۴۱ ۲ آیت ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ (احقاف ۴۶: ۱۳)

۳۴۲ ۳ آلِ عمران، ۳: ۱۳۹ (نہ سست ہو اور نہ ملول ہو؛ اور یاد رکھو) تم ہی غالب رہوگے، اگر تم ماننے والے ہو)

۳۴۶ ۴ لِتَعَارَفُوْا یعنی تاکہ تم آپس میں پہچانے جاؤ۔ اس سے اشارہ مقصود ہے، آیتِ قرآنی کی طرف: وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا (الحجرات، ۴۹: ۱۳) اور ہم نے تمھارے گروہ اور قبیلے اس لیے بنائے تھے، تاکہ تمھاری آپس میں پہچان ہو۔

آئے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں بعمر ۷۱ سال قاہرہ میں رحلت کی۔

۳۲۹ ۴ ابوالفضل: حالات کے لیے دیکھیے؛ غبار خاطر (حواشی): ۲۹۷ (ساہتیہ اکاڈیمی ایڈیشن) اور تذکرہ (حواشی): ۳۶۲-۳۶۳ (ساہتیہ اکاڈیمی ایڈیشن)

۳۲۹ ۵ فیضی: حالات کے لیے دیکھیے: غبار خاطر (حواشی): ۳۳۹ (ساہتیہ اکاڈیمی ایڈیشن) اور تذکرہ (حواشی): ۳۶۳-۳۶۴ (ساہتیہ اکاڈیمی ایڈیشن)

۳۲۹ ۶ نظام الملک طوسی۔ عہدِ سلجوقی کے شہرہ آفاق وزیر۔ ان کی کتاب "سیاست نامہ" اپنے فن کی بلند پایہ کلاسیکی تصنیف ہے۔ بغداد کا مشہور مدرسۂ نظامیہ انھیں نے قائم کیا تھا۔ عمر خیام کی مدد سے انھوں نے رصدگاہ بنائی اور ایرانی تقویم کی اصلاح کی۔ ۱۰۹۲ء میں حسن بن صباح کے ایک پیرو (اسمٰعیلی) کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ اصفہان میں مدفون ہے۔

۳۲۹ ۷ اکبر: محمد جلال الدین اکبر شاہ، خاندانِ مغلیہ کا گلِ سرسبد۔ ولادت: امرکوٹ ۵ رجب ۹۴۹ھ/۱۵ (۲۵) اکتوبر ۱۵۴۲ء؛ وفات: آگرہ ۱۳ جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ/ ۱۶ (۲۶) اکتوبر ۱۶۰۵ء) سکندرہ میں مدفون ہیں۔

۳۲۹ ۸ شیر شاہ۔ حالات کے لیے دیکھیے: تذکرہ (حواشی): ۳۶۰-۳۶۱

۳۲۹ ۹ ٹوڈرمل۔ اصلاً کھتری خاندان کے فرد تھے۔ شیر شاہ سوری کے عہد میں محکمۂ مال میں ملازم ہوئے۔ لیکن ان کا اصلی عروج اکبر کے زمانے میں ہوا، جب یہ اس کے نورتنوں میں شامل ہوئے اور ملک کی آبادی کا کام اور کارپردازوں کے عزل و نصب کا اختیار انھیں حاصل ہوا۔ اسی عہد میں کچھ مدّت کے لیے بنگال کے گورنر بھی رہے۔ ۱۱ محرم ۹۹۸ھ (۱۲ دسمبر ۱۵۸۹ء) کو لاہور میں انتقال ہوا۔ (مفتاح التواریخ: ۱۹۴)

۳۲۹ ۱۰ فتح اللہ شیرازی، حالات کے لیے دیکھیے: تذکرہ (حواشی): ۴۶۸-۴۶۹

# فہارس

از

مرتّب

# ۱ آیاتِ قرآن

# آیاتِ قرآنی

# آیاتِ قرآنی

## آیاتِ قرآنی

# آیاتِ قرآنی

# آیات قرآنی

## آیاتِ قرآنی

مُهَانًا (۲۵: ۶۹) ۷۹

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوهٌ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللّٰهِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ۔ (۳: ۱۰۶-۱۰۷) ۳۳

# آیاتِ قرآنی

# ۲ - احادیثِ نبوی

# اعلام

# ۳۔ اعلام

(تنبیہ : ہندسے کے نیچے لکیر سے یہ مراد ہے کہ اس صفحے پر یہ لفظ ایک سے زیادہ مرتبہ آیا ہے۔)

## اعلام

# اعلام

# ۴ - بلاد و اماکن

اعلام

## بلاد و اماکن

## بلاد واماکن

## بلاد واماکن

## بلاد و اماکن

## کتب و رسائل

# ۵۔ کتب و رسائل

## ماخذِ حواشی


دیوان نظیری : مرتبہ مظاہر مصفّا (تہران ۱۳۴۰ شمسی)

کلیات سعدی : مرتبہ مظاہر مصفّا (تہران ۱۳۴۰ شمسی)

(ج) عربی

الاکمال فی اسماء الرجال : ابن باکولہ (حیدرآباد ۱۳۸۱ھ)

البیان والتبیین : جاحظ (مرتبہ عبدالسلام محمد ہارون) (قاہرہ ۱۹۴۸ء بعد)

تذکرۃ الحفاظ : شمس الدین الذہبی (حیدرآباد ۱۲۷۵ھ)

جامع ترمذی : مرتبہ احمد محمد شاکر (قاہرہ ۱۹۳۷ء)

حلیۃ الاولیا و طبقات الاصفیا : ابو نعیم الاصبہانی (قاہرہ ۱۳۵۱ھ)

دیوان ابی تمام : طبع محی الدین الخیاط (بیروت ۱۸۸۹ء)

دیوان خنساء : طبعۃ لوئیس شیخو (بیروت ۱۸۹۶ء)

زہر الآداب : حصری (تحقیق محمد البجاوی) (قاہرہ ۱۹۵۳ء)

سنن ابن ماجہ (قاہرہ ۱۹۵۳ء)

سنن ابی داؤد : تصحیح حافظ محمد ابراہیم (نولکشور ۱۲۹۳ھ)

سنن نسائی (دلّی ۱۲۵۶ھ)

سیرۃ النبویہ : ابن ہشام (قاہرہ ۱۳۵۵ھ بعد)

شروح سقط الزند : ابو العلاء المعرّی (قاہرہ ۱۹۴۶ء بعد)

صحیح بخاری (مطابع الشعب، قاہرہ ۱۳۷۸ھ)

صحیح مسلم (قاہرہ ۱۳۷۹ھ)

طبقات الکبیر : ابن سعد (بیروت ۱۹۵۷ء)

العقد الفرید : ابن عبد ربہّ (مرتبہ سعید العریان) (قاہرہ ۱۹۴۸ء)

القرآن

کتاب الامالی : الشریف المرتضیٰ الموسوی (تحقیق محمد ابی الفضل ابراہیم) (قاہرہ ۱۹۵۴ء)

# ۶۔ مآخذِ حواشی


**(الف) اردو**

انجیل مقدس (بشمول عہد نامۂ جدید) (انگلستان ۱۹۵۸ء)

تذکرہ : ابو الکلام آزاد (مرتبہ مالک رام) (ساہتیہ اکاڈمی، دلّی ۱۹۶۸ء)

تذکرہ مشائخ دیوبند : مفتی عزیز الرحمٰن (بجنور ۱۹۶۷ء)

حیاتِ جاوید : حالی (علی گڑھ ۱۹۲۲ء)

حیاتِ مالک : سید سلیمان ندوی (اعظم گڑھ ۱۹۴۰ء)

ذکرِ آزاد : عبدالرزاق ملیح آبادی (کلکتہ ۱۹۶۰ء)

سفرنامہ اسیر مالٹا : حسین احمد مدنی (دیوبند طبع اوّل)

عہد نبوی میں نظامِ حکمرانی : محمد حمید اللہ (حیدرآباد بار دوم)

فرنگیوں کا جال : امداد صابری (دلّی ۱۹۴۹ء)

مفتیٔ اعظم کی یاد : حفیظ الرحمٰن واصف (دلّی ۱۳۸۶ھ)

یادِ رفتگاں : سید سلیمان ندوی (کراچی ۱۹۵۵ء)

**(ب) فارسی**

دیوانِ کامل خواجہ حافظ شیرازی : حافظ (تہران ۱۳۳۹ شمسی)

# ماخذ حواشی


محاضرۃ الابرار و مسامرۃ الاخیار (قاہرہ ۱۹۰۶ء)

المستدرک : حاکم نیشاپوری (دائرۃ المعارف، حیدرآباد) (حیدرآباد ۱۳۴۱ھ)

المسند : احمد بن حنبل (قاہرہ ۱۹۴۷ء بعد)

المسند : دارمی (کان پور ۱۲۹۳ھ)

المستطرف : البشیھی (قاہرہ ۱۳۵۴ھ)

موطّا : امام مالک مرتبہ عبدالوحید خان (کراچی ۱۹۵۴ء)

نفح الطیب : المقری (قاہرہ ۱۳۰۲ھ)

وفیات الاعیان : ابن خلکان مرتبہ محی الدین عبدالحمید (قاہرہ ۱۹۴۸ء بعد)


## (د) انگریزی

بیشتر مغربی اور مشرقی مشاہیر کے تراجم مندرجۂ ذیل کتابوں سے اخذ کیے گئے ہیں، اگرچہ اختصار کی خاطر ہر جگہ حوالہ نہیں دیا گیا:


انسائیکلوپیڈیا اسلام (دونوں ایڈیشن)

انسائیکلوپیڈیا امریکانا (سینتیسواں ایڈیشن ۱۹۶۸ء)

انسائیکلوپیڈیا برٹینکا (تیسواں ایڈیشن ۱۹۶۲ء)

چیمبرز انسائیکلوپیڈیا (۱۹۵۹ء)

کلاسیکل ڈکشنری : ج، لال پری ایر : مرتبہ ف، ا، رائٹ (لندن ۱۹۴۹ء)

ہسٹری آف کانگریس : پٹابی سیتا رامیا (نئی دہلی ۱۹۶۹ء)